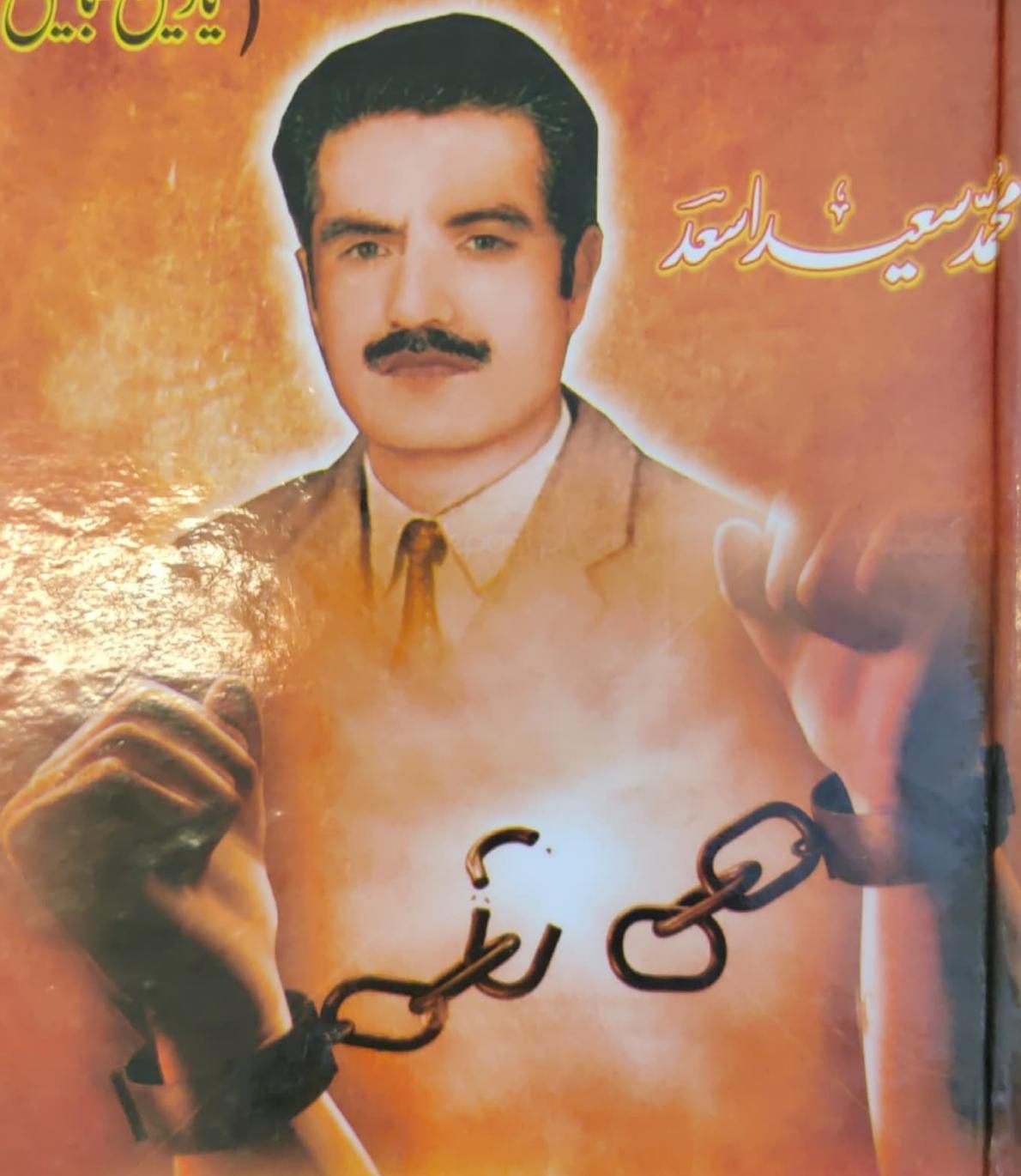


میراثِ نور میرا رامبر

مفہومِ ولادت شہید

(یادیں اور باتیں)

محمد سعید دلسا عَد



فہرست

6	محمد سعید اسعد	حرف آغاز	
10	اظہر احمد	پیش لفظ	
12	میر احمد	کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں.....	
42	ماسٹر محمد مقبول	یادوں کے روشن چراغ	
85	عبدالحالمق انصاری	11 فروری کا قومی دن..... تاریخی تناظر میں	
92	مقبول بٹ کی شہادت اور کشمیری قوم کا رد عمل	کے۔ انج۔ خورشید	
97	میر عبدالقیوم	کاروان آزادی کا سپہ سالار	
101	مقبول بٹ شہید..... کچھ یادیں..... کچھ باتیں	امان اللہ خان	
110	جی۔ ایم۔ میر	مقبول بٹ شہید..... انکار و نظریات	
121	سید سعید شاہ نازکی	مقبول بٹ ضمیر فروش نہیں تھے	
124	میرا قائد، میرا راہبر	حسین "ابن علی" کے پیروکار، مقبول بٹ شہید	
135	ہاشم قریشی	ہاشم قریشی	
146	ڈاکٹر فاروق حیدر	یادوں کی مہکتی کلیاں	
153	اکرام اللہ جموال	شہید محمد مقبول بٹ سے ملاقات..... چند یادداشتیں	
168	عبد الغفور قریشی	میرا عظیم قائد..... محمد مقبول بٹ شہید	
173	نیسم لوں	دولجھ..... جو سوال بن گیا	
176	اعظم انقلابی	شہید محمد مقبول بٹ کے رفقائے سفر	

بہار لہ نیما رامبر

(5)

182	ڈاکٹر غلام قادر وانی	محمد مقبول احمد بٹ کی شہادت اور ہم	◎
197	مقبول بٹ شہید..... یادیں اور باتیں	مقبول بٹ شہید..... یادیں اور باتیں	◎
220	راجہ مظفر خان	اور وہ وقت چھوٹ کیا	◎
223	محمد یوسف زرگر	آزادی کا سچا عاشق	◎
229	ڈاکٹر سیف الدین	یادوں کی صمک	◎
243	غلام دین الہ	توبتا کے سفر پر گیا مطمئن	◎
249	نسیم اختر	میرا بھائی..... مقبول بٹ	◎
255	ملک محمد انور کشمیری	تہاز جبل میں شہید کشیر سے یادگار ملاقات	◎
261	ایس۔ ایم۔ افضل	اس نے سردے دیا سرخ گھکا یا نہیں	◎
266	پروین میر	ظلمت شب میں روشن چدائغ	◎
269	ملک غلام سرور	مکتب	◎
272	سید عبدالرشید بخاری	مقبول بٹ سے ایک یادگار ملاقات	◎
275	خواجہ نذیر احمد	میر کاروان تھاواہ.....	◎
279	سردار خادم حسین خان	شہید ڈن مقبول بٹ سے میری پہلی ملاقات	◎
286	شوکت مقبول بٹ	میرے ابو جان	◎
292	کریم اللہ قریشی	مقبول بٹ شہید..... ایک عظیم انسان	◎
296	محمد اسلام خان	مقبول بٹ شہید ا کچھ یادیں کچھ باتیں	◎
298	عبد الجید بٹ	یادوں کے نقوش	◎
301	ارشاد محمود	مقبول بٹ شہید کی بررسی	◎
304	توصیف احمد	مقبول اوزنہ ہے (نظم)	◎

حروف آغاز

رقم نے 1993-94 میں شہید کشمیر محمد مقبول بٹ کے عزیز واقارب اور تحریکی و تنظیمی ساتھیوں سے ملاقاتیں کر کے ان کی یادداشتیں قلم بند کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان دونوں رقم مظفر آباد میں بسلسلہ تلاشِ معاش قیام پذیر تھا۔ ایک عارضی سی جزوئی ملازمت ملی تو گاہے بگاہے وقت نکال کر ایبٹ آباد، لاہور، راولپنڈی، میرپور، نیلم ولی، لیپاولی، چکار، مری، راولکوٹ اور دیگر کئی مقامات کے سفر کیے اور شہید کشمیر کے ساتھیوں سے ملاقاتیں کر کے ان کے انٹرویوز قلم بند کیے۔ یہ تاریخی مواد ایک ضخیم فائل کی صورت میں مرے پاس جمع ہو گیا، کئی بار ارادہ کیا کہ اس مواد کی نوک پلک سنوار کر اسے منظر عام پر لایا جائے لیکن غمِ روزگار اور فکرِ معاش کے ساتھ ساتھ کئی دیگر تحقیقی و اشاعتی منصوبوں کے سبب یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کے ان 24 برسوں میں رقم نے الحمد لله کوئی لمحہ یا گھڑی ضائع نہ ہونے دی۔ تحقیقی، اشاعتی سرگرمیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ ادارہ فکس کے زیر اہتمام ایک سو سے زائد کتب شائع کی گئیں۔ جن میں رقم کی مرتب کردہ کتب حسب ذیل ہیں۔

۱..... شعور فردا۔ (مقبول بٹ شہید کے خطوط)۔

۲..... خراج عقیدت۔ (مقبول بٹ شہید کو شعراء کا خراج عقیدت)۔

۳..... دیوانوں پر کیا گزری (مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں پر پاکستان کے عقوبات خانوں میں ڈھانے گئے مظالم کی کہانیاں)۔

۴..... جلال و جمال

مقبول بٹ شہید کے اپنے قلم سے لکھی گئی حسب ذیل دو مختصر کتب شائع کیں۔

۱..... میں کون ہوں۔ (عدالتی بیان گنگا کیس)۔

۲..... سری نگر جیل سے فرار کی کہانی۔ (مقبول بٹ کی خود نوشت کہانی)۔

جناب شمس الرحمن کا لکھا ہوا کتاب بچہ :

مقبول بٹ حیات و جدوجہد۔

گذشتہ سال آزاد کشمیر کے کٹھ پتلی صدر یعقوب خان نے درج بالا تمام کتب پر پابندی عائد کر دی اور یہ موقوف اختیار کیا کہ چونکہ یہ کتب کشمیری عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبات کو فروع دے رہی ہیں اور ان کے دلوں میں آزادی و خود مختاری کی تڑپ پیدا کر رہی ہیں اس لیے یہ قابل گرفت ہیں۔

یعقوب خان کی بیٹی فرزانہ (وزیر سماجی بہبود و ترقی نسوان وقت) نے راقم کے خلاف انکواری کیش قائم کر کے یک طرف طور پر کارروائی عمل میں لاتے ہوئے راقم کو 18 سالہ ملازمت سے برطرف کر دیا۔ راقم کو ڈرانے دھمکانے اور خوف زدہ کرنے کے تمام حریبے آزمائے گئے جب کوئی تدبیر کا گرنہ ہوئی تو راقم کو پرکشش عہدوں اور مراعات کا لائچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ موصوفہ نے واضح طور پر اپنے دیگر سٹاف آفیسر ان کی موجودگی میں راقم کو کہا ”کشمیر کے لئے آپ لکھنا چھوڑ دیں ورنہ آپ کو سخت سزا دی جائے گی۔“

راقم نے بر ملا طور پر اس ”جرم“ کی پاداش میں ہر طرح کی سزا بھگتئی اور آئندہ اپنے مشن پر

کاربند رہنے کا عندیہ ظاہر کیا تو راقم کو بیک جنبش قلم ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔

کٹھ پتلی حکومت کے اس اقدام کے خلاف محض وطن کشمیریوں نے دنیا بھر میں بھرپور صدائے احتجاج بلند کی۔ یہ مقدمہ آزاد جموں کشمیر پر یہ کورٹ تک پہنچا تو راقم کو ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔

ملازمت سے بر طرفی کے دورانیے میں راقم نے اپنے پاس جمع شدہ تاریخی روکارڈ دستاویزات اور مودات کی ترتیب و تدوین عمل میں لائی۔

اس حصے میں برطانیہ میں آباد جن کشمیری محب وطن افراد نے راقم کے حق میں بھر پور آواز بلند کی ان میں ڈڈیال سے تعلق رکھنے والے مسٹرا ظہر احمد بھی پیش پیش ہیں۔ ان کا تعلق کشمیر فریڈم مسوونٹ سے ہے اور یہ مقبول بٹ شہید کے پیروکاروں اور عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ایک ماہ قبل اظہر صاحب سے فون پر ہونے والی بات چیت کے دوران جب میں نے انھیں بتایا کہ مقبول بٹ شہید کے حوالے سے کئی برس پہلے انتہائی محنت سے تیار کردہ میرا یہ مسودہ ابھی کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آسکا تو انھوں نے مجھے فی الفور اس مسودے کو اشاعت کے مرحل سے گزارنے کا مشورہ دیا اور اس کے اخراجات مہیا کرنے کی حامی بھری۔ چنانچہ انھوں نے فنڈر ریز نگ مہم شروع کی اور میں نے مسودے کی نوک پلک سنوار کر اس کی کپوزنگ شروع کروادی۔ الحمد للہ ایک ماہ کی محنت کے بعد یہ کتاب پایہ تکمیل کو پچھی اور اظہر صاحب بھی اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ جن دوست احباب نے اظہر صاحب کی وساطت سے اس کتاب کے لیے فنڈ زمہیا کیے ہیں میں بھی دل کی اتحاد گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں۔ خصوصی طور پر میں اظہر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک قومی فریضہ ادا کرتے ہوئے اس اہم دستاویز کو آپ تک پہنچانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

”میرا قائد میرا راہبر“ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ابھی کئی دیگر احباب جن کے طویل انٹرویو یو یکمل ہیں یا ابھی تکمیل کے مرحل میں ہیں انھیں آئندہ دوسری کتاب کی زینت بنایا جائے گا۔ جن میں درج ذیل احباب کے انٹرویو شامل ہوں گے۔ پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی، عبدالحمید بٹ، ریاض داڑ، غفار رشی، مقبول نائیک، چودھری محمد یاسین، نذیر احمد والی، بشیر احمد لوں، پروفیسر شفیق الرحمن، پروفیسر نذیر انجمن، ڈاکٹر نذیر گیلانی۔

علاوہ ازیں قارئین میں سے اگر کوئی احباب مقبول بٹ شہید سے وابستہ اپنی یادیں اور با تیں ریکارڈ کروانا چاہیں یا خود قلم بند کر کے بھیج سکیں تو ضرور ارسال فرمائیں ہم اسے مذکورہ کتاب میں شامل کریں گے۔

”میرا قائد، میرا راہبر“ میں کچھ ایسی نادر اور نایاب تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں جو مقبول بٹ شہید کے حوالے سے اہم معلوماتی مضمایں ہیں ایسی تحریریں کے حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں۔

میراتِ میرا رامبر

(9)

مجھے امید ہے کہ کشیر کی نئی نسل میری اس کاوش کو پذیرائی بخشنے گی اور یہ کتاب مقبول بٹ شہید کی شخصیت، حالاتِ زندگی، جدوجہد کردار اور افکار و نظریات کو سمجھنے میں بنیادی مآخذ کا درجہ اختیار کرے گی۔

(دما توفیقی الاباللہ)

محمد سعید اسعد

2 جنوری 2017ء

کھوڈ ضلع حوالی ریاست جموں کشیر

0355-8115598



پیش لفظ

جناب محمد سعید اسعد کا شماران تاریخ دانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ کشمیر اور مسئلہ کشمیر کی اصل نوعیت کشمیری عوام تک پہنچانے کے لیے بہت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی گواہی انکی دو درجہ سے زائد تصانیف دے رہی ہیں۔ بالخصوص ادارہ نکس کا قیام عمل میں لا کر آپ نے کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے نہایت ہی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے کچھ تو ناپید ہو چکی تھیں۔

اس کتاب کے متعلق میں نے تقریباً ایک سال پہلے پڑھا تھا کہ سعید اسعد صاحب اس پر کام کر رہے ہیں اور میں بہت انتظار میں تھا کہ کب یہ کتاب شائع ہوگی۔ اور جب مجھے پتا چلا کہ سعید اسعد صاحب مالی حالات کی وجہ سے یہ شائع نہیں کر پا رہے تو ان کی اجازات کے بعد میں نے کچھ دوست احباب کے ساتھ اس کے متعلق بات کی اور پھر آن لائن ایک فنڈ ریز نگ مہم شروع کر دی۔ اس میں جن دوست و احباب نے تعاون کیا ان کے نام ذیل ہیں، نس رحمان، محمد رشید، نسرین احمد، حاجی محمد یسین، محمد ظفر، زاہد حسین کلیال، محمد اکرم، محمد عثمان، غلام حسین اور زیتون بی بی۔

میں ان تمام دوست احباب کا بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مدد کی اور SOAS Kashmir Solidarity Movement میں مجھے 'Free Kashmir' Wristbands فروخت کرنے کا موقع دیا اور جو بھی رقم انکی فروخت سے حاصل ہوئی وہ اس کتاب کی اشتراحت کے لیے خرچ ہوئی ہے۔ ان سب کے تعاون سے ہی آج یہ کتاب آپکے ہاتھ میں ہے۔

شاہید بہت سارے دوستوں کے ذہن میں یہ سوال ہو کہ اس کتاب کی فروخت سے جو رقم ملے گئے اس کا مصرف کیا ہو گا؟ تو ان کے لیے عرض ہے کہ جو بھی رقم اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہو گی اس سے ہم مزید اس طرح کی اور دیگر کشمیر کی تاریخی کتابوں کو شائع کریں گے اور ہماری کوشش

ہوگی کہ ادارہ نکس کی کچھ مطبوعات کا انگلش میں ترجمہ بھی کیا جائے۔ قارئین میں سے اگر کوئی اس کتاب کا انگلش میں ترجمہ کر سکتا ہے تو براہ مہربانی وہ مجھ سے یا سعید اسعد صاحب سے رابطہ کرے۔

بابائے قوم مقبول بٹ شہید جو اپنی ساری زندگی کشمیر کو ایک آزاد و خود مختار ملک بنانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور مادرِ وطن اور قوم کے مستقبل کے لیے اپنی جان کا نذر انہ بھی پیش کر دیا۔ لیکن افسوس کہ آج بابائے قوم کے متعلق بہت ہی کم معلومات موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعید اسعد صاحب نے ایک ایسی کتاب مرتب کر دی ہے جو کہ وقت کی اشد ضرورت تھی۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب ایک تاریخی کتاب ثابت ہوگی اور اس کو پڑھنے کے بعد ہماری نوجوان نسل کو بابائے قوم مقبول بٹ شہید کے حوالے سے بہت زیادہ نئی معلومات حاصل ہوں گی۔ قبل ازیں محمد سعید اسعد نے مقبول بٹ شہید کے انکار و نظریات نئی نسل تک پہنچانے کے لیے چند گروں قدر کتب شائع کی ہیں۔

آج کشمیر کے دونوں اطراف کے سکولوں و کالجوں میں پاکستان یا انڈیا کے شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، ہیروز اور لیڈروں کے متعلق نصاب میں معلومات تو موجود ہیں لیکن کشمیر کی قومی شخصیات کا تذکرہ موجود نہیں۔ کشمیری بچوں کو پڑھوی قابضِ ممالک کی منگھڑت تاریخ پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ قابضین کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ کشمیری قوم کو انکی تاریخ اور انکے لیڈروں کے متعلق کچھ نہ پڑھنے دیا جائے تاکہ کشمیری قوم علمی و شعوری لحاظ سے بالکل ہی کمزور ہو جائے اور یہ دونوں اپنا قبضہ جائے رکھیں۔ اب ہم نے بھی قسم اٹھائی ہے کہ ہم ان کے ان ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا کر رکھ دیں گے۔

اطہر احمد

پریس سیکرٹری کشمیر فریڈم موونٹ

یوکے زون



کب یاد میں تیر اساتھ ہے میں.....

میر احمد (میر پور)

(میر احمد وہ عظیم حریت پسند ہیں جنہیں مقبول بٹ کے ساتھ ایک ہی جرم میں چھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ یہ دونوں حریت پسند اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آگ اور خون کی آغوش میں رہ کر مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کی صفائی مرتب کرتے رہے انہیں بھارتی خفیہ پولیس کے انپکٹر ”امر چنڈ“، کو قتل کرنے کے لازام میں سری نگر جیل کے ایک بند کمرے میں طویل اور یک طرفہ ساعت کی اذیت بھی برداشت کرنا پڑی۔ میر احمد دسمبر 1968ء میں مقبول بٹ اور چودھری یاسین کے ہمراہ سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر آگئے۔ روز نامہ نوابے وقت کے نمائندہ خصوصی بیدار سرمدی نے میر احمد کی یادیں قلم بند کی تھیں۔ ملاحظہ فرمائیں)

سری نگر سٹریل جیل قلعہ ہری پربت کے مشرق کی طرف بنائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ جھیل ڈل لگتی ہے۔ جیل میں تنگ و تاریک کوٹھریاں ہیں جن میں 2000 ”خطرناک“ قیدی آسانی سے رکھ جاسکتے ہیں۔ قیدیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر جیل میں مزید ”سیل“، بھی بنائے گئے تھے۔ مسلمان قیدیوں کی نگرانی کے لیے جو زیادہ تر سیاسی نوعیت کے مقدمات میں گرفتار کیے جاتے تھے۔ گورکھا اور سکھ دستے معین کیے جاتے تھے۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ مسلمان نگران کسی لمحہ ایک دین سے وابستہ ہونے کے باعث مسلمان قیدیوں سے مل سکتے تھے۔

سری نگر میں مہتاب باغ انیٹر و گیشن سٹریٹ بنا یا گیا تھا۔ یہ پر اسرا ر عمارت ماضی میں بریگیڈیر رحمت اللہ خان کی کوٹھی تھی۔ وہ پاکستان آگیا تو کشمیری حکام نے اس کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا اور اس کی شکل و صورت تبدیل کر کے اسے ایسے تحقیقاتی مرکز میں بدل دیا جہاں انتہائی خطرناک سیاسی قیدیوں کو بہکانے یا ان سے راز اگلوانے کے لیے ان پر ہر طرح کا تشدد روا رکھا جاسکتا تھا۔ اس سٹریٹ کے ارد گرد کی

مسلمان آبادی کو ختم کر دیا گیا تھا اور یہ سب کچھ شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ اس سنتر کی چار دیواری کے اندر بلند ہونے والی چنیں دیواروں سے نکلا کر رہ جائیں۔ مہتاب باغ کے اس انیٹر و گیشن سنتر میں ہی مقبول بٹ، میراحمد اور ان جیسے کشمیری حریت پسندوں کو ابتدائی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میراحمد بتا رہے تھے :

”اس روز ہوا ہمارے کان میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سورج کی آزاد کرنیں زمین پر ہمارے لیے پیغام لکھ رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ پھیلتی دھوپ میں مقبول بٹ اور میں ایک جگہ بیٹھے سورج رہے تھے کہ بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں کشمیری حریت پسندوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے جو منصوبے بنائے ہیں انھیں کیسے ناکام بنایا جائے۔ ہمارے ساتھی کچھ دنوں سے ہمیں ایک سی۔ آئی۔ ڈی ایسپیکٹر امر چند کے بارے میں خبردار کر رہے تھے۔ اس شخص کے بارے میں یہ بھی پتہ چلا تھا کہ وہ کمزور دل مگر مکروہ ذہن کا حامل ہے۔ اس نے چالاکی سے مقبوضہ کشمیر اور مرکزی حکومت کے کارندوں کو غلط اطلاعات دے کر ہمارے کئی ساتھی گرفتار کر دیے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا:

ایک گدھ حسین فضا میں محو پرواہ تھی۔ فضا کا سارا حسن غارت ہو گیا تھا۔ مقبول بٹ نے کہا امر چند کو پکڑ کر اپنے قابو میں رکھنا چاہیے۔ اس نے کشمیری حریت پسندوں کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر آسمان کی فضا کو مکدر بناتے ہوئے گدھ کو دیکھا ”ٹھیک ہے“ میں نے آہستہ سے کہا وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا پھر سورج مغرب میں چھپ گیا۔ اندھیرا پھیلنے لگا، مقبول بٹ نے کہا:

12 بجے باقی ساتھیوں کو بھی چوکnar کھانا۔ امر چند ضلع بارہ مولا کے قصبے ”نادی بل“ میں رہا۔ پذیر تھا۔ ہم نے اسے گرفتار کرنے کے لیے پانچ آدمیوں کا چھاپہ مار دستہ بنایا۔ اس دستے میں مقبول بٹ، اور نگریب، میں، صوبیدار کا لے خان اور محمد ڈار شامل تھے۔ جب ٹھیک بارہ بجے تو ہم نے امر چند کے مکان کا گھیراؤ کر لیا۔ رات درختوں کی طرح خاموش تھی۔ ہم نے باری باری اسے آواز دی۔ تھوڑی دیر تک ہماری آواز کی گونج ہی ہمیں سنائی دیتی رہی۔ چند لمحے اور گزرے تو اس کے بھائی نے اندر سے جواب دیا۔ ”امر سنگھ گھر میں نہیں ہے وہ ہبید کو اڑ گیا ہوا ہے“۔ ہم نے پھر آواز دی ”ہم سری نگر سے آئے

ہوئے ہیں اور اسے ضروری ملنا چاہتے ہیں۔

پھر بھی کسی نے دروازہ نہ کھولا تو ہم نے آگے بڑھ کر دروازہ توڑ دیا۔ دروازہ ٹوٹا تو سامنے مادھورا م کھڑا تھا۔ امر چند کا بھائی، جو چنچ چنچ کرتا تھا کہ امر چند گھر میں نہیں ہے، وہ اکیلا گھر میں ہے

مقبول بٹ نے حکم دیا:

”اوپر والی منزل پر چلو۔ میں ان کے سچ جھوٹ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

جب ہم اوپر والی منزل میں گئے تو اچانک امر چند پستول تانے ہوئے سامنے آگیا۔ مقبول بٹ ابھی نیچے تھے، میں نے انھیں آواز دی ”اوپر آؤ وہ یہاں ہے۔“

مقبول بٹ بڑی تیزی کے ساتھ اوپر چڑھے اور گرج دار آواز میں پوچھا:

”کہاں ہیں وہ کاغذات جو تم نے کشمیری حریت پسندوں کی گرفتاری کی نشاندہی کے لیے

مرتب کر رکھے ہیں؟“

وہ گھبرا گیا، اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچ جا گرا۔ صوبے دار کا لے خان نے لپک کر پستول اٹھالیا، پستول کو ان لوڈ کیا گیا تو اس میں ایک گولی موجود تھی۔ مقبول بٹ نے مجھے اور اونگ زیب کو حکم دیا کہ اسے پکڑ کر نیچے اتارا جائے۔

ہم امر چند کو پکڑ کر نیچے لائے اور اسے کہا کہ اسے آزاد کشمیر میں لے جایا جائے گا۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن اسے بتانا ہو گا کہ مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنے کے لیے کیا کیا منصوبے تیار کیے ہیں وہ عجیب چالاک شخص تھا چپ سادھے کھڑا رہا۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں ”نادی بل“ کے بیشتر لوگ جاگ گئے تھے اور وہ بھی امر چند کے مکان کے پاس جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے اور اس بات پر خوش تھے کہ کشمیری حریت پسنداب بھارتی ایجنسیوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نے خوشی میں نظرے لگانے شروع کیے تو ہم نے انھیں خاموش رہنے کی تلقین کی اور بتایا کہ ان کے شور سے بھارتی فوجی دستے خبردار ہو سکتے ہیں۔ پورے علاقہ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ کشمیری مجاہدین مقبوضہ کو آزاد کرنے کے لیے اس قصبے تک آپنچے ہیں۔ امر چند کے گھر سے نکلنے نکلنے مقبول بٹ نے سکھ

ایئر مارشل ارجمن سنگھ کی تصویر اٹھائی اور اسے پھاڑ دیا۔ ”یہ سکھوں کا بھی غدار ہے اور ہمارا بھی“۔

جب ہم نے امر سنگھ پر واضح کر دیا کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتے تو وہ مننا نے لگا۔ ”مجھ کو سرحد کے اس پارندہ لے جاؤ میں بھارتی ہوں اور اس ملک سے کہیں اور نہیں جاؤں گا مجھے بھیں ماردو، بھیں ماردو“۔ امر چند کو گرفتار کرنے کی کارروائی کے دوران صوبے دار کالاخان زخمی ہو گیا تھا۔ محمد ڈار نے ہمیں کہا کہ وہ کالے خال کو کسی قربی جگہ لے جاتا ہے تاکہ اس کی مرہم پٹی کر سکے۔ اس وقت تک ہمیں یہ علم نہیں ہوا تھا کہ محمد ڈار بھارتی ایجنت ہے اور وہ کشمیری مجاہد کے روپ میں ہماری مخبری کر دے گا۔ محمد ڈار کو بھی یہ علم نہ تھا کہ بعد میں امر چند کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ محمد ڈار کو مومہن سنگھ چودھری نے جو بھارتی خفیہ پولیس کا ذی۔ آئی۔ جی تھا، ہم لوگوں کی صفوں میں شامل کیا تھا۔ محمد ڈار صوبیدار کالے خان کو لے کر ایک طرف نکل گیا اور ہم امر چند کو لے کر تیزی کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلے۔

چلتے چلتے مقبول بٹ نے پوچھا:

محمد ڈار ہماری صفوں میں شامل تو ہو چکا ہے مگر اس کا پورا آتھ پتہ تمہیں معلوم ہے؟۔

”ہاں“ میں نے کہا۔ اس نے اپنے گاؤں کا نام ”شانہ نو“ بتایا ہے۔ خیر ٹھیک ہے چلو اس کے گاؤں چلتے ہیں۔ ہم تھوڑی دور چلتے تھے کہ امر چند نے حاجت رفع کا بہانہ بنانا شروع کر دیا۔ رات آہستہ آہستہ داخل رہی تھی۔ جب امر چند نے شدت سے مطالبة کیا تو ہم نے اسے اجازت دے دی۔ اس حالت میں بھی اس کا دھوکہ دینے والا ذہن کام کر رہا تھا۔ اس نے فوراً بھاگنے کی کوشش کی ہم نے اسے بہت آواز دی۔ گولی مارنے کی دھمکی دی مگر وہ مسلسل بھاگتا رہا۔ ہم نے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے گولی چلائی اور اتفاق سے وہ اسے لگ گئی۔ آسمان گدھوں سے پاک ایک طرف سے دوسری طرف تک ہمیں اپنی پناہ میں لیے ہوئے تھا۔ مقبول بٹ ایک لمحہ کے لیے رُکے اور بولے۔

اب ہمیں فوری طور پر کہیں چھپنا ہو گا۔

یہ کہہ کر وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ میں مقبوضہ کشمیر کا رہنے والا تھا۔ مجھے اس علاقے میں کشمیری حریت پسندوں کے بارے میں بیشادی معلومات حاصل تھیں مگر اس وقت کوئی چہرہ

سامنے نہیں آرہا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے مقبول بٹ سے کہا ”ٹھیک ہے میرے ساتھ آئیں۔“
 ہم ”کوئیل“ نامی ایک قبیلے میں پہنچ اور ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک شخص نکلا۔ ہم نے پناہ لینے کی درخواست کی اور پھر یہ جان کر کہ وہ اکیلا رہتا ہے جواب سے بغیر اندر داخل ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص کا نام عبد اللہ میر ہے۔ اس نے بعد میں یہ بتایا کہ اس کے بیوی پہنچ ساتھ کے ماحقہ مکان میں ہیں۔ ہم نے اس سے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کیں اور صرف ایک رات گزارنے کی مہلت مانگی۔ رات لیٹئے لیئے مقبول بٹ نے مجھے کہا کہ صوبیدار کا لے خان کو تلاش کرنا چاہیے۔ میں کا لے خان کی تلاش میں نکلا۔ مختلف مقامات پر اسے تلاش کیا اور آخر ایک جگہ دونوں مل گئے۔ اس وقت تک مجھے علم نہ ہوا کہ محمد ڈار نے کالاخاں کی مرہم پڑی کروانے کے بہانے کیا کچھ کر دیا ہے۔ میں دونوں کے ساتھ عبد اللہ میر کے گھر آیا اور تھوڑی دیر تک صبح کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد لیٹ گئے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ امر چند کے بھائی نے اب تک فوجی دستوں اور پولیس کو چوکنا کر دیا ہو گا اور پورے علاقے میں ہماری تلاش کی جا رہی ہو گی۔ ہمارا عظیم ساتھی مقبول بٹ بھی چھت کو گھورتے ہوئے آئندہ کے منصوبے بنانے میں مصروف تھا۔ رات کے کسی لمحے میری آنکھ لگ گئی۔ صبح مقبول بٹ سب کو دبی دبی زبان میں آوازیں دے رہا تھا۔ ہم اُنھے ناشتہ کیا اور چائے پینے لگے۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ عبد اللہ میر کی بیوی نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے شوہر کو بتایا کہ کئی فوجی دستے ان کے مکان کے ارد گرد پھیل گئے ہیں۔

ہم کچے پکے ”کوئیل“ نامی قبیلے میں عبد اللہ میر کے گھر کی کچی دیواروں میں محصور ہو چکے تھے اور ان دیواروں کو بھارت کے مسلح دستوں کی دیواروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پورا کشمیر اس ایک منظر سے دیکھا جا سکتا تھا۔

”بٹ صاحب“ میں نے مقبول بٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا :

اگر پولیس والوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، ان کی تعداد جتنی بھی ہو گی وہ بھاگ جائیں گے۔ لیکن اگر فوج کے دستے ہمارے تعاقب میں ہیں تو پھر ہم آخری گولی تک بڑیں گے۔

مقبول بٹ کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح اطمینان تھا۔ کمرے میں چڑاغ بجھ گیا تھا اور اس کی جگہ روشن آنکھوں نے لے لی تھی۔ میں نے کھڑی کی اوٹ سے باہر جھانا کا۔ سکھ اور گورکھا بنا لیں کی تقریباً پانچ کمپنیوں نے اس ٹوٹے پھوٹے مکان کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔

”مقبول بھائی“ ایسا لگتا ہے کہ کشمیر کی سرز میں کے ساتھ ہمارا وعدہ پورا ہو گیا ہے۔ اب ہم یہاں سے نہیں بخیج سکتے۔۔۔

مقبول بٹ نے میری بات کا جواب دیئے بغیر ایک نظر کھڑی کی طرف دیکھا اور بولے۔

”دیر نہ کرو فوراً فائر کھول دو۔ تمہارے پاس گولی نہیں بچنی چاہیے، جان نہ بچ تو ہمیں اس کی پرواہ نہ ہوگی“۔ میں نے لمحہ قریب آتے بھارتی فوجیوں کی طرف جوابی فائر کیے۔ بھارتی فوجی ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے پہلے ہی اکا دکا فائر کر رہے تھے۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں ہماری آنکھوں کے سامنے 19 سالہ اور نگ زیب کی روشن آنکھیں ہمیشہ کے لیے بجھ گئیں۔ یہ گلاب آزاد کشمیر سے چوری چھپے مقبوضہ کشمیر میں آیا تھا اور اسی زمین پر اپنی خوشبو چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔ میں نے اور نگ زیب کی نعش کو اپنی طرف کھینچا، اس کے جوان لہو کی بس اب بھی میرے ہاتھوں میں موجود ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی پیٹھ پرنہ گولیوں کے نشان تھے اور نہ لہو کا رنگ تھا۔ اس نے اپنا سینہ، صرف سینہ دشمنوں کے سامنے رکھا تھا۔

اور نگ زیب ملگت کا رہنے والا تھا۔ مقبول بٹ کی تحریک میں شامل ہونے کے بعد اس نے عملی جدوجہد میں حصہ لینے کا حلف اٹھایا تھا۔ اُس کی صحبت قابلِ رشک تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں آنے کے بعد وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ مقبوضہ کشمیر سے اس وقت جائے گا جب اس کی سرز میں بھارتی حکمرانوں سے آزادی حاصل کر لے گی۔ اگر وہ زندگی میں اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکا تو کشمیر کے لیے جان تک دے دے گا۔ اور پھر اس نے کشمیر کے لیے جان دے دی۔

ہم نے کافی دیر تک بھارتی فوج کی مزاحمت کی اور وہ لمحہ بھی آگیا جب ہمارا بارود اور دشمنوں کا حوصلہ نہ تھم ہو گیا۔ میرے ساتھ ساتھ مقبول بٹ اور صوبیدار کا لے خان بھی زخموں سے چور چور ہو چکے تھے مگر محمد ذار ایک کونے میں گولیوں اور زخموں سے محفوظ بیٹھا تھا۔

جب بھارتی فوجی مکان کی کچی دیواریں پھلانگ کر اچانک اندر کو دے تو ہم تینوں ان کی رائفلوں کے بٹ اور ملکوں کا نشانہ بننے ہوئے تھے۔ جب کہ محمد ڈار الگ کھڑا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک ان تمام مسلمان غداروں کے چہرے گھوم گئے جن کی سازشوں اور بے وفاکوں سے مسلمانوں کو تاریخ کے نازک ترین لمحات میں شکست سے دو چار ہونا پڑا تھا۔ ہمارے منہ سے لہو بہہ رہا تھا مگر ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ یہ لہو ہمارا اپنا تھا۔ جب ہمیں اٹھا کر جیپوں میں ڈالا جا رہا تھا تو میں نے سوچی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ عبداللہ میر کو گھونسوں اور ملکوں سے مارا جا رہا تھا اور اس کے گھر کی عورتوں کو تو ہیں آمیز انداز میں گھسیٹا جا رہا تھا۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ ہمیں ایک رات پناہ دینے کے جرم میں اس بستی کے نمبردار حسین شاہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا حالانکہ اُسے ہمارے کوئی نیل میں آنے اور رات گزارنے کا علم تک نہ تھا۔ حسین شاہ پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے حکومت کو بروقت خبردار نہیں کیا تھا۔ گرفتاری کے بعد ہمیں ”سوپوریسٹ ہاؤس“ میں لا یا گیا۔ ضلع بارہ مولہ کے اس مشہور ریسٹ ہاؤس میں ہماری شناخت پر یہ ہونا تھی۔ امر چند کے تمام رشتہ دار پہلے سے یہاں پہنچا دیے گئے تھے۔ ایک ایسے گروہ کے یہاں لانے کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا جنہیں جھوٹی گواہی دینے پر مامور کیا جاتا تھا۔ یہ گروہ ہر اس شخص کوڑا کو کا نام دے دیتا تھا جسے حکومت مختلف نوعیت کے جرام میں پھنسانا چاہتی تھی۔ ہم دو دن تک اس ریسٹ ہاؤس میں رہے اور ان دو دنوں میں ہم پر جو بیتی اس کا تصور ہی محال ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں دو دن کی شناخت پر یہ کے بعد ہمیں سری نگر کے بدنام تجسساتی مرکز ”مہتاب باغ انیٹر و گیشن سنٹر“ میں لا یا گیا۔ اب ہمارے صبر اور برداشت کا اصل امتحان شروع ہو گیا۔ ”مہتاب باغ“ میں ایک مہینہ ہمارے لیے صد یوں کا عذاب بن کر رہ گیا۔ صبح سے شام تک وہی بھارتی اذیت دینے والے مختلف آلات کے ذریعے ہم پر تشدد کرتے۔ ہماری آنکھیں کھلی رہتیں۔ مگر اذیت دینے والے آلات کے علاوہ کائنات کی کوئی چیز ہمیں دکھائی نہ دیتی۔ ہمارے ہاتھوں کے نافن کھینچ کھینچ کر اکھڑے گئے۔ آنکھوں کے قریب بڑی پاور کے بلب روشن رکھے جاتے تاکہ ہماری آنکھوں کا پانی خشک ہو کر رہ جائے۔ اگرچہ آنکھوں سے ہر وقت پانی رستا رہتا تھا مگر یہ شکست کے آنسو نہ تھے۔ شکست تو انسان دل سے تسلیم کرتا ہے اور ہمارے دل نے آج تک شکست تسلیم نہیں کی۔ پوچھ

پچھے کے دوران اصل سوال یہ کیا جاتا تھا کہ ہم نے ٹریننگ کہاں سے حاصل کی ہے۔ آزاد کشمیر میں دریت پسندوں کے مرکز کہاں کہاں ہیں۔ پاکستان کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے اور مقبول بٹ کا اور ہم سب کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

”ہم حریت پسند ہیں اور حریت پسند کہیں سے بھی تربیت حاصل کر سکتا ہے۔ ہمارا کسی سے تعلق نہیں۔“
ہمارا تعلق صرف کشمیر کی آزادی کی جدوجہد سے ہے۔“

”مہتاب باغ انیٹر و گیشن سنٹر“ میں تین مکھموں، انڈین انٹلی جنس بیورو، کشمیر انٹلی جنس اور بارڈر سیکورٹی فورس کے حکام تحقیق کی غرض سے ہمارے پاس آتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ ان تینوں مکھموں کے بعض با اثر افراد نے بھی آکر مقبول بٹ سے ملاقات کی اور سزا کے ساتھ ساتھ لائچ کا حزبہ استعمال کرنے کی کوششیں کیں۔

”آپ لوگ جو مانگنا چاہتے ہیں ہم دینے کو تیار ہیں لیکن مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کو ترک کر دیا جائے، آزادی کے خیالات کو ذہن سے نکال دیا جائے۔“
اور مقبول بٹ کہتے تھے.....

”ہم نے قوم کے لیے اپنی جان کو وقف کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ بخاری نوج سر زمین کشمیر سے نکل جائے۔“

ایک بارڈی۔ آئی۔ جی جن کا تعلق دہلی سے تھا، مسٹر شرما آئے اور بڑی دیر تک مقبول بٹ سے بحث کرتے رہے۔

”بٹ صاحب ہم آپ کو وہ کچھ دینے کو تیار ہیں جو آج تک کسی کو نہیں دیا، آپ اپنے ارادوں کو ترک کر دیں۔ مقبول بٹ نے جواب دیا.....

”جسے ہم اچھا سمجھتے ہیں اسے آپ برا سمجھتے ہیں۔ جسے آپ برا سمجھتے ہیں اسے ہم اچھا سمجھتے ہیں۔“

مسٹر شرما نے کہا : آپ کی اس جملے سے کیا مراد ہے؟
.....
مقبول بٹ نے جواب دیا.....

”تم نے اس بات کو اچھا سمجھا کہ طاقت کے بل بوتے پر ہماری زمین پر قبضہ کر لیا اور پوری کشمیری قوم کو غلامی کی زنجروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہم لوگ تمہارے اس اقدام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنی آزادی کے لیے ہم اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو بھی رستے سے ہٹانے کے لیے تیار ہیں۔“

اس نے مقبول بٹ کا یہ جواب سناتو غصتے سے چلا یا ”لے جاؤ ان..... کو..... ان کا جسم ادھیر کر رکھ دو۔“ اس اذیت ناک تحقیقاتی مرکز میں لمحہ ہمارا ہب نچوڑا گیا ہمیں اس بات پر فخر تھا کہ ہم نے اس جگہ اپنے صبر و تحمل کے امتحان کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کر لیا ہے۔ ایک مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ اگلے روز آرمی گارڈ آگئی۔ ہمیں فوجی جیپوں میں بٹھایا گیا اور اب گاڑیوں کا رخ سنترل جیل سری نگر کی طرف تھا۔ بچکوں کے ہاتھی ہوئی فوجی گاڑیوں میں مقبول بٹ نے نگرانی پر مامور فوجی سے پوچھا :

”ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟“

”تم لوگوں کو جیل میں رکھا جائے گا۔ تمہارے خلاف مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ یہ مقدمات خطرناک جرائم کے سلسلے میں درج کیے گئے ہیں۔“

سنترل جیل سری نگر میں ہمارے لیے پہلے سے ایک خفیہ کمرہ بنادیا گیا تھا۔ ہمیں ابھی تک علم نہیں تھا کہ جیل میں کیا ہونے والا ہے۔ دوسرے دن اچانک ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے خلاف کسی مقدمے کے سلسلے میں (بند کمرے میں عدالت) با قاعدہ عدالتی کا رروائی ہونے والی ہے۔ ابھی ہم انھی خیالات میں گم تھے کہ جیل حکام ہمارے پاس آئے اور بولے :

”تم لوگوں کے خلاف اسی جیل میں عدالتی کا رروائی کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔“

اگلے دن ہم سرکاری عدالت کے سامنے کھڑے تھے۔ نیل کنٹھ گنجوں عدالت کا نجح تھا۔ اس کے بارے میں ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ وہ ہندو پنڈت تھا اور کشمیری مسلمانوں کے بارے میں بہت زیادہ تعصب رکھتا تھا۔ پہلی ساعت کے دوران ہمیں محسوس ہوا کہ استغاشہ اور صفائی کے وکلا حکومت نے خود ہی مقرر کر لیے ہیں۔ نجیل کنٹھ نے مقبول بٹ اور مجھے مناطب کرتے ہوئے کہا :

”تم لوگوں کے لیے وکیل کا باضابطہ تقریب رہنا ہے عدالت کو بتایا جائے کہ تم کشمیر (مقبوضہ) سے اپنے لیے کوئی وکیل مقرر کروانا پسند کرو گے یا پاکستان سے تمہارے لیے کوئی وکیل منگوایا جائے۔“

”اگر آپ اجازت دیں تو ہم پاکستان سے بھی وکیل منگو سکتے ہیں“ مقبول بٹ نے جواب دیا:

جیل میں قائم کی گئی اس عدالت میں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی رہی اور پھر مقبول بٹ دوبارہ بولے:

”ہمیں بتایا جائے کہ ہم پاکستان سے اپنے لیے وکیل منگوالیں“ اس پر بچ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آہستہ آہستہ بولے:

”یہ معاملہ حکومت کے اختیار میں ہے۔ اگر بھارتی حکومت چاہے تو ایسا ممکن ہے۔“
اگلے روز ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری طرف سے ڈاکٹرو نامی ایک مسلمان وکیل کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے شام لال پڑو نامی وکیل ہمارے مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ آٹھ دن کے بعد ہمیں ڈاکٹرو نامی نے کہا کہ اسے اس مقدمے میں کامیابی کی امید نظر نہیں آتی۔ دراصل اس برے پناہ دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ ایک روز گزر تو سرکاری وکیل پر اسرار طور پر موت کا شکار ہو گیا۔

سرکاری وکیل شام لال پڑو کا پر اسرار طریقے سے انتقال کر جانا جیل میں دیر تک موضوع بحث بنارہ۔ ادھر ہمارے وکیل پر نہ جانے کیسادباو پڑ رہا تھا کہ اس نے ہمیں صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ وہ ہمارا مقدمہ جیت نہیں پائے گا۔ وہ سچا تھا۔ کوئی جنگل میں بھیڑیے کے خلاف فیصلہ نہ ساکتا ہے۔ آخری دن جاتے جاتے وہ بولا:

”کل سے میری جگہ نیا وکیل آئے گا، شام لال پڑو کی جگہ سرکاری وکیل بھی اب کوئی اور ہی ہو گا، میں آپ کو صرف اور صرف خدا کے سپرد کر سکتا ہوں“۔

اگلی تاریخ سماعت پر بچ نیل کٹھنے گجو نے جیل سپرنژنڈنٹ محمود قریشی کی وساطت سے مقبول بٹ کو اور ہمیں پیغام بھجوایا کہ:

”اگر آپ لوگ کسی طریقے سے اپنے نئے وکیل کا انتخاب خود کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں“۔
مقبول بٹ نے اپنے بھائی غلام بنی بٹ کو جو موضع تربیہ گام میں مقیم تھے خط لکھا، یہ خط کیا تھا پنجھے میں بند عقاب کی صدائی۔ خط ملتے ہی ان کے بھائی نے ادھر ادھر بات کی اور جب ملاقات

کے لیے آئے تو لطیف قریشی کے نام سے ایک وکیل کے انتخاب کی خبر بھی دی۔ لطیف قریشی اپنے وکیل تھے مگر وہاں وکالت تو محض دکھاوے کے لیے تھی۔ نج اُن کی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب انہوں نے قانون کا صحیح معنوں میں سہارا لینا شروع کیا تو ہی ہوا جس کا خطرہ تھا انہیں سنگین نتائج کی دھمکی دے کر بتایا گیا کہ اس مقدمے میں زیادہ دل چسپی نہ لی جائے۔ لطیف قریشی نے ہمیں حالات سے آگاہ کیا۔ سرکاری وکیل شانتی چودھری کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی مگر اس کی راہنمائی عدالت کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ آخر ہم اور قانون، انصاف اور سچائی ہار گئی اور اقتدار جیت گیا۔ عدالت کی طرف سے مجھے اور مقبول بٹ کوموت کی سزا دی گئی اور صوبیدار کا لے خان کو 14 برس قید کی سزا دینے کا فیصلہ نایا گیا۔ یہ فیصلہ ہمارے ساتھ جیل کی اندر ہی دیواروں نے بھی سنا اور ہماری طرح خاموش رہیں۔ فیصلہ کا اعلان ہوتے ہی ہمیں جیل کے ”عورتوں کے سیل“ میں منتقل کر دیا گیا۔ اسی ”سیل“ میں تین اور آدمی بھی بھیج دیے گئے۔ جگہ کم تھی مگر یہ لوگ بھی کلمہ گو تھے چنانچہ ان کے آنے سے جگہ مزید تنگ اور ہمارے سینے اور زیادہ کھلے ہو گئے۔ نئے آنے والے گل زمان خان اور جمس خان تھے گل زمان 14 اے کے آرمی سے تعلق رکھتا تھا جمس خان رضا کار مجاہد تھا۔ ان کو بھارتی فوج نے بار ڈر سے دھوکہ دے کر گرفتار کیا تھا۔

سزاۓ موت کے فیصلے کو کا عدم قرار دلانے کے لیے ہماری طرف سے بھارت کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر ڈاکٹر حسین سے اپیل کی گئی۔ ابھی اس اپیل کا فیصلہ ہونا باقی تھا اور ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ فیصلہ کیا ہو گا کہ میں نے اور مقبول بٹ نے جیل سے فرار کا منصوبہ بنایا۔ فرار کے اس منصوبے کے بارے میں جو باتیں میں بتا رہوں وہ ایسی ہیں کہ ان کا مکمل ذکر مقبول بٹ نے بھی لا ہو رہا میں عدالت میں دیے گئے اپنے بیان میں مصلحتاً نہیں کیا تھا۔ اب جب بھارتی حکومت کے ارادوں اور کشمیری عوام اور کشمیر کی سر زمین سے محبت اور وفاداری ثابت ہو چکی ہے تو میں یہ سب کچھ بتا رہوں۔

جیل کے جس سیل میں ہمیں رکھا گیا تھا۔ وہاں ہم سے پہلے کسی نیک سیرت مسلمان قیدی نے قرآن پاک رکھنے کے لیے ایک تختہ بچھانے کے لیے لمبا کیل گاڑ رکھا تھا۔ ایک شام ہم معمول کے مطابق لیٹئے تھے کہ مقبول بٹ کہنے لگا :

”میراحمد! یوں لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہماری امداد کے لیے کچھ نہ کچھ وسیلہ سامنے لانے والا ہے۔ وہ سامنے کیل دیکھ رہے ہو۔“

میں نے کیل پر زگاہ ڈالی اور جیل کی موٹی دیوار کے اس پارٹ کچل چلی گئی :

”ہاں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں مگر اس کے لیے جیل کے عملے میں اعتماد کی فضا پیدا کرنا ہو گیتا کہ کسی کوشہ نہ ہو۔“

ماہ رمضان کے مبارک دن تھے۔ ہم نے اپنی کوٹھری کی دیواروں پر چادریں لگا دن تھیں اور یہی چادریں ایک بڑے فیصلے کی کامیابی کے سلسلے میں ہماری مددگار ثابت ہونے والی تھیں۔ میں نے ایک نظر پھر کیل پر ڈالی اور پلک جھکنے میں اُسے دیوار سے اکھاڑ لیا۔ مقبول بٹ بولا:

”میراحمد! تمہاری آنکھوں میں اچانک چیتے جیسی چمک آگئی ہے۔ ہمت کرو خدا تمہاری مدد کرے گا۔“

میں نے خاموشی اور احتیاط کے ساتھ ایک دیوار کے عقبی حصے کا اندازہ لگایا اور کیل کے ساتھ کھدائی شروع کر دی۔ رات کے کسی حصے میں کھدائی کرتا اور مقبول بٹ ہر آہٹ پر کان دھرتے۔ آہستہ آہستہ میں نے دیوار کے اندر ہی اندر سات فٹ لمبا سوراخ کر لیا۔ قارئین کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سوراخ میں میں خود سرکی سوت سے لیٹ کر اندر جاتا تھا۔ اس ضمن میں ایک خاص بات کا ذکر ضروری ہے کہ یاسین نامی ایک مسلمان نوجوان کو مقبوضہ کشمیر کی حکومت کی طرف سے پاکستان کے جاسوس ہونے کے الزام میں اس جیل میں قید کیا گیا تھا۔ وہ ہماری کوٹھری سے ماحقہ کوٹھری میں بند تھا اور جیل حکام نے ہماری روٹی اور دودھ وغیرہ لانے کے ضمن میں اُس کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی۔ یہ اُس کی سزا کا ایک حصہ بھی تھی۔

جیل سے فرار کی تیاریاں خاموشی کے ساتھ جاری تھیں۔ صرف رات ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ دن کے اجائے میں ہم جیل کے ٹاف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراہٹوں سے اپنے منصوبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے۔ سوراخ سے بہت ساری مٹی نکالی جا چکی تھی۔ جسے ہم نے فرش پر اپنی چادریوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ کپڑا اُس بڑے سوراخ کی حفاظت کر رہا تھا جو ابھی مکمل

کیا جانا تھا۔ سوراخ میں سے کسی نے راستہ چھوڑ دیا تو اچانک ایک پتھر سامنے آگیا۔ میں نے منی سے بھرے ہوئے ہاتھوں اور پینے سے ترا تھے کے ساتھ مقبول بٹ سے کہا ”اب کیا ہو گا؟“

”کچھ نہیں ہو گا۔ خدا خیر کرے گا۔ کام جاری رکھو،“ سحری کا وہ لمحہ مجھے آج بھی یاد آئے تو، مامن پ کا نب جاتا ہے جب میں نے پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لیے نگے کے سے ٹھوکر ماری تھی، پتھر لٹھک کر نیچے گرا تھا اور زور سے آواز آئی تھی۔ اُس لمحے ہمارے قید خانے کی دیواروں سے زیادہ ہزارا دل دھڑکا تھا۔ رات کے دونج کر دس منٹ کا وقت تھا۔ پتھر دور نیچے تک لٹھکتا چلا گیا تھا کیوں کہ نیچے ڈھلوان تھی۔ بٹ صاحب نے صحیح کہا تھا اللہ ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ پتھر گرنے کی آواز ہمارے دل کی دھڑکن بن کر رہ گئی۔ ادھر سے کام مکمل ہوا تھا تو مقبول بٹ نے سحری کھانے کے سلسلے میں جیل کے کمانڈر سبرا مینیم سے کہا کہ وہ یا میں کو بلا بھیجے۔ اس سے ایک دن قبل ہم نے صوبے دار کالا خان کو دوسرے قیدیوں کے ساتھ رکھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ صوبے دار کا لے خان ضعیف ہونے کی وجہ سے جیل سے فرار نہیں ہو سکتا تھا اور پھر اسے ہماری طرح سزاۓ موت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارا پروگرام تھا کہ خود فرار ہونے کے بعد اسے کسی اور طریقے سے جیل سے نکلوائیں گے۔ ہمارے مطالبے پر جیل کے چیف وارڈن مکھن لال نے صوبے دار کالا خان کو بارک نمبر 9 میں منتقل کر دیا تھا۔ اسی بارک میں عبدالحمید دیوانی بھی موجود تھے جنہوں نے بھارت کا مسافر بردار طیارہ انغو اکرنے والے کشمیری حریت پسندوں کی راہنمائی کی اور آج کل پاکستان میں ہیں۔ عبدالحمید دیوانی کے پاس صوبیدار کا لے خان کو پہنچائے جانے کے بعد ہم مطمئن ہو گئے تھے۔ چنانچہ فرار کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

جیل کے تمام مسلح دستے مقبول بٹ کے اعلیٰ کردار کے قائل تھے اور اگرچہ فرار کا منصوبہ ہم نے خود تیار کیا تھا مگر ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم نگران دستوں سے اس ضمن میں باقاعدہ مدد کی درخواست کرتے تو ہمارے کردار کی پختگی اور کشمیر کے ساتھ ہماری وابستگی کے سچے جذبات کو دیکھ کر ان میں سے بعض مسلمان محافظ ہماری مدد کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے۔ تباہم ہم نے کسی کو اس ضمن میں اپنا ہم راز بنانا مناسب نہ سمجھا۔ جیل میں ڈاکٹر نے ہماری ”میڈیکل خوراک“ کے احکامات جاری کر رکھے تھے۔ چنانچہ جب ہم نے سبرا مینیم سے کہا کہ رمضان المبارک کی وجہ سے ہم نے سحری کھانی ہے۔

یاسین سے ہمیں اسی وقت ہماری خوراک مہیا کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ یاسین کو ہدایات دینے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یاسین ہمارے لیے انڈے دودھ لے کر آگیا اس سے قبل بھی ہم نے کچھ خوراک اسی ارادے سے جمع کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ فرار کی صورت میں ہمارے کام آئے گی۔ ہم نے جلدی جلدی چھوٹا موٹا سامان باندھا۔ ہاتھ کام کر رہے تھے اور ہماری سانس زکی سی تھی۔ زادراہ میں ایک درجن انڈے، پچھر قم، پانچ پانچ کمل اور فیرن (یہ کشمیری لفظ ہے جو گاؤں کی طرح کے لباس کے لیے استعمال ہوتا ہے) اور کچھ دوسری خشک خوراک پر منی سامان تھا۔

چوں کہ سوراخ میں نے کیا تھا اس لیے تجرباتی طور پر پہلے میں سوراخ سے باہر آیا پھر یاسین کو نکالا گیا اور آخر میں مقبول بٹ نے جیل کے اس "سیل" کو چھوڑا جس میں ہم سزاۓ موت کے دو قیدیوں نے زندگی کے انہائی قیمتی دن گزارے تھے۔

مقبول بٹ کا جسم ہم سے بھاری تھا۔ وہ اس سوراخ میں تقریباً کھنس کر رہا گئے۔ اس وقت ہماری حالت دیدنی تھی۔ میں نے اور یاسین نے کھنچ کر انھیں باہر نکالا تو ان کے پاجامے کا ایک پانچھ سوراخ کے اندر ہی پھٹ کر رہا گیا۔ ہمارے جسم مختلف جگہ سے معمولی زخمی ہو گئے تھے مگر روح عجیب آزادی کی لذت سے ہمکنار تھی۔ پوری فضاسائیں سائیں کر رہی تھی ہم نے جیل سے نکلتے ہی "بادام داری" کا رخ کیا۔ یہ ایک باغ ہے اور یہاں سے آگے فرار کے لیے ہمیں قدرت کی طرف سے پناہ کی امید تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ چھپ کرستا نے کے بعد تیزی کے ساتھ ہمارا رخ "کھوجیار مل" نامی قبصے کی طرف ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں کشمیری عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ وہ بظاہر ہماری طرح آزاد تھیں مگر ہماری طرح ان کے گرد بھی غلامی کا ایک بڑا سادا رہ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا ان عورتوں کو کیا معلوم، ہم انھی کے جگر گوشوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے بھائیوں میں سے ایک ہیں۔ اگرچہ ہم کئی راتوں کے جاگے ہوئے تھے مگر عجیب بات تھی کہ ہمارے پاؤں ہماری راہنمائی کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی طاقت ہمیں اپنے ہمراہ لیے جاتی ہو۔ ہمارے دل دھڑکتے رہے، پاؤں اٹھتے رہے اور پھر ایک میل سے زیادہ پاٹ کے پانی نے ہمارا ستہ روک لیا مگر اس وقت ہم کسی بھی رکاوٹ کو عبور کرنے کے مدد میں تھے۔ چنانچہ ہم نے اللہ کا نام لیا اور پانی میں پاؤں

ڈال دیے پانی کی اس رکاوٹ کا نام ”پتل بل“ تھا۔ خشکی کی بجائے پانی کے اس لبے راستے کے اختیار کرنے کا مقصد بھی تھا۔ مقبول بٹ نے مشورہ دیا تھا۔

”اگر ہم پانی میں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھیں گے تو ہم ان کتوں کے عاقب سے بچ جائیں گے جواب تک جبل حکام نے ہمارے پیچھے لگادیے ہوں گے۔“

”کتنے پانی میں سے ہو کر جانے والوں کی بونبیں سونگھے سکتے“۔ میں نے عجیب تیزی کے ساتھ پانی میں چلتے چلتے مقبول بٹ سے پوچھا تھا.....

”نبیں“ مقبول بٹ نے جواب دیا تھا، جنہوں نے یاسین کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔

جب ہم پانی کی رکاوٹ عبور کر چکے تو پہاڑی رکاوٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مقام ”تک“ بل، کہلاتا ہے اور وضع سری نگر میں ہے۔ مقبول بٹ ہمارے راہنمای تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب کسی اور طرف جانے کی بجائے پہاڑوں کی راہ لینا چاہیے۔ اس سے کئی فائدے ہوں گے۔ دشمن کی طرف سے کسی حملے، فائرنگ وغیرہ سے بچنا ممکن ہو جائے گا اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی پہاڑی سلسلے سے فائدہ اٹھا کر ہم آزاد کشمیر میں پہنچ جائیں۔ ہم نے ایک پہاڑی سلسلے کی راہ لی۔ کچھ اور نیچے اُترے تو برف باری نے ہمیں بے بس کر دیا۔ نہ کچھ نظر آتا تھا نہ پاؤں اُٹھ سکتے تھے۔ سردی کے باارے برا حال تھا۔ ہم مجبورًا واپس لوٹے اور ”گاندر بل“، ایک جگہ آنکلے۔ وہاں بھلی گھر بھی ہے۔ دور سے بھلی گھر کا جائزہ لیتے اور اس سے دور رہتے ہوئے ہم ایک کھیت کے اکیلے مکان کی طرف آئے۔ اس وقت تک اجلا پھیل چکا تھا اور ہم پہلے سے زیادہ چوکے اور محتاط ہو گئے تھے۔ ہم مکان کے قریب پہنچنے تو ایک بچے نے اچانک باہر جانا کا اور اندر چھپ گیا۔ پھر بچے نے باہر دیکھا۔ مقبول بٹ نے مسکرا کر بچے کو اعتماد میں لیا اور بولے ”دیکھو گھر میں کوئی بڑا آدمی بھی ہے۔“

بچہ تیزی کے ساتھ اندر گیا اور پھر اس کی جگہ ایک بزرگ باہر آئے اور ہمیں سر سے پاؤں تک گھورنے لگے۔ ان کا انداز انہائی مخفیاً تھا۔ مقبول بٹ نے کہا.....

”اسے پکڑ لومکن ہے یہ بھارت کا آدمی ہو۔“

آسمان پر روشنی دھیمی پڑ رہی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم مقبول بٹ کی ہدایت

پر پھاؤں کے دامن میں واقع اکیلے مکان کے پراسرار بزرگ کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم نے ہاتھ
اٹھایا ہی تھا کہ:

”میں مسلمان ہوں اور آپ لوگوں کا ہم خیال“

میں اللہ اور اُس کے رسول کو گواہ بنانا کہتا ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کے بارے میں خواب
دیکھا تھا۔ اسی خواب کی روشنی میں، میں آپ کے سراپے، چھروں اور دوسرا پہلوؤں کا جائزہ لے رہا
تھا، مجھے خواب میں ایک بزرگ نے کہا کہ صبح تیرے پاس تین مہماں آئیں گے، ان کا خیال رکھنا ہے،
میں اسی خیال سے آپ لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

مقبول بٹ نے بزرگ کی بات سنی تو کہا:

یہ تو آپ کو علم ہو گایا خدا کو۔ ہم آپ کی بات کا یقین کر لیتے ہیں۔ آپ کے پاس کھانے پینے
کے لیے کچھ ہے تو ہمیں اس کی سخت ضرورت ہے۔

آہستہ آہستہ شام کے اندر ہیرے نے ہمارا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔ شام کے آٹھ بجے تو
مقبول بٹ نے کہا کہ مکان کے اندر بیٹھنا چاہیے، ہم اندر چلے گئے۔ اچانک مقبول بٹ بولے:
”ہم میں سے ایک آدمی کو بہر حال مکان سے باہر رہنا چاہیے اس گھر کے کسی بھی آدمی کو باہر
نہ جانے دیا جائے۔“

میں مذکورہ بزرگ کا نام احتیاطاً نہیں بتانا چاہتا۔ اس نے محبت کے ساتھ ہمارے لیے چاول
اور سوکھے ٹماٹر کی ایک پوٹی تیار کی اور ہمیں اپنی دعاوں کے ساتھ رخصت کیا۔ اس ”پناہ گاہ“ سے باہر
آتے ہی ہمارے لیے کئی مسائل کھڑے ہو گئے۔ کھڑا جائیں تعاقب کرنے والے بھارتی فوجیوں
سے کیے بچاؤ ممکن ہے۔ مقبول بٹ نے چند لمحوں میں منصوبہ بندی کر لی۔ مذکورہ بزرگ ابھی ہمارے
پیچے کھڑے تھے وہ قریب آئے۔ مقبول بٹ نے پوچھا:

”اگر ہم نہ ہر (جو سامنے نظر آ رہی تھی) کے ساتھ ساتھ چلیں تو کہاں جائیں گے؟“

یہاں سے پاورہ اس کیا جائے تو آگے پختہ سڑک آجائے گی۔ تھوڑی دور چل کر چوراہا
آجائے گا۔ اس چوراہے سے جو بھی راستہ انتخاب کیا جائے گا۔ درست ہو گا۔

ہم نے مقبول بٹ کے مشورے پر اس بزرگ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ چورا ہے پر پہنچ کر ہم نے اُسے واپس کر دیا۔ کیوں کہ روائی کے وقت اس کی بیوی اور واحد بچہ اس کے لیے پریشان نظر آ رہے تھے۔ جب وہ چلا گیا تو ہم نے وادی کا راستہ اختیار کیا اور چلتے چلتے ”جھیل ول“ کے کنارے جا پہنچے۔ رات آہستہ ہر آواز کو ختم کیے جا رہی تھی۔ ہم اپنی آواز، اپنے قدموں کی چاپ کو خود باتے چلے جا رہے تھے۔ جھیل ول کے کنارے پر پہنچ کر اصل مسئلہ پارا ترنے کا تھا۔

”ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رات کے وقت جو شخص بھی جھیل عبور کرنے کی کوشش کرے یا اس سلسلے میں امداد طلب کرے اس کی اطلاع حکام کو دی جائے۔“

ملاحوں نے ہماری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ جیل سے ہمارے فرار کے ساتھ ہی خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ حکام نے ہماری ہر حالت میں گرفتاری کے لیے 20 ہزار روپے کا اعلان کر دیا تھا۔ انعام لینے کے خواہش مند ہمارے تعاقب میں تھے۔ جگہ جگہ خواتین کے بر قع اتار اتار کر انھیں چیک کیا جا رہا تھا۔ تمام بارڈریل کیے جانے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ اس پس منظر میں ملاح بھی خوف زده تھے۔ دو ملاح ہمارے سامنے تھے اور ان میں بھی ایک اس حالت میں تھا کہ مراحت کرتا۔ مقبول بٹ نے جب محسوس کیا کہ ملاح سیدھی طرح تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہوں نے ہماری طرف دیکھ کر گرج دار آواز میں حکم دیا:

”انھیں پکڑ کر باندھ دو۔ ہم خود کشتی چلا کر اس پار جائیں گے۔“

یہ حکمکی آمیز الفاظ نے تو دونوں ملاح ہمیں پار لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں مقبول بٹ اور یاسین تیزی کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے۔ ابھی رات باقی تھی، ہم چاہتے تھے کہ سورج کا سامنا اس جگہ کریں جہاں اور کسی سے سامنا نہ کرنا پڑے۔ دسمبر کا مہینہ تھا پانی سرد اور ہوا الحلقہ سرد ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں پانی برف کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ کشتی چلانے میں ملاح کو جس کا نام اس کی بھلائی اور تحفظ کے پیش نظر شائع کرنا درست نہیں، مشکل پیش آ رہی تھی۔ ہمیں تین میل اسی بخت بستہ پانی میں سفر کرنا تھا۔ اگرچہ راستے میں ملاح بتیں کرتا رہا لیکن اسے نہ علم ہو سکا کہ ہم کون لوگ ہیں۔ آہستہ

آہستہ تین میل کا یہ کٹھن مرحلہ ہے ہوا۔ دوسرا کنارہ نظر آیا تو سورج گہری دھنڈ کے پیچے سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اب ہم بابا شکر دین (ایک بزرگ کا مزار) کے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ یہ مزار ایک ٹیلے پر ہے ہم نے یہاں اپنے مشن کی کامیابی کی دعا کی۔ مقبول بٹ نے مجھ سے پوچھا:

”یہاں آپ کی کوئی واقفیت ہے؟“

میں نے کہا:

”میرا ایک دوست ہے جو حکومت کے کاغزوں میں ابھی مشکوک نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم اسی وقت اس کے گھر جاسکتے ہیں۔ آپ کو یہ یقین ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہو کا نہیں کرے گا؟“؟“ ہاں یقین ہے وہ سیلونامی گاؤں میں رہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے چلو“

اس گاؤں میں پہنچنے کے بعد ہم مذکورہ شخص قادر ڈار کے گھر پہنچے وہ بڑی محبت سے پیش آیا اور ہم نے رات آرام سے اس کے گھر گزاری۔ صبح کے دو بجے تھے کہ ہم نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا۔ اب آگے ہمیں برف کا راستہ طے کرنا تھا۔ قادر ڈار نے ہمیں گھاس کی ”پولیں“ دیں۔ ”پولیں“، کشمیری میں ایسے جوتے کو کہتے ہیں جو گھاس سے بنایا جاتا ہے اور برف پر چلنے کے لیے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ہم نے قادر ڈار سے ایک پتیلی، کلہاڑی، نمک اور ”یاجی“ لی ”یاجی“ چاول کے آٹے سے بنائی گئی ایک روٹی کی شکل ہوتی ہے۔ یہ خشک راشن ہوتا ہے اور بڑی دیر تک خراب نہیں ہوتا، سامان لینے کے بعد ہم نے سفر شروع کیا۔ اس وقت چرند پرند اور تمام کائنات حمد باری تعالیٰ میں مصروف تھی۔ پھر صبح ہوئی اور سورج کے ساتھ ساتھ ہمارا سفر جاری رہا۔ صرف زمین اور وہ بھی بر فیلی زمین ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ 30 میل کا سفر کرتے کرتے سورج ایک بار پھر ساتھ چھوڑ گیا۔ شام ہوتے ہوتے ہم ”ہرل“ نامی ایک گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔

30 میل کے تھا دینے والے سفر کے بعد ہم ”ہرل“ نامی گاؤں میں پہنچ تو ہر طرف اندر ہمرا پھیل چکا تھا بستی میں ایسا کوئی نہ تھا جسے دل کا حال بتاتے۔ مسلسل سفر اور ایک آن جانے خوف سے ہماری حالت غیر ہو چکی تھی۔ نظریں اٹھیں اور ہر طرف سے مایوس ہو کر واپس لوٹ آئیں تو ہم نے اللہ

کے گھر کارخ کیارات مسجد میں گزاری۔ صبح کی نماز کے وقت نمازوں کی مختصری تعداد میں تمیں اجنبی چہرے دیکھے گئے تو چہ میگویاں ہونے لگیں۔ ہمیں خطرہ محسوس ہوا اور ہم نماز پڑھ کر جانے والے نمازوں کے ساتھ ہی مسجد سے نکل گئے۔ دن کو جب سورج کے ساتھ ساتھ ہر چیز اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہے، ہم نے چھپ چھپ کر اپنا تحفظ کیا اور آہستہ "ہمام مرکوت" کے مقام پر جا پہنچے۔ یہ مقام ضلع بارہ مولا میں ہے اور سیز فائر لائن کے قریب ہے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ بستیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہم انسانوں کی خوبصورتی بھی دور نکل آئئے تھے۔ ہر طرف جھاڑیاں، بے آباد زمینیں اور برف سے ڈھکی ہوئی پھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ پھاڑ سامنے آیا تو ہم "یا جی" کھاتے آگے بڑھتے رہے۔ دو دن مسلسل چلنے کے بعد پھاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ اس پھاڑ کا نام بعد میں "کاجی ناگ" معلوم ہوا۔ وہ لمحات ہمارے لیے ایک کرب مسلسل کے لمحات تھے۔ ہم "کاجی ناگ" پھاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تھے۔ ہر طرف برف جمی ہوئی تھی اور زخمی جسموں کے ساتھ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ہم نے اب کس طرف جانا ہے اسی سوچ میں گم تھے کہ اچانک ہمیں ایک نالہ دکھائی دیا۔

مقبول بٹ نے اشارہ کیا۔

"چلو اس طرف چلتے ہیں"

پہنچے پہنچے تو یہ پانی کا نالہ نہیں تھا بلکہ بنکر تھے جنہیں فوجیوں نے موسم گرم میں بنایا تھا۔ ہم بنکروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں آگے آگے تھا اور میرا دل مسلسل دھڑک رہا تھا مقبول بٹ نے کہا:

"میرا حمدان بنکروں میں سے اگر سگرٹوں کے خالی پیکٹ یا کوئی اور تحریر نظر آئے تو بتاؤ"۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں یہ معلوم ہو سکے کہ یہ بنکر پاکستانی فوجیوں کے ہیں یا بھارتی فوجیوں کے۔ علاقہ کس کے زیر کنٹول ہے۔ اچانک میری نظر میں ایک طرف انھیں تو سامنے پینے کے پانی کے لیے بنائی گئی ٹینکی نظر آئی۔ نزدیک ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا جس پر ہندی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ مقبول بٹ نے اسے پڑھا تو دھیمی آواز میں چینا:

"واپس بھاگو یہ بھارتی فوجیوں کے ٹھکانے ہیں، ہم ہانپتے ہوئے واپس پھاڑ کی چوٹی تک پہنچے۔ چوٹی پر پہنچ کر ایک بار پھر ہماری نظر میں مقبول بٹ کے چہرے پر جم گئیں۔ انہوں نے اندازے

سے ایک نقشہ بنایا اور ہمیں ایک طرف چلنے کے لیے کہا جس طرف چلنے کے لیے اشارہ کیا گیا تھا اس طرف اترنے کا راستہ یا ڈھالو انہیں تھی ہر طرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ ابھی ہم چلنے کے بارے سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک گڑگڑا ہٹ سنائی دی۔ مقبول بٹ بولے :

”ہو سکتا ہے کہ یہ زلزلے کی آواز ہو“

دو منٹ گزرے تو اچانک ایک طرف سے شیر ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہماری پیٹھے چٹان کی طرف تھی اور ہم نے آگ جلا رکھی تھی۔ شیر آگ کی دوسرا سمت میں تھا۔ اس کے اور ہمارے درمیان تقریباً 30 فٹ کا فاصلہ تھا مقبول بٹ بولے :

”دمن کے مقابلے میں تو ہم سرخور ہے ہیں۔ اب اگر شیر کے ہاتھوں ہم ہمیشہ کی نیند بھی سو جائیں تو بھی کوئی بات نہیں ہے۔“

ہمارے پاس اس کلہاڑی کے علاوہ جو ہمیں رستے سے ملی تھی، کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مقبول بٹ نے آہستہ آہستہ اپنی گفتگو جاری رکھی:

”اے نہ چھیڑنا ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ہمیں نہ چھیڑے“

اگرچہ اس وقت نیند کی وجہ سے ہماری آنکھیں بوجھل تھیں مگر شیر کو سامنے پا کر آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ آسمان پر چاندنے روشنی بکھیر کھی تھی اور دور دوڑ تک ہمیں ہر چیز چلتی پھرتی نظر آ رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد شیر اٹھا اور ہمیں ایک نظر دیکھنے کے بعد نالے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم نے اسے پلٹتے ہوئے غور سے دیکھا تھا اس کا رنگ سرخ تھا اور چھاتی پر بہت زیادہ بال تھے۔ بعد میں میں نے کراچی کے چڑیا گھر میں بھی ویسا ہی شیر دیکھا تھا اور مجھے اچانک محسوس ہوا تھا کہ اب یہ ہماری طرح جکڑا ہوا ہے مگر میں نے بھی اسے تھوڑی دیر دیکھتے رہنے کے بعد گھر کی راہ لی تھی۔ شیر کے جانے کے بعد ہم کافی دیر تک ٹھہرے رہے اور اس بات کا یقین کرتے رہے کہ شیر اب دور نکل گیا ہو گا۔ شیر کے جانے کے بعد مقبول بٹ نے کہا.....

”اللہ کا نام لو! اور برف پر پھسلتے ہوئے چھلانگ لگاؤ، اگر قسمت میں زندگی لکھی ہے تو فتح

لکھیں گے، پھر اچانک رُکے اور بولے۔

”ٹھہرو پہلے میں پھسلتا ہوں بعد میں تم آنا۔“

مقبول بٹ برف پر پھسلتے تو برف کا ایک دھواں سا اٹھا اور چند لمحوں کے لیے وہ گم ہو گئے۔ نیچے ان کے ساتھ ساتھ برف کے گولوں کا ایک بادل سا اٹھا اور ہر چیز اپنی جگہ بیٹھ گئی، مگر مقبول بٹ نظر نہ آئے۔ ان کے بعد میں اُتر اجھے نیچے جاتے جاتے ایک طرف پہاڑ کے دامن میں ایک غار سانظر آیا اور میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں مقبول بٹ اسی طرف نہ لڑھک گئے ہوں۔ جب میں نیچے پہنچا تو خدا کے فضل سے مقبول بٹ وہاں صحیح سلامت تھے، انہوں نے مجھے فوراً پوچھا۔

”آپ کو کوئی چوت تو نہیں آئی۔“

میں نے کہا میں خیریت سے ہوں اب یاسین کی فکر ہے۔ چند لمحے اور گزرے تو یاسین بھی آگیا ہم تینوں پہاڑ سے سلامتی سے اتر آئے تو خوش تھے۔ مقبول بٹ کی تو یہ حالت تھی کہ اچانک ان کے منہ سے نکلا۔

”آج تو ہماری عیدِ رمضان ہے۔“

تحوڑی دیرستانے کے بعد ہم نے سامنے والے نالے کا رخ کیا۔ دو دن تک ہم اس نالے میں چھپے رہے۔ اگلی صبح کو ہم نے اللہ کا نام لیا اور میدانی علاقے کی طرف بڑھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک گاؤں دکھائی دیا۔ دور سے ایک آدمی کندھے پر رائفل اٹھائے چلا آرہا تھا۔ میرے پاؤں کے تلوے برف کی وجہ سے گل چکے تھے اور مجھے سخت درد محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ مقبول بٹ کی حالت بھی اچھی نہ تھی مگر وہ مجھے کندھے پر اٹھا کر نصف میل تک چلتے رہے۔ جب میں نے سخت سردی میں مقبول بٹ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے دیکھتے تو کہا۔

”مجھے یہیں چھوڑ جاؤ۔ آپ لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس وقت میرے ہاتھوں کا گوشت اتر رہا تھا۔ مقبول بٹ اور یاسین نے کندھے پر رائفل اٹھائے ہوئے شخص کو اپنے قریب آتے دیکھا تو بولے۔

اگر یہ شخص بھارت کا ہو اور اس نے رائفل سے ہمیں قابو میں لانے کی کوشش کی تو ہمیں اس کی رائفل سے اس کا کام تمام کرنا ہو گا۔ وہ شخص قریب آگیا۔ اس نے ملیشیا کپڑے پہن رکھتے تھے۔ مقبول

بٹ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

بھارت میں ملیشیا کے کپڑے نہیں پہنے جاتے یا آدمی یقیناً اپنا ہے۔

وہ اور قریب آیا تو احتیاطاً ہم نے اسے کپڑا لیا۔ مقبول بٹ نے اس سے رانفل چھین لی۔ جب اس نے ہمارے تیور دیکھتے تو رندھی آواز میں بولا.....

”مجھے کچھ نہ کہو۔ یہ درست ہے کہ بھارت نے اعلان کیا ہے کہ سرمی گنجیل سے دختر ہاک قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ میں تو آپ لوگوں کو دیکھ کر خوش ہو کر آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔“

مقبول بٹ نے اُس کا نام اور اتنہ پتہ پوچھا۔

”میں گنگلاں ضلع بارہ مولا (مقبوضہ کشمیر) کا رہنے والا ہوں، وہ گھبرائے ہوئے بولا.....

”میں آزاد کشمیر میں مہاجر ہوں۔“

ہمیں پہلی بار لفظ مہاجر سے آشنای ہوئی۔ اُس نے اپنا نام شاہ محمد بتایا اور کہا کہ اُس کا گھر نصف میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اب اُس نے سوال جواب کا سلسلہ شروع کیا اور ساتھ ساتھ مختلف طریقوں سے یقین دہانی کرنے لگا کہ وہ آزاد کشمیر کا باشندہ ہے اور یہ کہ ہم اب محفوظ علاقے میں ہیں۔ جب ہمیں اُس کی باتوں کا یقین ہو گیا تو ہم نے اُسے اپنا تعارف کرایا میرا نام اور مقبوضہ کشمیر میں میرے گھر کا اتنا پتہ من کرو وہ تڑپ اٹھا اور بھلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ہم سب گھبرا گئے۔ پھر وہ ڈرامائی انداز میں آگے بڑھا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

”میں آپ کا پھوپھی زاد بھائی ہوں، اس کی بیوی کو پتہ چلا تو وہ بھی دوڑی ہوئی آئی اور اپنے دکھ درد بیان کرنے لگی۔ مقبول بٹ نے دونوں کو حوصلہ دیا اور کہا کہ ”آپ اس وقت ہمارے دکھ کو سامنے رکھیں کوئی ڈاکٹر نہ دیک ہے تو ہمیں وہاں لے چلیں اگر ہمیں بروقت طبی امداد نہ ملی تو ہماری جان کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“

شاہ محمد بولا :

یہاں سے کچھ دور چناری میں ایک ہسپتال ہے۔ وہاں فوری طور پر جانا بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر نزدیک میں واقع ملٹری سیمپ والوں سے بات کی جائے تو ممکن ہے کہ وہ لوگ فرست ایڈ کا

کچھ اہتمام کریں۔ مقبول بٹ نے ان سے ملٹری کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ ”18 کے کے“ کی ایک چوکی نزدیک میں ہے۔ شاہ محمد نے ایک پڑوی کو ساتھ لیا اور چوکی پہنچ گئے اور گارڈ کمانڈر، لاکس نائیک اور تین سپاہیوں کے ہمراہ واپس پہنچے۔ انہوں نے ہمیں کندھے پر اٹھایا اور بمشکل پوسٹ تک پہنچایا۔ وہاں ہمارے تلوؤں کی مرہم پٹی کی گئی۔ کھانا وغیرہ فراہم کیا گیا۔ رات پوسٹ میں گزری۔ صبح گاؤں سے گھوڑے منگوائے گئے اور ہمیں چناری پہنچادیا گیا۔ صوبے دار راجہ زمرد نے ہمیں چناری میں بتایا کہ وہ ریڈ یوسری نگر سے ہمارے فرار کی اطلاع سن چکے ہیں اور ہمارے سلامتی کے ساتھ پاکستان پہنچنے پر خوش ہیں۔ ہمارے ساتھ باتیں کرتے کرتے انہوں نے پانڈو پہاڑ پر موجود اپنے اعلیٰ افسروں کو اطلاع دی چنانچہ وہ بھی پہنچ گئے۔ دوسرے دن مظفر آباد سے اس یونٹ کے دوسرے حکام پہنچے۔ کیمپ میں لکڑیوں کی بخاری سے ہمیں گرمی پہنچائی گئی۔ اس وقت ہماری حالت ناگفتہ تھی۔ جسم کے ہر حصے سے درد کی شیسیں اٹھ رہی تھیں اور اگرچہ پاکستان پہنچنے کے بعد ہمارے دل بہت خوش تھے مگر راستے کی مشکلات پر ہمارے جسم پر جبویتی تھی اس کا احساس اب ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہمیں بتایا گیا کہ ہم آزاد کشیری فوج کی نگرانی میں ہیں۔ دردوں سے نجات کے لیے ہمیں ایسی دوا پلانی گئی کہ ہم رات بھرا اور دن کے بارہ بجے تک بے ہوش رہے۔ اگلے روز میجر خٹک آئے اور مقبول بٹ سے پوچھا

”آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

مقبول بٹ کے اقرار پر وہ بولے۔

”آپ صورت حال لکھوائیں۔ اپنی سرگزشت بتائیں تاکہ مفصل ریکارڈ تیار کیا جاسکے۔“ اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو صورت حال یک دم تبدیل ہو گئی۔ ہمیں گاڑی میں بٹھایا گیا اور اب ہمارا رخ ”بلیک فورٹ کی طرف تھا“۔ بلیک فورٹ میں ہمیں علیحدہ علیحدہ بٹھادیا گیا۔ میں نے مقبول بٹ سے پوچھا؟

”یہ کیا بات ہے۔ یہاں بھی ہماری تفتیش شروع ہو گئی۔“ انھیں تفتیش کر لینے دو ہم سچے ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ان لوگوں کو تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ تفتیش ہوتی رہی تین ماہ تک ہم بلیک فورٹ میں رہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جنگ

بندی لائن کے اس طرف ہمارے پہلے میزبان اور میرے پھوپھی زاد بھائی، شاہ محمد کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے اور ان پر بھارت کے جاسوس ہونے کا شبہ ہے۔ ہم پر بھی یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ ہم بھارت کے جاسوس ہیں اور ہمیں ایک سازش کے تحت سری نگر جیل سے فرار کرایا گیا ہے۔ یہ باتیں سن کر ہماری آنکھوں کے سامنے اندر ہیرا چھا گیا۔

قلعہ کی بلند و بالا دیواروں کے پیچ میں خود کو پہلی بار تہا محسوس کرنے لگا تھا۔ ماسٹر مقبول دوسری بار قلعہ میں آئے تھے اور اس بار ہمارے عظیم ساتھی مقبول بٹ کو باعزت رہا کر کے ان کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی تھی مجھ سے اس موقع پر سوال کیا گیا تھا۔

”آپ کا یہاں کوئی رشتہ دار ہے، کوئی گھر ہے؟“

”نہیں..... نہ ہی میرا کوئی گھر ہے اور نہ ہی بھائی“۔

میں نے آہنگ سے جواب دیا تھا۔

”میں تو صرف مقبول بٹ کو جانتا تھا جسے اب آپ لوگوں نے مجھ سے جدا کر دیا ہے۔“

مقبول بٹ نے مجھے حوصلہ دیا اور ہمیشہ تعاون کرنے والی نگاہوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے چلا گیا۔ مجھے اور یاسین کو سول جیل مظفر آباد میں منتقل کر دیا گیا۔ ان دنوں میری حالت دیدنی تھی۔ مقبوضہ کشمیر میں بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔ حریت پسندوں کے ساتھ رہتے رہتے اور سختیاں برداشت کرتے کرتے میری صحت بڑی طرح گرچکی تھی۔ پھر سری نگر جیل سے فرار کے بعد برفانی راستوں سے گزرتے ہوئے پاؤں بہت زیادہ زخمی ہو کر ایک حد تک بیکار ہو گئے تھے۔ جب ہمیں مظفر آباد جیل میں پہنچا یا گیا اور میں گاڑی سے اتر اتو جیل سپر نئنڈنٹ بھی میری حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ مجھ سے صحیح طرح سے چلانہ اور میں گاڑی سے بعد میں معلوم ہوا کہ سپر نئنڈنٹ آزاد کشمیر میں آنے سے پہلے سری نگر میں رہتا تھا اور اسے جاتا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ سپر نئنڈنٹ آزاد کشمیر میں آنے سے پہلے سری نگر میں رہتا تھا اور اسے مجھ سے ایک گونہ تعلق خاطر قائم ہو گیا تھا۔ جیل میں مجھے یہ تاثر ملا کہ مجھے اس کی نگرانی میں اس مقصد کے لیے دیا گیا ہے کہ وہ میرے بیانات کی چھان بین کرے اور میری نگرانی کرے۔ پہلے توجیل سپر نئنڈنٹ کا رو یہ اچھا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کے تیور بدلتے گئے۔ ہم لوگ چاول کھانے کے عادی تھے۔ جیل میں قید یوں کو دال روٹی دی جاتی تھی۔ جب میں نے اپنا مسئلہ پیش کیا اور کہا کہ میں چاولوں کے بغیر کوئی

چیز نہیں کھا سکتا تو اس کا پارہ چڑھ گیا اور وہ ہمارے ساتھ بد تیزی پر اتر آیا۔ اس کی باتیں سن کر بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں سوپنے لگا.....

”یا الہی، ہم لوگوں نے کشیر کے لیے کتنی قربانی دی ہے اور یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

ہمارے مسلسل احتجاج پر اس نے قلعہ میں ٹیلی فون کیا وہاں سے آنا فانا سیکورٹی فورس ہمارے پاس پہنچ گئی۔ سیکورٹی آفیسر نے جیل سپرنڈنٹ سے پوچھا.....

”کیا معاملہ ہے؟ کیا بات ہوئی ہے؟“۔

”ان دونوں نے جیل سے بھاگنے کی دھمکی دی ہے؟“۔

”جیل سپرنڈنٹ نے اچانک ایک بڑا لازام ہمارے سرخونپتے ہوئے جواب دیا“

”کوئی نہیں بھاگتا“۔

سیکورٹی آفیسر نے جیل سپرنڈنٹ کو مجاہد کرتے ہوئے کہا کہ :

”ہم نے ان لوگوں کو اس لیے یہاں نہیں بھیجا کہ یہ مجرم ہیں بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ جب تک ان کے عزیز دوست یا ذمہ داری اٹھانے والے نہیں آتے اس وقت تک یہ قلعہ کی بجائے یہاں آرام سے رہیں“۔

پھر سیکورٹی آفیسر میری طرف متوجہ ہوا۔

”ہم آپ کو رہا کرتے ہیں مگر آپ جائیں گے کہاں؟“؟

”ہم مقبول بٹ کے پاس جائیں گے۔“

میں نے پہلی بار اس پرندے کی طرح اپنے جسم میں لہو کی گردش محسوس کی جسے طویل مدت کے بعد پنجرے سے رہائی ملنے والی ہو۔

”میں صرف اور صرف مقبول بٹ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں“۔

مجھے بتایا گیا کہ مقبول بٹ ایسٹ آباد میں ہیں اور اگر وہاں جانا ہے تو سرکاری طور پر ایک گاڑی کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔

اگلے روز مجھے ایک سرکاری گاڑی میں ایبٹ آباد پہنچا دیا گیا۔ وہاں مقبول بٹ سے ملاقات ہوئی۔ ہم چند دن ایبٹ آباد میں تھے۔ ایبٹ آباد میں پہنچنے کے وقت بھی میری حالت شیک نہیں تھی چنانچہ مقبول بٹ مجھے کریل رشید کے پاس لے گئے جوں۔ ایم۔ ایچ کے انچارج تھے۔ میرا تعارف ہوا اور پھر وہاں میرا علاج معا辘ہ شروع ہو گیا۔

مقبول بٹ کی رفیقتہ حیات وہیں بھائی کے پاس تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد میں مقبول بٹ اور ان کے بچے وہاں سے پشاور آگئے۔ پشاور میں ہم لوگ تقریباً ایک برس تھے۔ انھی دنوں میں ایک صحیح نکلا تو مقبول بٹ میرے پاس آیا۔

”تمہارا پاؤں زخمی ہے اور تم ایک بار پھر حریت پسندوں کی سرگرمیوں میں ان کا ساتھ دینے کے لیے خدکر رہے ہو۔ میرے خیال میں اپنا ارادہ ترک کر دو۔“

”دنیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میرا جواب تھا۔ مگر مقبول بٹ اپنی رائے پر قائم رہے اور تنظیمی امور میں ان کا ساتھ دینے کے لیے میں ان کے ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر نہ جاسکا۔

مقبول بٹ کے جانے کے بعد میں پشاور سے نیکلا آگیا اور وہاں پر ایک شنواری ہوٹل پر کام کرنے لگا۔ ہوٹل کے مالک کا نام محمد خان تھا۔ یہ پٹھان شخص تھا اور ہر معاملے میں خاصا اصول پسند واقع ہوا تھا۔ میں اس کے سادا سے ہوٹل پر کام کرتا اور سوچا کرتا تھا کہ :

”خان صاحب کو کیا علم کہ کون سا شخص اس کے ہوٹل پر ہر طرح کا کام کرتا ہے؟“

ان دنوں میری عجیب کیفیت تھی۔ تیز ہوا چلتی تو مجھے کالاناگ پہاڑ پر سرد ہوا کے جھونکے یاد آتے۔ قریبی درختوں پر پرندے چچھاتے تو مقبوضہ کشمیر میں واقع اپنے گھر کے صحن میں اگے ہوئے پودوں میں خوبصورت پرندوں کی چہک چونکا دیتی۔ ایسے ہی دن گزر رہے تھے کہ ایک دن اخبار والا اخبار پھینک کر گیا۔ سامنے کے صفحہ پر ایک طیارے کے تباہ شدہ ڈھانچے کی تصویر چھپی تھی۔ خبر کی تفصیل پڑھی تو پتہ چلا کہ کشمیری حریت پسندوں نے بھارت کا طیارہ انگو کیا تھا جسے لاہور ایسپورٹ پر جلا دیا گیا۔ اس طیارے کے ڈھانچے کے ساتھ ہی حریت پسند ہاشم اور اشرف کی تصاویر تھیں۔ دوسرے دن یہ معلوم ہوا کہ ان حریت پسندوں کے ساتھ ساتھ مقبول بٹ کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب نوائے وقت

میں میری دل چسپی بڑھتی گئی۔ ہوٹل کا مالک محمد خان اس بات پر بہت حیران تھا کہ اچانک اخبار میں میری دل چسپی اتنی کیوں بڑھ گئی ہے۔ میں اس کی حیرانگی کو محسوں کرتا مگر خاموش رہتا۔ چند دن اور گزرے تو ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ مقبول بٹ اور جہاز انگواء کرنے والے کشمیری حریت پسند بھارت کے جاسوس تھے۔ یہ پڑھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میں دل میں بڑھ رہا۔ میں نے مقبول بٹ کے ساتھ ایک وقت گزارا تھا۔ امر چند کے قتل سے لے کر پھانسی کی سزا اپانے تک اور پھر سری نگر جیل سے فرار اور آزاد کشمیر پہنچنے تک قدم قدم پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ میں نے ہر وقت ہر لمحہ انھیں ایک تجھے مسلمان اور وفادار کشمیری کے روپ میں دیکھا تھا۔ میں نے مقبوضہ کشمیر کا باشندہ ہونے کے باوجود مقبول بٹ پر اندر ہادھنا دعتماً دکیا تھا موت کے منہ میں جاتے جاتے اکٹھے زندگی کے میدان میں دوبارہ آئے تھے۔

مجھے خبر پر یقین نہ آیا۔ دوسرے روز پھر پڑھا، درحقیقت انکو اُری کرنے والوں نے ابتدا میں انھیں جاسوس ہی قرار دے دیا تھا، میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ادھر پولیس نے مقبول بٹ سے میرے متعلق پوچھ گئے کی پہلے تو انہوں نے نال مٹول سے کام لیا مگر پھر شاید سوچ کر میرے بارے میں بتا دیا کہ ایک بار پھر تلخ راستوں پر رفاقت ہو جائے۔ میں نے ان دنوں نیکسلا کے ایک ہوٹل پر کھانا پکانے کا کام شروع کر رکھا تھا۔ میری گرفتاری سے پہلے ہمارے ساتھی یا سین کو گرفتار کر لیا گیا تھا چنانچہ جب پولیس کی گاڑی مجھے گرفتار کرنے آئی تو یا سین میری شاخت کے لیے گاڑی میں موجود تھا۔ ہوٹل پر پہنچتے ہی پولیس انپکڑنے (جس کے منہ پر چیپک کے داغ تھے) مجھے گھورتے ہوئے گونج دار لجھے میں سوال کیا۔

”تمہارے کاغذات کہاں ہیں؟“

”اس کے کاغذات کہاں ہوں گے؟“ ہوٹل کے مالک نے اس اچانک چھاپے پر اور پولیس کے لجھے سے خوف زد ہو کر کہا.....

”یہ بے چارہ تورات دن بھیں رہتا ہے، کپڑوں کا جوڑا پرانا ساجوتا۔ اس کی کل کائنات ہے“

اس اپیل کا الٹا اثر ہوا اور مجھے چھوڑنے کی بجائے ہوٹل کے مالک محمد خان پٹھان کو بھی گرفتار کر کے گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اب ہم تینوں گاڑی کے اندر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ یا میں میری آنکھوں میں اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتا مگر نہ جانے کیوں آنکھوں نے رم جنم برنسے سے انکار کر دیا تھا۔

ہمیں سری نگر جیل کے اس سوراخ کی یاد آرہی تھی جس سے پہلے میں پھر یا میں اور پھر مقبول بٹ نکلے تھے اور ہم دونوں نے انھیں کھینچ کر کیل کی مدد سے بنائے گئے اس سوراخ سے باہر نکلا تھا۔ ہم نے قدم قدم پر موت کو اپنا ہم رکاب دیکھا تھا اور پھر سرحد کے اس پار پہنچ کر پہلی بار کھل کر سانس لیا تھا اب ہم ایک بار پھر سے ہتھکڑیوں میں بندھے تھے۔ جیپ میں بٹھانے کے بعد ہمیں اسلام آباد لایا گیا وہاں مقبول بٹ تو نہیں تھے مگر ہمارے ساتھی ڈاکٹر فاروق حیدر، بزرگ غلام محمد اور دوسرے نوجوان موجود تھے۔ سب کو ہدایت کی گئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے۔ میرے ہوٹل کے مالک محمد خان پٹھان کو تین دن کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اس نے جاتے جاتے مجھے 300 روپے دیے اور میرے کندھے پر ہاتھ درکھ کر کہا۔

”میرا حمد فکر نہ کرو یہ پیسے زیادہ نہیں ہیں لیکن مصیبت میں کام آئیں گے۔“

مجھے محمد خان کے ہاتھ نہ جانے کیوں اتنے بھاری لگے۔ احسان کا بوجھ جو میں کبھی نہ اتنا سکتا تھا جاتے وقت اس کی آنکھیں اندھیری رات کے ٹھنڈاتے چراغوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ اسلام آباد میں ایس پی ملک صدیق ڈوگر اور انپکٹر عبدالرحمان (جن کا تعلق ایک اطلاع کے مطابق لاہور سے تھا) کو ہماری تفتیش پر مأمور کیا گیا۔ میں انھیں خدا کو حاضر ناظر جان کر حقیقت حال بتاتا تھا اور یہ لوگ ہمارے ساتھ اور ہی طرح کا سلوک کرتے تھے۔ آخر کار ہمیں مزید تفتیش کے لیے شاہی قلعہ میں منتقل کر دیا گیا۔

شاہی قلعہ میں مقبول بٹ کو پہلے ہی لا یا جا چکا تھا۔ اگرچہ شاہی قلعہ کے بارے میں، میں نے منتظری مدت میں بہت کچھ سن لیا تھا مگر جب مقبول بٹ پر نظر پڑی تو آدھا غم دور ہو گیا۔ میں نے انھیں

دیکھتے ہی گفتگو کرنا چاہی مگر مجھے پولیس کے سپاہیوں نے فوراً ٹوک دیا میں سوچ رہا تھا.....

ع یا الہی ما جرا کیا ہے۔

ہماری موجودگی میں ہماری نگرانی کرنے والے عملے کوختی سے ہدایت کی گئی کہ.....

”انھیں آپس میں بات چیت نہ کرنے دی جائے ایک دوسرے سے ڈور کھا جائے۔“

ہم تین دن تک شاہی قلعہ کے مہمان رہے۔ بیکنی خان کا دور حکومت تھا۔ شاہی قلعہ کے بارے میں جو کچھ سنتا تھا اُس سے زیادہ کاماننا کرنا پڑا..... گرمی کے دن تھے اور کال کوٹھڑیوں میں رات دن بسر کرنا پڑے۔ اب اگرچہ اس بات کو بھی اب بڑا عرصہ بیت گیا ہے مگر میں پھر بھی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا مختصر ایہی کہوں گا کہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جس کا تذکرہ سنتا تھا۔ تین دن کے بعد مقبول بٹ کو تو شاہی قلعہ میں رہنے دیا گیا مگر مجھے ڈیرہ غازی خان کی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جیل میں مجھے ایک مہینہ مختلف انداز کی تفتیش کاماننا کرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے ایک مہینہ گزرا اور مجھے رجحان ضلع ڈیرہ غازی خان لے جایا گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم مقبولہ کشمیر سری نگر کی جیل سے فرار ہو کر سرحد کے اس پار آ رہے تھے تو میں یہ سوچ کر غم بھلا دیتا تھا کہ اب آرام سے پاکستان کا طول و عرض دیکھوں گا لیکن یہاں مجھے اور ہی طرح سے پاکستان کے مختلف شہروں میں لے جایا جا رہا تھا۔ رجحان میں تھا نے دار عاشق حسین بھٹی کی نگرانی میں مجھے رکھا گیا۔ شاہی قلعہ سے تفتیشی پارٹی ہر ہفتے وہاں جاتی تھی اور مجھ پر بے طرح تشدید ڈھاتی تھی۔ مجھے کہا جاتا تھا کہ مقبول بٹ نے جو بیان دیا ہے وہ میں بھی دوں۔“

مجھے یقین تھا کہ یہ محض پولیس کے حرбے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہم لوگ آئینے کی طرح صاف تھے۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ مقبول بٹ پر جتنا تشدید کیا جائے اسے جو سزا بھی دی جائے وہ محض تشدید یا سزا کے خوف سے جھوٹ نہیں بولے گا اور نہ ہی پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دے گا۔ تین ماں تک ”رجحان“ میں رکھنے کے بعد ایک دن میں نے پولیس کے سپاہیوں سے سنا کہ اگلے دن مجھے لاہور ہائی کورٹ میں پیش کیا جانا چاہیے، مجھے کہا گیا کہ :

”تم پر کیس چل رہا ہے یہ بہت خطرناک کیس ہے، ہم جو کچھ تحسین کہیں گے اس کے مطابق

ہائی کورٹ میں بیان دینا اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر اسی طرح کی تفتیش کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے گا جس طرح کی تفتیش پہلے ہو رہی ہے۔

ایک لمحہ کے لیے تو مجھے ذریگاً مگر پھر مقبول بٹ کا جملہ یاد آیا :

”خود کو سزا سے بچانے کے لیے بلا وجہ جب بھی جھوٹ بولو گے پہلے سے زیادہ پھنس جاؤ

گے۔“

میں نے خاموشی اختیار کر لی اس وقت اس علاقے کے ڈی۔ آئی۔ جی ملک صدیق اکبر (جو میری اطلاع کے مطابق سابق ایس پی ائیلی جنس بھی تھے) نے بھی مجھے ”سمجنے“ کی کوشش جاری رکھی.....

ایک دن میں اسی شش و پنج میں گزر گیا جب مجھے لاہور ہائی کورٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ اب ایک نیا امتحان میرا منتظر کر رہا ہے کس طرح کا بیان دیا جائے؟۔

(نوابِ وقت جمعہ میگزین 9 مارچ 1984)



یادوں کے روشن چراغ

ماسٹر محمد مقبول (ڈگی محلہ ایبٹ آباد)

مقبول بٹ کے والد غلام قادر بٹ ایک محنت پیشہ آدمی تھے۔ وہ کپڑے سلائی کرنے کا کام کرتے تھے۔ رعب دار آدمی تھے۔ سلبھی اور نپی تلی بات کرتے تھے۔ معاشرے کے اچھے اور باکردار لوگوں سے اُن کے مراسم تھے۔ دستر خوان کے بڑے سخنی تھے۔ میں کبھی کبھار تریہ گام جاتا تو ان کے پاس ایک وقت کا کھانا ضرور کھاتا۔ اگرچہ سنجیدہ طبیعت تھے۔ لیکن کبھی کبھی مزاح کی باتیں بھی کرتے۔ چھوٹے بچوں سے وہ نہایت شفقت سے پیش آتے۔ انہوں نے داڑھی نہیں رکھی ہوئی تھی۔

غلام قادر بٹ کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز بٹ تھے۔ یہ بھی پیشے کے لحاظ سے درزی تھے اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹی سی دکان پر کام کرتے تھے۔ یہ بڑے ہنس مکھ تھے اور بات چیت میں جا بجا کھاوتیں اور ضرب الامثال پیش کرتے۔ ہم لوگ انہیں چاچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان کے بتائے ہوئے لطائف اور کھاوتیں اب بھی زبانِ زد عالم ہیں۔ وہ کہتے،

"گوجر لوگ بہکوں پر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے پیر صاحب انہیں ملنے بہکوں پر چلے گئے۔ تو انہوں نے مریدوں کو ہدایت کی کہ رمضان آنے والا ہے۔ اس کی آپ نے خوب خاطر کرنی ہے۔ (یعنی روزے رکھنے ہیں) اس بہک والوں کا ایک کٹا تھا۔ جس کا نام انہوں نے رمضان رکھا ہوا تھا۔ جب پیر صاحب چلے گئے تو وہ کٹا ادھر آنکلا تو گجروں نے کہا دیکھو پیر صاحب کی بات درست ثابت ہوئی ہے۔ آواب اس کی خاطر کریں۔ چنانچہ سب ڈنڈے لے کر دوڑے اور کئے کو مار کر ہلاک کر دیا"

وہ بتاتے کہ "ہندو اڑہ کے کسی آدمی سے اُن کا ایک آدمی بیل خرید کر شہر لے آیا۔ اب اس علاقے کے جو لوگ بھی شہر میں پیشی بھکتنے کے لیے آتے۔ وہ سیدھا اس کے گھر پہنچتے اور کہتے ہم ہندو اڑہ

سے آئے ہیں۔ ہمارے رشتہ دار سے آپ نے بیل خریدا تھا۔ (گویا وہ اپنی رشتہ داری جاتے)۔ ایسے رشتہ دار بننے والوں کی لاائیں لگی رہتی۔ وہ بے چارہ ان کی مہمان داری کر کر کے ٹنگ آگیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس سے تو بہتر ہے کہ بیل کو ذبح کر کے ان رشتہ داروں سے دامن چھڑایا جائے۔ چنانچہ اس نے وہ بیل ذبح کر دیا۔ اب جب ہندو اڑاڑ کے وہ رشتہ دار آئے اور بیل کی خریداری کا حوالہ دے کر ایک دن کے لیے گھر ٹھہرانے کی خواہش ظاہر کی تو صاحبِ خانہ نے بتایا کہ بیل تواب اس نے ذبح کر دیا ہے۔ اب رشتہ داری کیسی؟ یہ سن کر بیل فروخت کرنے والوں کو بہت افسوس ہوا کہ ان کی رشتہ داری اب ٹوٹ گئی۔

وہ بات بات پر کہا تو میں اور چنکلے سناتے۔ خود بھی ہنتے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ وہ مہمان نواز تھے اور رشتہ داروں سے بڑے رکھ رکھاؤ سے پیش آتے۔

میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ مقبول بٹ کو اپنے ساتھ لے کر آنے کا پس منظر کیا تھا تو بتانے لگے کہ میرے بڑے بھائی صاحب کی ہدایت تھی کہ میں مقبول بٹ کو اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں اور اس کی اچھی تعلیم و تربیت کا بندوبست کروں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ ہمارے خاندان کا نام روشن کرے۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا اور دیگر بچوں کا پیٹ پال لوں گا۔

سینٹ جوزف کالج کے زمانے میں فادر شنکس نے مقبول بٹ کی شخصیت اور قابلیت سے متأثر ہو کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ نوجوان بڑا ہو کر کسی بڑے منصب پر فائز ہو گا یا پھر موت کے گھاث اتار دیا جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے لوگ یا تو دنیاوی اعتبار سے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہیں یا زمانے کے ستم کا شکار ہو کر تاریخ میں امر ہو جاتے ہیں۔ مقبول بٹ کے تحریکی اور انقلابی ذہن کو دیکھتے ہوئے اس نے یہ پیش گوئی کی تھی۔

1958ء میں عبدالعزیز اپنے بھتیجے مقبول بٹ کو لے کر مظفر آباد آگئے۔ وہ چند روز کے لیے نلام بی میر گرد اور کے ہاں ٹھہرے۔ میر صاحب نے انہیں رقدارے کر میرے پاس ابیٹ آباد بھیج دیا۔ یہاں سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے سچی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور اسلامی فکر سے متاثر نظر آتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ان کے

لیے حالات ساز گارنے تھے۔ اس لیے وہ یہاں آگئے ہیں۔ وہ ایم اے انگلش میں داخلہ لینے کے لیے لاہور چلے گئے۔ لیکن کسی وجہ سے وہاں داخلہ نہ مل سکا تو واپس ایبٹ آباد آگئے۔ پھر یہاں سے دونوں چچا بھتیجا نے پروگرام بنایا تو وہ پشاور چلے گئے۔ پشاور یونیورسٹی میں انہیں ایم اے انگلش میں داخلہ مل گیا۔ گزر اوقات اور اپنے شوق کی آبیاری کے لیے وہ اجمل خٹک کے اخبار "شہباز" میں شام کے اوقات میں کام کرنے لگے۔ بعد ازاں وہ روزنامہ "انجام" سے بھی وابستہ رہے۔ دوران تعلیم وہ پشاور سے ہمارے ہاں آتے اور کبھی کبھار میں بھی ان کے ہاں چلا جاتا۔ انہیں جماعت اسلامی آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے مولوی فتح محمد صاحب کی وساطت سے گھنٹہ گھر کے سامنے ایک مکان نمبر 2508-K رہائش کے لیے مل گیا۔ یہ مکان متعدد املاک میں شامل تھا۔ اس مکان میں قبل ازیں کوئی اور آدمی رہ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے یہاں بٹ صاحب اور ان کے چچا کو نظہر ادا دیا۔ عبدالعزیز کسی ہوزری فیکٹری میں کام کرنے لگ گئے۔ کار میگر تو وہ پہلے ہی تھے۔ چچا بھتیجا اپنا کھانا پکانا خود کرتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد عبدالعزیز جنگ بندی لائن عبور کر کے واپس کشمیر چلے گئے۔ وہاں سے وہ اپنی بیوی حاجہ، بیٹے رفیق (یہ پہلی بیوی سے تھا) اور چھ ماہ کی شیر خوار بیٹی حمیدہ کو ہمراہ لائے۔ وو دیگر عزیزات راجہ بیگم اور زیبا کو بھی لے آئے۔ راجہ بیگم کے بھائی عطاء محمد بٹ اور محمد سجاد بٹ قبل ازیں بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے کراچی آگئے تھے۔ زیبا عطاء محمد کی بیوی تھی۔

ان مہاجرین نے تقریباً دو ماہ تک میرے گھر ایبٹ آباد قیام کیا۔ اس عرصے میں مقبول بٹ بھی پشاور سے آتے رہتے۔ یہاں سے راجہ اور زیبا کراچی چلی گئیں۔ جبکہ عزیز بٹ، ان کی بیوی، بیٹا اور بھی پشاور چلے گئے۔

غالباً اگست 1960 میں راجہ بیگم کی شادی مقبول بٹ سے قرار پائی۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ اور روزنامہ انجام میں فل نام سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شادی نہایت سادہ انداز میں ہوئی۔ ہم صرف چند لوگ یہاں سے بارات کی صورت میں کراچی گئے۔ اگلے سال یعنی 1961 میں ابھی جاوید کی پیدائش نہیں ہوئی تھی کہ بٹ صاحب نے اچانک دوسرا شادی کر لی۔ مجھے

یوسف علی شائق کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ ملا جس پر صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ کی ہمشیرہ راجہ بیگم آپ کو بمار ہی ہے۔ پوسٹ کارڈ کے پتا لکھنے والی جگہ پر اس نے سفید کاغذ کی پٹی چسپاں کر کے اس پر پتا لکھا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی بھاگم بھاگ پشاور پہنچے اور سیدھا پیر صاحب یوسف علی شائق کے ہاں گئے۔ کہنے لگے ”پتا ہے میں نے آپ کو کیوں بلا�ا ہے“۔ میں نے کہا ”نہیں ہمیں تو علم نہیں“۔ فرمائے گے آپ کی بہن کو ”تاکی“ لگ گئی ہے یعنی آپ کے بہنوئی نے دوسری شادی کر لی ہے۔
یوڑ پیٹھ ناچ لگی۔

ہم یہ سن کر بڑے پریشان ہوئے۔ بازار کالا سے سیدھا گھنٹہ گھربٹ صاحب کے ہاں پہنچے۔ بٹ صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ ہمشیرہ سے ماجرہ پوچھا تو بتانے لگیں وہ ایک روز دفتر سے آئے کوٹ اتار اتو میں نے اٹھا کر ہنگر میں لگایا۔ ہنگر سے لگاتے ہوئے مجھے کاغذ کی عجیب سی آواز آئی۔ میں نے دیکھا تو اندر والی جیب سے آواز آئی ہے۔ دیکھا تو یہ نکاح نامہ تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایک دن ان کی انگلی پرسونے کی انگوٹھی دیکھی تھی۔ پوچھا کہاں سے آئی ہے تو کہنے لگے آپ کے بھائیوں نے تو نہیں پہنانی تھی یہ ایک دوست کی شادی تھی، اس نے مجھے پہنانی ہے۔
نکاح نامہ دیکھ کر راجہ بیگم سیدھا پیر صاحب کے پاس گئی۔ چنانچہ پیر صاحب نے مجھے پوسٹ کارڈ لکھ کر بلوایا۔

راجہ بیگم نے نکاح نامہ دیکھ کر پوچھا یہ کیا معاملہ ہے تو انہوں نے اس کے ہاتھ سے نکاح نامہ چھین لیا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان تلنگ بھی ہوئی۔ بٹ صاحب نے کہا ”ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دینا تھا، یہ میری مجبوری تھی“

ان دونوں ایوب خان نے نئے عائلی قوانین متعارف کروائے تھے۔ میں راجہ بیگم سے ملاقات کر کے سیدھا قصہ خوانی بازار گیا اور ان قوانین کا کتابچہ خرید لایا۔ ان قوانین میں لکھا تھا کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی۔ ورنہ سزا ہو سکتی ہے۔ میں نے اس شق کو سرخ سیاہی سے انڈر لائی کیا اور بٹ صاحب کی میز پر رکھ دیا تاکہ رات کو دو دیر سے آئیں تو خود دیکھ لیں۔

ہم نے اظہارِ بڑھی کے طور پر ان کے ہاں کھانا پینا ترک کر دیا۔ لیکن وہ مجھ سے بال مشافہ بات چیت کرنے سے بچتے رہے اور رات گزر گئی، بات چیت کی نوبت نہ آئی۔ اگلی صبح میں انھا اور ناشنہ کے بغیر ہی ایک کشیری مہاجر عطاء اللہ خان کے گھر اس مقصد کے لیے چلا گیا کہ اس کے بیٹے کو بڑھا صاحب کی نئی بیوی یعنی ذاکرہ کا باپ مولوی عبدالشکور پڑھاتا تھا۔ وہ ٹھیکر تھا۔ میں نے عطاء اللہ کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو اس نے مولوی عبدالشکور کو بلا یا اور اس کو صورتی حال سے آگاہ کیا۔ مولوی عبدالشکور نے کہا کہ ہمیں قطعاً کوئی علم نہیں کہ اس کی پہلی بیوی بھی ہے۔ عبدالشکور نے آمادگی ظاہر کی کہ اگر واقعی ایسی بات ہے تو میں اپنی بیٹی کی طلاق لے لوں گا۔ اس کے بعد ہم دونوں میاں بیوی ذاکرہ سے ملاقات کرنے گوں کھڑی گئے، جہاں ذاکرہ ایک سکول میں ٹھیکر تھی۔ ہم ذاکرہ سے ملے اور میں نے اسے بتایا کہ میں مقبول بٹ کی پہلی بیوی کا بھائی ہوں۔ ہم آپ کے والد سے مل کر آ رہے ہیں۔ وہ آپ کی طلاق لینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا آپ مقبول بٹ سے بات کر لیں اور اگر وہ خود اپنی زبان سے مجھے طلاق دے دیں تو میں راضی ہوں۔ اس نے کہا جائیں انہیں میرے پاس لے آئیں۔ ہم خوش ہو گئے ہم نے سمجھا کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم گھر گئے۔ ذاکرہ کو صورت حال بتائی۔ اس نے اپنے خاوند سے بات کی تو مقبول بٹ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر میں ذاکرہ کو اپنی مرضی سے چھوڑوں گا تو مجھے بطور حق مہرا سے دس ہزار روپے ادا کرنا پڑیں گے۔ اتنی رقم میں کہاں سے لاوں۔ راجہ نے یہ بات ہمیں بتائی تو میں نے اسے کہا کہ مقبول بٹ کو کہیں طلاق دے دے۔ اس رقم کا بندوبست میں خود کروں گا۔

اس دوران بٹ صاحب نے یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ انھوں نے راجہ بیگم کو اس بات پر قائل کر لیا کہ اگر ماشر صاحب اس معاملے سے پیچھے ہٹ جائیں تو میں کچھ عرصہ بعد ذاکرہ کو رضامند کر کے علیحدگی اختیار کرلوں گا۔ راجہ بیگم نے یہ موقف مجھ تک پہنچایا اور میں نے اس کے بد لے ہوئے تیر دیکھتے تو مجھے غصہ آگیا اور میں راجہ سے الجھ پڑا۔

اُدھر ذاکرہ نے مقبول بٹ کو بلا کر صورت حال پر بات کی توبت صاحب نے اسے کہا "تم اپنے کام سے کام رکھو میں اپنا کام کرتا ہوں"

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد جاوید کی پیدائش ہوئی۔ شروع میں ذاکرہ اپنے ماں باپ کے ہاں ہی رہتی تھی۔ لیکن جب اس کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تو بٹ صاحب اسے اپنے گھر لے آئے۔ اب دونوں بیویاں گھنٹہ گھروالے مکان میں قیام پذیر ہو گئیں۔ ایک کمرے میں ایک، دوسراے کمرے میں دوسرا۔ یہ سہہ منزلہ مکان تھا۔ گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ اوپر والی دو منزلیں خستہ حالت میں تھیں۔ پہلی منزل کے کروں میں ایک کمرہ مہمان خانے یا ڈرائینگ روم کے طور پر مشترکہ استعمال ہوتا تھا۔ جس میں ایک چار پائی، تین ٹوٹی ہوئی کرسیاں، ایک پرانا سا صوفہ اور ایک چھوٹا سا میز رکھا تھا۔ ایک شکستہ الماری میں کچھ کتابیں اور اخبارات رکھے تھے۔ باقی دو کروں میں عبدالعزیز اور ان کے بیوی بچے رہتے تھے۔ جبکہ بقیہ دو کروں میں بٹ صاحب اور ان کی بیویاں قیام پذیر تھیں۔

مقبول بٹ کے۔ اپنے خورشید کے دور میں بی ڈی ممبر منتخب ہوئے۔ بعد ازاں اسٹیٹ کونسل کے انتخابات میں جی ایم لوں کی حمایت کی۔

1961 میں آزاد کشمیر میں اسٹیٹ کمشنر کے لیے امتحان میں پاس ہو گئے۔ لیکن ملازمت اختیار نہ کی۔ بعد ازاں پاکستان ائیر فورس کے لیے تحریری امتحان بھی پاس کر لیا۔ انہوں نے پاکستانی شہری ہونے کا ثبوت مانگا تو ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا۔ وزارتِ داخلہ سے سر ٹیفکیٹ لینا پڑتا تھا۔

1965 میں محاذ رائے شماری کا قیام عمل میں آیا تو انہوں نے سوچیت گڑھ کے محاذ پر کھڑے ہو کر خاک وطن کی مٹی کو اپنے ہاتھ میں تھام کر دیگر ساتھیوں کے ہمراہ یہ عہد کیا کہ وہ ضرورت پڑنے پر اس دھرتی کی عزت و آزادی کے لیے جان کی قربانی دینے سے بھی دربغ نہیں کریں گے۔ وہ محاذ کے عسکری ونگ NLF کے انچارج تھے۔

1966 میں کشمیر جانے کی تیاریاں وہ مجھ سے خفیہ خفیہ کرتے رہے۔ مجھے اس سرگرمی کا کوئی علم نہ تھا۔ ان دنوں وہ میرے پاس ایبٹ آباد آئے اور کہنے لگے پشاور سے میرا تباولہ اپنے اخبار کے کراچی والے دفتر میں ہو گیا ہے۔ ان کے پاس ایک سفری سوت کیس تھا۔ مجھے کہنے لگے کہ کراچی کے حالات صحیح نہیں ہیں۔ سوچ بچار کر کے مشورہ کرنے آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے باہر کے ایک ملک

کے سفارتخانے میں اچھی ملازمت مل رہی ہے۔ لیکن بچوں کا مسئلہ آڑے آرہا ہے۔ میں نے کہا کہ بچوں کے بارے میں فکر مند نہ ہوں، اللہ نگہبان ہے۔ میں اپنے تینیں ان کی پوری دیکھ بھال کروں گا۔ آپ اپنا معاملہ ٹھیک کریں۔

چند روز میرے پاس ٹھہرنے کے بعد وہ واپس پشاور چلے گئے۔ پشاور سے کچھ روز بعد وہ پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "میں باہر جانے کی کوشش میں ہوں، امید ہے کامیاب ہو جاؤں گا" دورہ ٹھہر نے کے بعد کہیں چلے گئے۔ چار پانچ ہفتے گزرے تو میں ان کے بچوں سے ملنے پشاور چلا گیا۔ بٹ صاحب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ دو ماہ سے ان کا کوئی اتنا پتا نہیں ہے۔ البتہ دوسرو پہ منی آرڈر آتا ہے۔ جس پر صحیخے والے کا کوئی واضح پتہ درج نہیں ہوتا۔ میں اب ان کی نوہ میں لگ گیا۔ غلام نبی پنڈت اور علی محمد کنوں کی زبانی معلوم ہوا کہ حکومت نے فوجی آفیسروں کو کشمیری زبان سکھانے کے لیے کچھ انشریکٹرز بھرتی کئے ہیں۔ جو کہ خفیہ مقام پر انہیں یہ زبان سکھاتے ہیں اور ان کے گھروالوں کو اسی طرح نامعلوم پتے سے منی آرڈر کی رقم ملتی ہے۔ انہوں نے اس طرح ایک انپکٹر مہدی کا حوالہ دیا جو مظفر آباد کاربنے والا تھا اور اس کے گھر منی آرڈر آتا تھا۔ میں نے یہ سن کر یقین کر لیا کہ مقبول بٹ کو بھی کہیں کشمیری زبان سکھانے پر مأمور کیا گیا ہو گا۔

میں نے کہا جی امان اللہ خان کو جیبیہ نائٹ کالج کے ایڈریس پر خط لکھ کر دریافت کیا اور بٹ صاحب کے بچوں کی پریشانی کے بارے بتایا۔ تو انہوں نے خط لکھا کہ "گھرانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اخبار والی ملازمت چھوڑ دی ہے اور انہیں کافی کوشش کے باوجود کوئی مناسب ملازمت نہیں تسلی تو مجبوراً انہوں نے سندھ کے کسی دور دراز علاقے میں ایک تیل کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔ جہاں سے جلد آنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ وہ خیریت سے ہیں۔ کبھی کبھی اس علاقے سے کوئی آدمی آتا ہے تو وہ ان کی خیریت کی اطلاع دیتا ہے۔ آپ ان کے بچوں کا خیال رکھیں اور انہیں تسلی دیتے رہیں۔ وہ اتنے دور علاقے میں تعینات ہیں کہ وہاں خط کا پہنچنا بھی ناممکن ہے۔"

میں نے سوچا پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔ واقعی کوئی ایسا علاقہ ہو گا جہاں رابطہ ممکن نہ ہو۔

راجہ بیگم ابیث آباد ہمارے پاس آئی۔ اسے بھی کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اپنی بیوی اور بٹ صاحب کی بیوی کو ساتھ لیا اور مظفر آباد آگئے۔ ہمیں سیٹھی باغ میں غلام نبی میر صاحب کے ہاں جانا تھا۔ ہم لوگ مظفر آباد اڈھکی کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہے تھے کہ یہاں جی۔ ایم۔ مفتی صاحب سے ہماری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے مجھ سے بٹ صاحب کی بابت پوچھا تو میں نے کہا سنائے ہے وہ سندھ میں کسی تیل کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ جی۔ ایم۔ مفتی کہنے لگے وہ ماہر صاحب آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ تو بھارتی مقبوضہ کشمیر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کسی اخبار کا حوالہ دیا۔ یہ سن کر میرے پاؤں سے زمین نکل گئی۔ میں مشکل سے چل کر ان کے گھر تک گیا۔ انہوں نے مجھے وہ اخبار ہکھایا جس میں کوتیل کے مقام پر ان کی گرفتاری کی روایت دشائع ہوئی تھی۔ مفتی صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آج ہی ان کے بیوی بچوں کو لے کر واپس ابیث آباد چلا جاؤں۔ کیونکہ یہ خبر یہاں مظفر آباد میں ان کے لیے زیادہ پریشانی کا باعث بنے گی۔ چنانچہ میں وہیں سے بچوں کو لے کر اٹھ پاؤں مڑا۔ راجہ بیگم نے سبب پوچھا تو میں نے بتایا کہ ابیث آباد میں کوئی ضروری مسئلہ ہے لہذا ہمیں اسی وقت واپس جانا ہے۔ ہم واپس گھر پہنچنے تو یہاں دوست احباب واقعہ کی تفصیلات معلوم کرنے کی غرض سے آنا شروع ہو گئے۔ خواتین بھی آنے لگیں تو ان کی بیوی کو بھی پتا چل گیا۔

بٹ صاحب بھارتی مقبوضہ کشمیر میں زیر حراست تھے۔ ہماری پریشانی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان کے بیوی بچے ابیث آباد میں میرے پاس ہی تھے۔ مظفر آباد میں حبیب اللہ میر صاحب کی طرف سے ایک تقریب میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی تو میں اپنے اور بٹ صاحب کے بیوی بچوں کو لے کر مظفر آباد کے لیے روانہ ہوا۔ عجیب اتفاق ہوا کہ ہم لوگ اڈے پر اتر کر حبیب اللہ میر کے گھر جا رہے تھے کہ راستے میں پھر جی۔ ایم۔ مفتی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ نادی بل کیس کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ مقبول بٹ اور میر احمد کو سزا موت سنائی گئی ہے جبکہ صوبیدار کالا خان کو عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔ میں نے خواتین اور بچوں سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ انھیں سیٹھی باغ حبیب اللہ میر صاحب کے یہاں بھیج دیا۔ جبکہ خود واقعہ کی تفصیلات جاننے کے لیے مفتی صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں ان کے پاس اخبارات دیکھے جن میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی۔ دوسرے

روز ہم واپس ایبٹ آباد آگئے۔ راجا بیگم کو بھی علم ہو گیا۔ ہمارے دن کا سکون اور رات کی نیند میں حرام ہو گئیں۔

1968 میں سولہ رمضان المبارک سحری کے بعد میں نماز فجر ادا کر رہا تھا۔ میری بیوی نے ریڈ یوسری نگر آن کیا تو یہ خبر نشر ہو رہی تھی کہ سری نگر سٹرل جیل سے سزاۓ موت کے تین قیدی جن کا نام محمد مقبول، محمد یاسین اور میر احمد ہیں فرار ہو گئے ہیں اور ان کی تلاش جاری ہے۔

میں نماز سے فارغ ہوا تو بیوی نے یہ خبر سناتے ہوئے کہا خدا گوس بوزن کل گوس آسن۔ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے التجا کی کہ "خدا کرے یہ ہمارا ہی مقبول بٹ ہو" عین الفطر کے تیسرا روز میں اپنے پڑوں میں اپنے ایک دوست تحصیل دار انور جمال خان کو عید ملن گیا تھا کہ گھر سے پیغام آیا کہ مظفر آباد سے غلام نبی میر صاحب کا ٹیلیفون آیا ہے کہ میں کلب ہوٹل مظفر آباد کے ٹیلیفون نمبر پر ان سے رابطہ کروں۔ کوئی ضروری بات ہے۔ میں نے تحصیل دار صاحب کے گھر سے ہی کلب ہوٹل مظفر آباد کا نمبر ملا یا اور میر صاحب سے خیریت دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ مقبول بٹ بھارتی قید سے چھوٹ کر آگئے ہیں۔ وہ اس وقت بلیک فورٹ میں FIU کی تحویل میں ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ اس بات کا راوی کون ہے۔ پہلے تو وہ بتانا نہیں چاہتے تھے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ مجھے یہ اطلاع غلام قادر سوپوری عرف قادر ٹرانے دی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ راوی جھوٹا ہے۔ اور اکثر ٹرین مارتار ہتا ہے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ غلام قادر میرے ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اس نے مجھے مقبول بٹ کا جو خلیہ بتایا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ یقینی بات ہے کہ مقبول بٹ قلعے میں ہے۔

میں نے اسی رات کراچی ٹیلی فون کر کے امان اللہ خان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہال میں نے بھی سنا ہے کہ وہ چین پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے میری معلومات کا ذریعہ پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ مصدقہ خبر ہے اور سنا ہے کہ میجر خٹک ان کا تفتیشی آفیسر ہے۔ امان اللہ خان نے کہا کہ کوئی بات نہیں میجر خٹک کا بھائی یہاں کراچی میں ہے۔ میں اس سے بھی تصدیق کروالیتا ہوں۔

رات ایک بجے کراچی سے میر عبدالقیوم صاحب کا فون آیا کہ ہماری میٹنگ ہوئی ہے اور ۲۳

نے امان اللہ خان کو مظفر آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ آج صبح تک بذریعہ ہوائی جہاز راولپنڈی پہنچ آئیں گے اور سید ہما مظفر آباد جائیں گے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں بھی مظفر آباد پہنچ جاؤں۔

اگلے روز میں خواجہ محمد صدیق پھلتو اور راجہ محمد اشرف کے ہمراہ مظفر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ راجہ اشرف ضلع ہزارہ میں منتشری آف کشمیر افیز کی طرف سے ایریا آفیس تعینات تھا۔ اس سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے رات کو ہی اس سے بات کر لی تھی اور معاہلے میں اس کی مدد مانگی تھی۔ اس نے اپنے ذرائع سے کچھ معلومات مظفر آباد سے لیں اور طے پایا کہ ہم صبح اکھٹے مظفر آباد چلیں گے۔ چنانچہ اگلے روز میں نے ٹیکسی کرائے پر لی اور تینوں مظفر آباد آگئے۔ میں نے ایبٹ آباد سے روانہ ہوتے وقت ایوب خان کے بیٹے کیپٹن اختر ایوب سے میجر خٹک کے نام ایک رقعہ لے لیا تھا۔

گردھی حبیب اللہ کے مقام پر ہماری ملاقات پروفیسر ایم۔ اے۔ عزیز صاحب سے ہوئی۔ وہ مظفر آباد سے ایبٹ آباد آرہے تھے۔ ان کے ہمراہ سوپور کا محمد مقبول تھا۔ جواب مظفر آباد میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے بھائی ولی محمد عادل کو 1956 میں اس وقت کے چیف سیکرٹری عزیز اللہ کے حکم پر دیگر پانچ آدمیوں سمیت زبردستی بارڈر سے مقبوضہ کشمیر و حکیل دیا تھا۔ ان میں خواجہ امیر الدین، شاء اللہ بٹ اور غلام قادر سوپوری وغیرہ شامل تھے۔

پروفیسر ایم۔ اے۔ عزیز صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ہم مظفر آباد پہنچنے تو آزاد عسکری صاحب کی دکان پر میری ملاقات امان اللہ خان صاحب سے ہو گئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں بھی ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ کہنے لگے آپ اپنے طور پر کوشش جاری رکھیں اور میں اپنے طور پر کوشش کرتا ہوں۔

میں غلام نبی میر اور راجہ اشرف مظفر آباد کے ایریا آفیسر ملک حبیب اللہ کے دفتر آگئے۔ جو کی۔ ایم۔ ایچ سے متصل تھا۔ راجہ صاحب نے ملک صاحب سے میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ میر سے دوست ہیں اور میں ان کی مدد کے لیے ان کے ہمراہ آیا ہوں۔ ملک حبیب اللہ نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ایسا کوئی آدمی نہیں پکڑا گیا۔ میں ایریا آفیسر ہوں میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔

ہمارے اصرار پر انہوں نے آئی جی کر انہری عبد العزیز سے ٹیلیفون پر بات کی اور

انہیں بتایا کہ میرے پاس مقبول بٹ کے کچھ عزیز گئے ہیں۔ وہ انھیں تلاش کر رہے ہیں۔ چوہدری عزیز نے کہا کہ ہمارے پاس ایک ملزم مقبول تو ہے لیکن وہ نہیں ہے جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں۔ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے غلام نبی میر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ اس خبر کو مصدقہ کر رہے تھے۔ غلام نبی میر نے اصرار کیا کہ یہاں بھی مصدقہ ہے۔ چونکہ یہاں پاکستان کی بہت سی ائمیں جس ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔ انھیں ایک دوسرے کے معاملات کی خبر نہیں ہوتی۔ وہ چونکہ ابھی تک ایف آئی یوکی تھویل میں ہیں اس لیے کچھ ایجنسیوں کو اس واقع کا علم نہیں ہوا۔

ہم نے باہر آ کر باہم مشورہ کیا۔ راجہ اشرف کو ہم نے دوبارہ ملک حبیب اللہ کے پاس بھیجا کہ ہمیں اسی مقبول بٹ کو دور سے دیکھنے کا ہی موقع دے دیں۔ ملک حبیب اللہ ہمارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی منگوائی۔ راجہ اشرف نے مجھ سے مقبول بٹ کا فوٹو لیا۔ ہم قلعہ گوجرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم چار آدمی تھے۔ راجہ اشرف، میں، ملک حبیب اللہ اور غلام نبی میر۔ قلعہ کے میں گیٹ پر پہنچ تو انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو اندر جانے دیا۔ ملک حبیب اللہ اور راجہ اشرف کو۔ ہم دونوں باہر انتظار کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد اشرف اندر سے واپس آیا تو اس نے مجھے مبارکباد دی کہ آپ کا رشتہ دار آیا ہوا ہے۔ وہ سیل میں بند ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مقبول بٹ کے سیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے کس طرح اس نے فوٹو کی مدد سے انہیں پہچانا۔

قصد یقین ہو جانے پر تسلی ہوئی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں خود اپنی آنکھوں سے اس امر کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ راجہ اشرف کہنے لگا ”اب قصد یقین ہو گئی ہے آپ ملنے کا کوئی چارہ پھر کر لینا۔ میں نے ایبٹ آباد واپس جانا ہے“۔ ہم واپس آگئے اور غلام نبی میر صاحب نے کلب ہوٹل پر اسے دوپھر کا کھانا کھلا کر رخصت کیا۔ اس کے بعد میں خواجہ عبدالصمد جو کے پاس گیا۔ جو اس وقت اے۔ ذی۔ ایم۔ تھے۔ ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ موصوف فرمانے لگے ”آج آرمی والوں نے کچھ لوگوں کے ریمانڈ لیے ہیں۔ لیکن میں نے ان کے نام بغور نہیں پڑھے“۔ البتہ میری درخواست پر وہ میرے ساتھ میجر خٹک کی رہائش گاہ تک چلنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہم دونوں عید گاہ روڈ پر واقع میجر خٹک کی رہائش گاہ پر چلے گئے۔ اسے ساری صورت حال بتائی اور اختر ایوب کا خط اس کے سامنے رکھا۔ نظر

پڑھنے کے بعد اس نے ہمیں پوچھا کہ آپ اس قیدی سے کب ملنا چاہتے ہیں۔ میرے منہ سے آفاؤ فائاؤ نکلا، اگر کل ملاقات کروادیں تو مہربانی ہو گی۔ خواجہ صد صاحب نے مجھے کہنی مار کر خاموش کروادیا اور بولے ”جناب اس نے صحیح واپس ایبٹ آباد جانا ہے اگر اسی وقت ملاقات کروادیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔“ میجر خٹک نے پاس ہی رکھا ہوا ہندل والا فون گھما یا اور قلعہ میں کسی ذمہ دار سے بات کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ یہ دو آدمی بھیج رہا ہوں انہیں فلاں Suspect سے ملا۔ لیکن اپنی موجودگی میں اس نے ہمیں چائے پلائی اور ہم نے رخصت لی۔

راستے میں خواجہ صاحب فرمائے گے، ما سڑتم بے وقوف آدمی ہو۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ آج ہی ملاقات کروانے کی بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا میں نے تجھے ٹوک دیا۔ جاؤ اب اسی وقت ملاقات کرو۔ خواجہ صاحب کو کسی کام سے جلدی گھر پہنچنا تھا وہ چلے گئے۔ میں کلب ہوٹل کی طرف آگیا۔ وہاں سے میں نے غلام نبی میر کو ساتھ لیا۔ رات کو ساڑھے نو نج رہے تھے۔ رکشہ لیا۔ کچھ خشک میوے اور سیگریٹ لئے اور قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قلعہ کے دروازے پر ایک آدمی ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے صرف مجھے قلعہ کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی اور میر صاحب کو روک دیا۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھ سے پوچھ گچھ کرنے لگے کہ آپ اس آدمی سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ اجازت کیسے لی ہے؟ کس کی سفارش سے آئے ہیں؟ کس سے ٹیلیفون کروا یا ہے؟ مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا یا آپ لوگوں نے میری تفتیش شروع کر دی ہے۔ ملانا ہے تو ملا دو نہیں تو میں خٹک صاحب کو جا کر بتا دیتا ہوں کہ مجھے نہیں ملنے دیا گیا۔ میری یہ بات سن کر انہوں نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہ پوچھا۔ وہ اب سیدھا مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ جہاں مقبول بٹ کو میل سے نکال کر پہلے سے لا یا ہوا تھا۔ اندر انگلیٹھی جل رہی تھی۔ دو چار کر سیاں پڑی تھیں۔ دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا بٹ صاحب کسی آفیسر کی طرف منہ کر کے بیٹھے تھے۔ مجھے ان کی پشت نظر آ رہی تھی۔ ایک ہی نظر میں میرے سارے شکوک و شبہات ختم ہو گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر پہلے اس آفیسر سے ہاتھ ملایا پھر اسی طرح بٹ صاحب سے ہاتھ ملا کر قریب ہی ایک کری پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ خوشی کا ایک سمندر رخا ٹھیں مار رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس لمحے میں شادی مرگ کا

شکار ہو جاتا لیکن میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے فروٹ اور گیریٹ ان کی طرف بڑھائے تو انہوں نے اشارہ کیا کہ ساتھ بیٹھے آدمی کو دے دیں۔

میں نے کشمیری زبان میں بات چیت شروع کی تو سیکورٹی کے آدمی نے نوک دیا اور کہا کہ آپ کشمیری میں بات نہیں کر سکتے، صرف اردو زبان میں بات کر سکتے ہیں۔ بٹ صاحب سے علیک سلیک کے بعد انہوں نے سب سے پہلے بچوں کی باہت دریافت کیا۔ میں نے بتایا کہ وہ خیریت سے ہیں۔ میرے کوٹ کی جیب میں ایک رسالہ پڑا ہوا تھا۔ "زون" یہ زینب بٹ شائع کرتی تھی۔ میں نے جیب سے وہ رسالہ نکالا اور بٹ صاحب کی طرف بڑھایا۔ یہ حرکت مجھ سے غیر ارادی طور پر ہوئی۔ سامنے بیٹھے آدمی نے جھٹ سے وہ رسالہ میرے ہاتھ سے چھین لیا اور کہنے لگا فی الحال آپ انھیں یہ نہیں دے سکتے۔ انہوں نے فروٹ اور گیریٹ بھی اٹھا لیے اور کہا یہ ہم چیک کر کے انہیں دیں گے۔

میں نے بچوں کا ذکر چھیڑتے ہوئے انہیں بتایا کہ بچے خیریت سے ہیں اور میرے پاس ہی ٹھہرے ہیں۔ پھر چند بچوں کے لیے ہم دونوں خاموش ہو گئے اور کوئی بات نہ کر سکے۔ ایک عجیب سکوت چھا گیا۔ سیکورٹی والے آدمی نے سکوت توڑتے ہوئے کہا "آپ بات چیت کریں کیوں خاموش ہو گئے ہیں" بٹ صاحب بولے "اور کیا بات کریں بس خیریت معلوم کرنا تھی سوکری"۔ وہ مکمل اطمینان سے بیٹھے رہے۔ بٹ صاحب کے سامنے بیٹھے آفیسر نے ان سے سوال کیا کہ جب آپ زنانہ جیل میں آئے تھے تو پھر کیا ہوا۔ بٹ صاحب بولے "ان کا ایک بڑا آفیسر جیل میں میرے پاس آیا تھا وہ مجھے کہنے لگا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ پاکستان آپ کو یہاں سے چھڑا کر لے جائے گا تو یہ آپ کی بھول ہے۔ آپ اس خام خیالی کو دل سے نکال دیں۔ یہاں جیل کے احاطے میں کوئی ہیلی کا پڑا آ کر نہیں اتر سکتا جو آپ کو ہم سے اچک کر لے جائے"

میں نے جواب دیا نہ تو میرے پاس کوئی ہیلی کا پڑ رہے اور نہ ہی میں کسی ہیلی کا پڑ کا منتظر ہوں اور نہ ہی مجھے یہاں موت کا کوئی خوف ہے۔ اچھی خاصی اس سے تنخی ہو گئی۔ وہ بھی غصے میں آگیا۔ کہنے لگا۔ "اب آپ یہاں سے نکل کر نہیں جا سکتے"۔ میں نے جواب دیا کہ آپ نے ابھی وہ چند ایسا ہی نہیں کیا جو میرے گلے میں ڈال سکیں۔

بٹ صاحب نے بات چیت جاری رکھتے ہوئے کہا "اب تو وہ سوچتے ہو گئے کہ واقعی کوئی ہیلی کا پڑا آیا اور مقبول بٹ اور اس کے ساتھیوں کو لے اڑا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب ہندوستان کے حصے بخڑے ہو جائیں گے اور اسے مجبوراً کشمیر چھوڑنا پڑے گا۔ نہ جانے اس وقت تک ہم میں سے کون زندہ ہو گا۔" بٹ صاحب سے اس آفیسر نے پوچھا کہ جب آپ جیل سے بھاگے تو پولیس یا فوج نے اسی وقت آپ کا تعاقب نہیں کیا۔ آپ کس طرح اتنا سفر طے کر کے آگئے؟ بٹ صاحب نے جواب دیا ہمارے بچاؤ کی ایک صورت یہ بھی بنی کہ اس روز میر واعظ مولانا یوسف شاہ کی وفات کی خبر پھیلی ہوئی تھی۔ جب سائرن بجے تو ہم جیل سے کافی دور آگئے تھے۔ سائرن کی آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہیں تھیں۔

ہندوستان کی کشمیر پالیسی اور اندرونی سیاست پر تبصرے ہوتے رہے۔ ایک گھنٹہ گزر تو کھانا لایا گیا۔ میں نے بھی انہی کے ساتھ کھایا۔ پنے کی دال اور روٹیاں تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے رخصت چاہی اور جیب سے کچھ رقم نکال کر بٹ صاحب کو دینا چاہی تو اس سیکورٹی والے نے مجھ سے یہ رقم اچک لی۔ بٹ صاحب نے بڑے تحمل سے جواب دیا کوئی بات نہیں انہی کو دے دیں۔ میں نے بٹ صاحب سے اجازت لی اور سیکورٹی والوں کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ غلام بنی میر صاحب میرے انتظار میں نہ حال ہو رہے تھے۔ ہم نے سواری لی اور سید ھاغلام بنی زرگر صاحب کے گھر آگئے۔ وہاں امان اللہ خان، جی ایم میر اور غلام بنی پنڈت کھانے کے لیے ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ہم لوگ مقبول بٹ کو مل کر آ رہے ہیں۔ انہوں نے اتنی دیر سے آنے پر اظہار بہی کیا تو میں نے معذرت کی کہ کسی دوست نے بلا لیا اور اس کے اصرار پر میں نے کھانا اسی کے ہاں کھالیا۔ زرگر صاحب نے جلدی سے ان حضرات کے لیے کھانا منگوایا۔ البتہ غلام بنی زرگر صاحب نے بڑے مزیدار گوشا بے اور کباب بنوائے تھے۔ میں نے بھی حسب ضرورت چکھ لیے۔

کھانے کے بعد میں نے امان اللہ خان سے پوچھا کہ آپ اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب ہوئے تو کہنے لگے میں اور میر ہدایت اللہ مجھر خٹک کے پاس اس کے بھائی کا خط لے کر گئے۔ ابھی علیک ملیک ہی ہوئی تھی کہ اس نے کہا "آپ کشمیریوں کے لیے تازہ ترین خبر یہ ہے کہ سری گنگ جیل سے

فرار ہو کر آنے والے کشیریوں کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام مقبول بٹ ہے۔ جسے انہیں انہیں جس نے ہماری جاسوسی کے لیے بھیجا ہے۔ اس کی یہ باتیں سن کر ہم خاموش ہو گئے۔ اس کے بھائی کا رقہ بھی اسے نہ دیا۔ اٹھ کر چپ چاپ واپس آگئے۔

میں نے امان اللہ خان صاحب کو کہا مقبول بٹ ایف۔ آئی۔ یوکی تحویل میں ہے۔ جس طرح یہ سچ ہے کہ ابھی ہم نے کھانا کھایا ہے اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ایک آدمی نے مقبول بٹ کو ان کی تحویل میں دیکھ لیا ہے۔ وہ اس کے حلیہ اور لباس کی بھی تصدیق کر رہا ہے۔ اس کے مشاہدے کے مطابق مقبول بٹ نے سر پر جگر (اوونی ٹوپی) پہنی ہے۔

دونوں پاؤں برف سے زخمی ہیں۔ دایاں پاؤں زیادہ زخمی ہے۔ انہوں نے سفید رنگ کی دلی اون کی بنی ہوئی سویٹر پہنی ہے۔ خاکی رنگ کا پتلون نما پا جامہ پہن رکھا ہے۔ چہرے سے وہ سخت مند و کھائی دے رہے ہیں۔ اگر ان کا بروقت علاج نہ کروایا گیا تو زخم پھیل جائے گا اور انگلیاں ختم ہو جائیں گی۔

اماں اللہ خان نے پوچھا جس آدمی نے ان کو دیکھا ہے یا ملاقات کی ہے تو اس آدمی کا نام بتائیں۔ میں نے اس بحث کو ختم کرنے کے لیے کہا آپ یہ سمجھیں میں نے خود دیکھا ہے۔ میں نے کہا اب بحث نہ کریں اور یہ طے کریں کہ ان کا علاج جلد از جلد کیسے ہو سکتا ہے۔

چنانچہ طے پایا کہ صبح میں اور اماں اللہ خان صدر آزاد کشیر خان عبدالحمید خان سے ملاقات کریں گے اور اسے مقبول بٹ کا علاج کروانے کے لیے تحریک کریں گے۔ صبح ہم صدر آزاد کشیر سے ملے۔ اس نے نہایت بے رخی اور بے اعتنائی سے جواب دیا "یہ آرمی کا معاملہ ہے۔ میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ درنہ وہ مجھے کرسی صدارت سے ہٹا دیں گے۔ یہ ان کا مسئلہ ہے وہ خود اس کا علاج کروادیں گے۔ اگر انہوں نے ضرورت محسوس کی۔ آپ بھی دعا کریں میں بھی دعا کرتا ہوں"۔

ایوان صدر سے نکلتے ہوئے مجھے کسی نے بتایا کہ اس معاملے میں ڈائریکٹر انہیں جس ظفر احمد رائخور کو ملیں۔ وہ اس وقت ظفر آزاد سٹیٹ گیٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر دو میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے باہم مشورہ کیا اور ڈائریکٹر سے ملنے چلے گئے۔ دن کا وقت تھا۔ وہ گیٹ ہاؤس کے لان میں پہنچے

تھے۔ ہم نے انہیں اپنا تعارف کروایا اور ملاقات کا مدعایاں کیا تو وہ کہنے لگا یہ غلط اطلاع ہے کہ مقبول بٹ ایف۔ آئی۔ یوکی تحویل میں ہے۔ وہ کوئی اور آدمی ہو گا۔ میں ڈائریکٹر انٹلی جس ہوں اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو میرے بھی علم میں ہوتی۔ یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا ڈائریکٹر صاحب مقبول بٹ قلعے میں زیر حرast ہے۔ اس کے پاؤں برف سے جل گئے ہیں۔ اس نے پوچھا آپ کو یہ کس نے بتایا ہے؟ میں نے کہا جو ہاتھی پالتے ہیں وہ دروازوں کو بھی اونچار کھتے ہیں۔ ہم آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری گزارش ہے کہ آپ اپنے ذراائع سے معلومات حاصل کر لیں اور مقبول بٹ کا علاج کروائیں۔ اگر اس کا بروقت علاج نہ ہوا اور اس کو کوئی نقصان پہنچا تو ہم سخت احتجاج کریں گے، کسی کو معاف نہیں کریں گے۔ اس غفلت کا خمیازہ سب کو بھلکتا پڑے گا۔

ہماری اس گفتگو کے بعد راٹھور صاحب نے گیست ہاؤس سے ہماری موجودگی میں فون پر بتایا کہ *Suspects* کا باقاعدگی سے سی۔ ایم۔ ایچ سے علاج کروایا جائے۔ چنانچہ دوسرے روز مقبول بٹ کو ایک بندگاڑی میں سی۔ ایم۔ ایچ لایا گیا۔ جہاں ڈاکٹرز نے ان کا معاشرہ کیا اور ان کے زخموں کی مرہم پڑی کی گئی۔ میں نے ظفر راٹھور سے درخواست کی کہ آپ خود مقبول بٹ سے ملاقات کریں اور ان کا علاج بھی کروائیں۔ اس نے کہا کہ فی الحال اس سے میرا ملنا بھیک نہیں۔ آرمی کا مسئلہ ہے۔ وہی پوچھ چکر رہی ہے۔ تفتیش مکمل ہونے تک میں مزید کچھ نہیں کر سکتا۔

اگلے روز میں واپس ایبٹ آباد آگیا۔ پشاور ان کے بیوی بچوں اور چچا کو انکی خیریت سے آگاہ کیا۔

کچھ روز بعد میں پھر مظفر آباد آگیا۔ بٹ صاحب ان دونوں ایف۔ آئی۔ یوکی تحقیقات سے فارغ ہو کر FIE کی جو ائٹھر گیشن کے عمل سے گزر رہے تھے جس میں FIU---FIE اور پولیس ٹینوں شامل تھے۔ میں مقبول بٹ کے بچاؤ کی نئی تراکیب سوچنے لگا۔ چنانچہ میں چیف کنزرویٹو فاریسٹ حمید اللہ خان صاحب سے ملا اور ان کو بتایا کہ مقبول بٹ سری گر جیل سے فرار ہو کر آئے ہیں اور زیر تفتیش ہیں۔ آپ کسی طرح ان سے میری ملاقات کروادیں۔ انہوں نے مجھے پوچھا کہ ایبٹ آباد کب واپس جانا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگر ملاقات کی صورت بن جاتی تو میں آج ہی

ملاقات کر کے واپس چلا جاتا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پرسوں ایک کھانے کی دعوت ہے جس میں مجرم کیانی بھی مدعو ہے۔ اس موقع پر اس سے بات کر کے آپ کو ایبٹ آباد اطلاع کر دوں گا۔ آپ بیکھ آج ہی واپس چلے جائیں۔ چنانچہ میں اسی روز واپس آگیا۔ تیسرے روز حمید اللہ خان نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ کیانی صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ آپ مظفر آباد آکر ان سے ملاقات کریں اور میرا حوالہ دیں۔ انہوں نے مجھے سے آپ کی ملاقات کروانے کا وعدہ کیا ہے۔

مجھے ایبٹ آباد میں ان دنوں کچھ خانگی مجبوریاں ایسی تھیں کہ میں چار روز بعد مظفر آباد پہنچا۔ اڑے پر اتر کر میں غلام نبی میر کے پاس گیا۔ اسے ساتھ لیا اور سید ھابیک فورٹ چلا گیا۔ قلعہ کے دروازے پر پہنچ کر جب میں نے صوبیدار امیر اللہ کو بتایا کہ میں ایبٹ آباد سے آیا ہوں اور مجرم کیانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تو انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ آپ ہی ماشر مقبول ہیں؟ میں نے کہا ”ہاں“۔ اس نے کہا کہ مجرم کیانی صاحب آپ کو کئی دنوں سے تلاش کر رہے ہیں۔ اندر تشریف لا سکیں، آپ کدھر تھے؟ اس نے ہمیں ایک بنیخ پر بٹھا دیا۔ اسی اثنا میں ایک سامنے والے کمرے سے جس پر چک گئی ہوئی تھی، مقبول بٹ کو تھکڑیاں لگائے ہوئے باہر نکالا گیا اور کسی دوسری طرف لے گئے۔

اسی دوران گھٹنی بھی، صوبیدار امیر اللہ اندر گیا اور واپس آکر بڑے موڈبانہ انداز میں کہنے لگا۔ آپ نے قلعہ اندر سے دیکھ لیا ہے، چلیں آپ کو باہر سے بھی دکھاتے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ باہر آگئے۔ باہر آ کر اس نے ہمیں اندر لے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے غلطی ہو گئی ہے۔ اندر جو اسٹ انوٹی گیشن بورڈ تحقیقات کر رہا ہے۔ جس میں مجرم کیانی، مجرم خٹک اور کرنل نذیر احمد موجود ہیں۔ ہم باہر رکے رہے۔ تھوڑی دیر بعد سارے آفیسر ان قلعے سے باہر آئے۔ کرنل نذیر گازی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ مجرم خٹک اور مجرم کیانی آپس میں با تین کرتے رہے۔ ہم ذرا دور کھڑے تھے۔ مجرم کیانی کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ اسے گھماتے ہوئے ہماری طرف بڑھا اور قریب آ کر مجھے پوچھنے لگا آپ ایبٹ آباد سے آئے ہیں۔ میں نے ”ہاں“ کہتے ہوئے ساتھ ہی حمید اللہ صاحب کا حوالہ دیا تو کہنے لگے آپ نے آتے آتے بہت دیر کر دی۔ اب ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میں نے بھی کرنل صاحب سے بات کی تھی

انھوں نے ملاقات کروانے سے منع کر دیا ہے۔ ساتھ ہی پوچھا کوئی خاص بات ہے جس کے لیے آپ ملنا چاہتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں مقبول بٹ کو گرم کپڑے اور سیکریٹ وغیرہ دینا چاہتا ہوں۔ میجر کیانی بولا اس کے پاس تو گرم کپڑے موجود ہیں۔ میں نے سیکریٹ دینے کی بات کی تو اس نے کہا مجھے دے دیں میں اس تک پہنچا دوں گا۔ میرے ہاتھ میں رید اینڈ وائٹ کے سیکریٹ دیکھ کر اس نے طنز آکھا آپ کا رشتہ دار تو تحری کیسل سیکریٹ پیتا ہے۔ میں نے کہا کہ کاش تحری کیسل سے بھی کوئی اعلیٰ سیکریٹ یہاں ملتا تو میں اس کے لیے لاتا۔ بس یہاں سے یہی ملے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ انہیں جو سیکریٹ یا گرم کپڑے مل رہے ہیں۔ میں نے طنزیہ لجھے میں جواب دیا اور ہم واپس لوٹ آئے۔ کلب ہوٹل پہنچ تو تھوڑے وقفے کے بعد صوبیدار امیر اللہ وہاں پہنچ آیا اور نہایت عجز و انکسار سے ہاتھ جوڑ کر مجھے کہنے لگا میری نوکری کا اور بچوں کا سوال ہے، مہربانی کر کے کسی کو یہ نہ بتانا کہ قلعے کے اندر میں آپ کو لے گیا تھا۔ اس وقت چونکہ اندر میٹنگ ہو رہی تھی۔ آپ نے اپنے آدمی کو تھکڑا یاں لگے ہوئے بھی دیکھ لیا ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ میں آپ کو اندر لے گیا ہوں تو میری سختی آجائے گی۔ خدار امیر انام کسی سے نہ لینا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے میں واپس ایبٹ آباد آگیا۔ مارچ 1969 کا واقعہ ہے۔

پاکستان کے آمر حکمران ایوب خان کے خلاف سیاسی جماعتوں نے شیخ مجیب الرحمن کی رہائی کے سلسلے میں تحریک شروع کر رکھی تھی۔ اس ضمن میں 10 مارچ کو ایوب خان نے سیاسی راہنماؤں کی گول میز کانفرنس بلارکھی تھی۔ ان راہنماؤں نے حکمکی دے رکھی تھی کہ اگر 10 مارچ تک شیخ کو رہانہ کیا گیا تو گول میز کانفرنس کے باہر بھر پور مظاہرہ کیا جائے گا۔

یہ دیکھتے ہوئے محاذ رائے شماری کی قیادت نے بھی اعلان کر دیا کہ اگر دس مارچ تک محاذ کے راہنماؤں مقبول بٹ کو بھی رہانہ کیا گیا تو ہم بھی گول میز کانفرنس کے باہر احتجاج کریں گے۔ آٹھ مارچ کو میں سکول ڈیوٹی پر تھا کہ گھر سے ملازم پیغام لے کر آیا کہ مظفر آباد سے ٹیلیفون آیا ہے۔ آئی جی کر انہر چودھری عبدالعزیز آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں فوراً گھر پہنچا۔ فون کی گھنٹی بھی۔ رسیور اٹھایا تو چودھری عبدالعزیز لائن پر تھے۔ مجھے کہنے لگے آپ فوراً مظفر آباد پہنچیں اور صفائت

دے کر مقبول بٹ کو لے جائیں۔ میں نے کہا کہ جناب اب تو میں ضمانت نہیں دوں گا۔ کیونکہ جب ہم ضمانت دے کر انہیں لانا چاہتے تھے تو اس وقت آپ نے نہیں مانا۔ آپ کا موقف تھا کہ ہم تحقیقات پوری کر لیں۔ اب اگر آپ نے تحقیقات مکمل کر لی ہیں تو آپ انہیں خود ہی رہا کریں۔ میں ضمانت نہیں دوں گا۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد پھر عبدالعزیز کافون آیا کہنے لگا "آپ مظفر آباد تو آئیں، بے شک ضمانت نہ دیں۔ اپنا بندہ لے جائیں" میں نے پھر صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ میں ان کی مجبوری سمجھ گیا تھا۔ کہنے لگا اچھا میں آپ سے دوبارہ بات کرتا ہوں انتظار کریں۔ میں نے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر فون کیا اور کہنے لگا "اچھا آپ مظفر آباد بے شک نہ آئیں اور نہ ضمانت دیں۔ آپ کے آدمی کو ہم خود ہی آپ کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔ آپ اپنی رہائش کا پتا بتائیں یا پھر کوئی اور جگہ جہاں ہم آجائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہم انہیں لا رہے ہیں۔ ان کے ہمراہ غلام نبی زرگر، عبدالغنی سوجی اور سیکورٹی کا ایک آفیسر ظہور شاہ ہوں گے۔ یہ رات کا کھانا آپ کے پاس کھائیں گے۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں چوکی تھانہ کینٹ کے پاس فردوس کیفے پر ان کا انتظار کر رہا ہوں گا۔ انہیں بتائیں یہاں آجائیں۔ وہ اڑھائی بجے کے لگ بھگ ایبٹ آباد پولیس کی جیپ میں مذکورہ جگہ پہنچ آئے اور بٹ صاحب کو میرے حوالے کر دیا۔ آج ہی بھارتی مقبوضہ کشمیر سے میرے ایک عزیز غلام دین میر بھی پہنچے تھے۔ میں نے ان کو بھی ہمراہ لیا۔ دونوں کی ملاقات اسی مقام پر ہوئی۔ بٹ صاحب میرے پاس رہے اور باقی لوگ مظفر آباد واپس چلے گئے۔

میں نے گھر پہنچتے ہی راولپنڈی ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کو ٹیلیفون کر کے یہ خوشخبری سنائی کہ بٹ صاحب رہا ہو کر میرے پاس ایبٹ آباد پہنچ آئے ہیں اور ہم اپنے گھر پر ہیں۔

اگلے روز عبدالخالق انصاری صاحب کا فون آگیا۔ انہوں نے مجھے بٹ صاحب کی رہائی کی مبارکبادی اور فرمانے لگے آٹھ دس گاڑیوں کا قائلہ ایبٹ آباد آنے کے لیے تیار ہے۔ اتنے لوگ وہاں آئے تو آپ کو خواہ خواہ تکلیف ہو گی۔ انہوں نے بٹ صاحب سے بھی بات کی اور تجویز پیش کی کہ وہ راولپنڈی آجائیں ہم یہاں ان کا انتظار کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے تیاری کی، تیکسی لی اور راولپنڈی روائہ ہو گئے۔ ہم کامران ہوٹل کشمیر روڈ پر مسٹرے اور ریکس ہوٹل پر فون کر کے انصاری صاحب کو

اطلاع دی کہ ہم کا مران ہوٹل پر ٹھہرے ہیں۔ تھوڑی دیرگز ری تو 60,50 لوگ گاڑیوں پر سوار کا مران ہوٹل پہنچ آئے۔ انہوں نے بٹ صاحب کو کندھوں پر اٹھالیا اور گاڑی میں بٹھا کر جلوس کی صورت میں ریکس ہوٹل لے گئے۔ وہاں محاذ رائے شماری کی مینگ ہوئی۔ محاذ کے صدر عبدالناقہ انصاری نے بڑی پراژرو جذباتی تقریر کی اور کہا "مقبول بٹ کی جدوجہد اور قربانی کے پیش نظر محاذ کی صدارت ان کا حق ہے۔ میں اس عہدے سے مستغفی ہونے کا اعلان کرتا ہوں"۔



1969ء کے آخری ایام تھے یا 1970ء کے شروع کے ایام۔ میں اور میری بیوی پشاور میں بٹ صاحب کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ نیچے سے کسی نے بٹ صاحب کو آواز دی تو وہ نیچے بیٹھک میں چلے گئے۔ کافی دیر تک وہ اوپر نہ آئے تو میں اس خیال سے نیچے اتر اکہ دیکھوں کہ نیچے کیا کر رہے ہیں۔ اندر داخل ہوا تو دیکھا بٹ صاحب ایک نوجوان سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے انھیں پوچھا یہ نوجوان کون ہے اور کہاں سے آیا ہے تو بٹ صاحب فرمانے لگے یہ اور اس کی بہن بے چارے کشمیر سے آئے ہیں۔ انھیں پیسوں کی ضرورت ہے۔ ان کے پاس شالیں ہیں اگر آپ کو یا کسی کو شالوں کی ضرورت ہو تو ان سے شالیں خرید لیں۔ ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ مجھے یاد آیا کہ میرے دوست مفتی محمد ادریس ایڈ ووکیٹ نے مجھے کشمیری شالوں کی ڈیمانڈ کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس نوجوان سے قیمت پوچھی اور کچھ شالیں خرید لیں۔ اس وقت شال کی قیمت اڑھائی سورو پے فی عدد تھی۔ آج کل تو اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ بٹ صاحب نے اس وقت مجھے اس نوجوان کا نام لے کر تعارف نہیں کروایا تھا اور نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ اس نوجوان کا نام ہاشم قریشی تھا اور بٹ صاحب سے کسی منصوبہ بندی پر بات کر رہا تھا۔

اسی عرصے میں بٹ صاحب گاہے بگاہے بات چیت کے دوران جب کشمیر کا ذکر چھڑتا تو ہم دونوں میاں بیوی کو مکہتے کہ فکر نہ کریں آپ عنقریب ایک بڑی خبر سننے والے ہیں۔ وہ میری بیوی کو کہتے کہ آپ خواتین نے بھی ہمارے شانہ بشانہ چلنا ہو گا۔ میری بیوی ان سے مذاق کرتی اور کہتی "بھائی آپ چار آدمی کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ دیوانگی کی باتیں کرتے ہیں" بٹ صاحب اسے کہتے "بس آپ چاول

کھاؤ اور اپنا کام کرو۔ وہ کہتی کیا کام کریں؟ کہتے۔ ”آپ جی ایسے کام نہیں بنے گا۔ آپ کو بھی ہمارے ساتھ بندوق اٹھانا پڑے گی۔ اگر کوئی اور کام نہ ہو تو دیوار پر مکے مار مار کر ہاتھ مضبوط کریں۔ ہمارے ہاتھ مضبوط ہو نگل تو ہم کشمیر لے سکیں گے۔ کمزور ہاتھوں والوں کو کشمیر کوئی نہیں دے گا۔“

30 جنوری 1971 کو ایک روز اچانک ہم نے خبروں میں سنا کہ دو کشمیری نوجوانوں نے سری نگر سے بھارتی طیارہ گنگا ”اغوا کر کے لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار لیا ہے۔ اور یہ نوجوان ہاشم قریشی اور اشرف قریشی ہیں اور اپنے قائد مقبول بٹ سے ملاقات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ واقعہ پیش آتے ہی انقلی جنس اداروں نے مقبول بٹ کی تلاش شروع کر دی۔ ان کا پتا کرنے کچھ الہکار ہمارے پاس بھی آئے۔ مجھے ان کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ کہاں ہیں۔ چنانچہ چیف سیکرٹری صوبہ سرحد کی زیر نگرانی ان کی تلاش جاری تھی۔ وہ کہیں باڑھ گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو انقلی جنس کے آفسران ان کے پاس پہنچ آئے اور ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ بٹ صاحب کی صحبت زیادہ بہتر نہ تھی۔ انہوں نے انھیں بتایا کہ میں لاہور کا سفر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے بٹ صاحب کو بذریعہ ہوائی جہاز لے جائیکی پیش کش کی۔ جس پر وہ آمادہ ہو گئے۔ انھیں لے جا کر لاہور انٹر نیشنل ہوٹل پر پڑھرا یا گیا۔ جب میں نے پشاور ان کے گھر رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے ہیں۔

گنگا اغوا کے بعد ایک دفعہ بٹ صاحب ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے ہمراہ ایبٹ آباد ہمارے گھر آئے۔ یہاں قیام کیا۔ ہم نے بارووم میں ان کے خطاب کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بارگیران سے خطاب کرتے ہوئے وضاحت کی کہ تحریک آزادی کشمیر کو تقویت پہنچانے کے لیے ہم نے گنگا طیارہ اغوا کیا ہے۔ ایبٹ آباد بار کے صدر نے بٹ صاحب سے سوال کیا کہ آپ تو علیحدگی پسند ہیں۔ آپ خود مختار رہ سکیں۔

بٹ صاحب نے اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ جو کچھ یوں تھا۔ ”کشمیر انڈیا پاکستان کا حصہ نہیں۔ ہماری اپنی قدیم ترین تاریخ ہے۔ اپنا جغرافیہ اور تہذیب و ثقافت ہے۔ ہماری ریاست ماضی میں بھی آزاد ریاست رہی ہے۔ دنیا میں چھوٹے ملک ہیں (نام لے کر ملک بتائے) اگر

وہ آزاد رہ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں رہ سکتے۔ ہمارے پاس تو بے پناہ وسائل ہیں جن کا مقابل کوئی نہیں۔" انہوں نے جنگلات اور سیاحت کی مثال دی۔ اس طرح انہوں نے بتایا کہ بیرون ملک آباد کشمیری کتناز رمباولہ کا کریج رہے ہیں۔ جو پاکستانی بینکوں میں پڑا ہے اور یہ پاکستان کی معیشت کے لیے کتنا بڑا سہارا ہے۔ پھر انہوں نے منگلا ذیم کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ یہ جن دریاؤں پر بنایا گیا ہے ان دریاؤں سے انگریزوں نے جب نہر اپر جہلم نکالی تھی تو مہاراجہ کشمیر کو وہ اس کی رائٹی دیتے تھے۔ لیکن اب پاکستان ان دریاؤں کا سارا پانی استعمال کر رہا ہے اور کشمیریوں کو رائٹی یا آبیانہ نہیں دے رہا۔ بُش دور میں جب یہ نہر تعمیر کی گئی تھی تو مہاراجہ نے اس کام پر تمام ریاستی باشندے بھرتی کروائے تھے۔ غیر ریاستی کو اس پر اجیکٹ میں کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ جو تعطیلات ہوتی تھیں ان کا اپناریاستی شیدول تھا۔ بٹ صاحب نے اس ضمن میں کشم ڈیوٹی کا معاملہ زیر بحث لایا اور بتایا کہ دنیا میں یہ کہیں بھی دستور نہیں ہے کہ مال کسی ملک کے لیے بک ہو اور اس کی کشم ڈیوٹی کوئی دوسرا ملک وصول کرے۔ اس ضمن میں انہوں نے مثال دیتے ہوئے سمجھایا کہ بیرون ملک آباد لاکھوں کشمیری اپنے ملک جو ساز و سامان، مشینری یا گاڑیاں وغیرہ بھیجتے ہیں یا اپنے ملک کے لیے بک کرواتے ہیں لیکن اس کی کشم ڈیوٹی کراچی اور سمنئی والے وصول کرتے ہیں۔ یہ کشم تو کشمیر حکومت کو وصول کرنا چاہیے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ کشم ڈیوٹی کی مد میں کشمیریوں کا حق لوٹا جا رہا ہے۔"

انہوں نے بنگلہ دیش کی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ بنگلہ دیش کی اہم پیداوار پٹ سن کی پیداوار ہے۔ بنگالی اپنی اس پیداوار کو سونے کا ریشه کہتے ہیں اور اسی پیداوار پر بھروسہ کرتے ہوئے انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں پٹ سن کی بوریوں کے علاوہ پلاٹک اور کٹرے کے تھیے اور بوریاں زیادہ استعمال ہونے لگے ہیں۔ آنے والے زمانے میں پٹ سن کا استعمال مزید کم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ پھر یہ بوریاں اور ٹٹاٹ بھی استعمال میں نہیں رہیں گے۔ اس کے مقابلے میں ریاست جموں کشمیر قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ پانی، معدنیات، جنگلات، سیاحت، جڑی بوریاں اور زر مبادلہ بہت بڑے وسائل ہیں۔ ان وسائل کا مقابل موجودہ سائنسی دور میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قدرت کے یہ عظیم عطیے ہیں جو ہماری ریاست کو دیئے گئے ہیں۔"

مقبول بٹ سے جب یہ سوال کیا گیا تو میرے ذہن میں آیا کہ اس سوال کا نہ جانے کوئی تسلی بخش جواب ہو گا یا نہیں۔ لیکن جب انہوں نے نہایت تفصیل سے اس کا جواب دیا۔ میں نے تو صرف آپ کو موٹی موٹی چند باتیں بتائی ہیں۔ بٹ صاحب کا جواب بڑا تفصیلی تھا۔ انہوں نے Facts and Figures کے ساتھ اتنے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں جواب دیا کہ اس محفل میں موجود ہر شخص اس بات پر مطمئن و کھائی دے رہا تھا کہ واقعی ریاست جوں کشمیر کے پاس بے پناہ قدرتی وسائل ہیں اور یہ ریاست آزاد، خود مختار رہ سکتی ہے۔ ہاں بٹ صاحب نے قدرتی وسائل کا ذکر کرتے ہوئے تمام معدنیات کے نام بھی بتائے تھے اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ معدنیات کہاں کہاں سے نکل رہی ہیں۔ اور ابھی کوئی ایسی معدنیات ہیں جو زیر زمین محفوظ ہیں یا پھر نہ جانے ابھی کیا کیا اس دھرتی کے سینے میں دفن ہے۔

○

گنگا جہاز کے اغوا کاروں کو کشمیریوں کے قومی ہیروز کا درجہ دیا گیا تھا۔ اور جگہ جگہ ان کے حق میں استقبالیہ تقریبات منعقد ہو رہی تھیں۔ یہاں ایک حالات نے نئی کروٹ بدلتی۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے میری ایک بھتیجی آئی ہوئی تھی۔ یہاں اس کے نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور ہم شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ دوسری طرف حکومتی ایوانوں میں گنگا اغوا کاروں کے خلاف شکنجہ کرنے کی تیاری ہو چکی تھی۔ بعض لیڈروں کے ایما پر اغوا کاروں کی تحقیقات کے لیے نورالعارفین کمیشن قائم کیا گیا تھا اور مری میں اس کا اجلاس شروع ہوا۔ حسن اتفاق ہے کہ اسی روز مقبول بٹ کو اپنا موقف پیش کرنے کے لیے مری کے مقام پر طلب کیا گیا۔ وہ مذکورہ تاریخ کو پہلے سیدھا ایک آباد آئے یہاں رسم نکاح خوانی میں شرکت کی اور کھانا کھائے بغیر ہی مری کے لیے روانہ ہو گئے۔ نورالعارفین کمیشن کی سرگرمیوں سے خطرے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ کچھ دنوں بعد اطلاع ملی کہ نورالعارفین کمیشن نے ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد مجاز رائے شماری کے تمام لیڈران اور سرکردہ کارکنان کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت تحقیقاتی آفیسر صوبہ سندھ کے آئی جی اطہر علی کو مقرر کیا گیا تھا۔ پشاور، پنڈی، لاہور، مظفر آباد اور کراچی میں تفتیشی مرکز قائم کئے گئے۔ چنانچہ 15 اپریل 1971ء کو مقبول بٹ کی جہاں جہاں رشتہ

داری یا تعلق داری تھی وہاں پولیس چھاپے، خانہ تلاشیاں اور پکڑ و حکڑ شروع ہو گئی۔

14-15 اگست کی درمیانی رات کو میں لاہور جانے کی تیاری کر کے سویا۔ کیونکہ بھارتی

مقبوضہ کشمیر سے ویزا پر آئے ہوئے کچھ مہماںوں کو میں نے الوداع کہنے لاہور تک ان کے ساتھ جانا تھا۔ صبح کی اذان سے پہلے بارش شروع ہو گئی اور بجلی بھی بند ہو گئی۔ میرے بھائی محمد یوسف خان صاحب تہجد کی نماز کے لیے حسبِ عادت اٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھ کھلی، رفع حاجت کے لیے اٹھا تو وہ اپنے کمرے سے نکلے اور مجھے کہنے لگے باہر ہر طرف پولیس ہی پولیس پہنچ آئی ہے یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے کہا پتا نہیں۔ شاید علاقے میں کوئی مسئلہ ہو گایا کسی کی ناکہ بندی کی ہو گی۔ میں رفع حاجت سے فارغ ہوا تو نیچے والے سیڑھیوں کے دروازے پر زور زور سے دستک شروع ہوئی۔ میں نیچے گیا، دروازے کا ایک پٹ کھول کر دیکھا تو اب باب طالع محمد انس پکٹرا اپیش برا نجی سامنے کھڑا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ہاتھ اوپر کر دیں آپ کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے ہاتھ اوپر کر دیئے اور برجستہ کہا "ہاں میرے پاس تو پیں ہیں" یہ سن کر اس نے نفری کو اوپر چڑھنے اور مکان کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ پولیس کے کافی جوان بندوقیں اٹھائے اور پر آگئے اور ہر دروازے اور کھڑکی کے سامنے پوزیشنیں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بھی حرast میں لیا ہوا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ارباب بولا آپ کے ہاں موم بتی یا لاثین تو ہو گی وہ جلا لیں۔ میں نے پوچھا کیا اس وقت بجلی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا نہیں اس وقت بجلی بند ہے۔ اس نے مجھے لاثین جلانے کی اجازت دی۔ میں اندر گیا اور بڑی مشکل سے لاثین جلائی۔ پھر وہ مجھے کہنے لگا اگر گھر میں مستورات ہیں تو انہیں ایک طرف کر دیں۔ اس ہنگامے میں نیچے اور مستورات سب جاگ اٹھے تھے۔ میں نے انہیں کچن میں چلے جانے کو کہا۔ خواتین کے پاس ایک لیڈی کاشیبل بیٹھ گئی۔ عورتوں نے روٹا دھونا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور منہ سے بے اختیار نکلا، "جو گا جریں زیادہ کھاتا ہے اس کے پیٹ میں درد تو ہوتا ہے"۔ میں خود اس صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں جاگ رہا ہوں لیکن کوئی خواب کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی۔ میری زبان اور ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں غٹاغٹ کئی گلاس پانی پی گیا۔ انہوں نے مجھے برآمدے میں

ایک چار پائی پر بھالیا اور چند اہلکار بندوقیں تان کر چار پائی کے گرد کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے گھر کی چابیاں مانگیں تو میں نے انہیں چابیاں دے دیں۔ پولیس اہلکار کروں میں گھس گئے۔ الماریاں اور صندوق چابیوں سے کھولنے کے بجائے توڑ کر کھولے اور تلاشی شروع کر دی۔ انہوں نے گھر کے اندر ایک ایک چیز کو چھاننا شروع کر دیا۔

ان کے ہاتھ فارسی کی ایک ڈکشنری آئی، اس کے درق اللتے ہوئے اس کے بیچ میں سے ایک ٹیلی گرام کی چٹ موصول ہوئی جو کسی وقت بھارتی مقبوضہ کشمیر سے میرے بھائی محمد صدیق نے بھیجی تھی کہ فلاں تاریخ کو آپ کی بیوی و اگہہ بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ گی۔ چنانچہ آپ اسے وہاں سے وصول کر لیں۔ یہ کئی برس پرانی ٹیلی گرام تھی۔ اس ٹیلی گرام کو انہوں نے نہایت اہم ثبوت کے طور پر قبضے میں لے لیا۔ انہیں میرے کاغذات سے کچھ ذاتی نوعیت کے خطوط ملے جو بھارتی مقبوضہ کشمیر سے میرے نام آئے تھے۔ انہوں نے یہ خطوط بھی قبضے میں لے لئے۔ محاذ کے کچھ پوسٹرز اور لٹر پر بھی تھا جو ایک سور میں پڑے تھے۔ انہوں نے ایک کاغذ کو دیکھا اور یہ تمام روکارہ قبضے میں لے لیا۔ صبح نو بجے تک مسلسل تلاشی ہوتی رہی۔ گھر کا دیگر سامان کپڑے، برتن وغیرہ جھاڑ کر انہیں اچھی طرح دیکھا گیا اور سب کچھ کروں، برآمدوں اور سخن میں پھیلادیا گیا۔ لیٹرین اور باور پی خانے میں رکھی گئی اشیاء کی بھی تلاشی لی گئی۔

ابذر اگھر سے باہر کا منظر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ناخچی چوک سے لے کر شاہزادہ مسجد تک اور امام باڑہ سے لے کر شیروال روڈ تک تمام علاقہ سیکڑوں پولیس اہلکاروں نے قبضہ میں لے رکھا تھا۔ ڈگی محلہ اور جبل روڈ کے تمام راستے بند تھے۔ پولیس تمام راستوں پر بندوں قیس تانے کھڑی تھی۔ مذکورہ پورے علاقے کے لوگ خوف دہراں میں گھروں میں محصور تھے۔ کسی کو کچھ علم نہیں تھا کیا ہو رہا ہے۔

چونکہ میں سیکریٹ پینے کا عادی ہوں۔ میرے سیکریٹ ختم ہو چکے تھے۔ میں نے ان سپکٹر کو کہا کہ مجھے اجازت دیں میں اپنے لیے سیکریٹ لے آؤں۔ اس نے انکار کر دیا۔ میں نے منظور کے جانے کی اجازت مانگی تو اس سے بھی مکر گئے۔ سیکریٹ کے لئے میری طلب کی شدت دیکھ کر اس نے کسی پاہی کو باہر بھیجا اور سیکریٹ منگوانے۔

ہمارے مکان کے نچلے حصے میں دو بیوہ عورتیں رہتی تھیں۔ جن میں سے ایک سکول ٹیچر تھی اور دوسری کسی ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ یہ دونوں بھی گھر میں محصور تھیں۔ دکاندار دکان میں بھی نہ کھول سکے۔ میرے بیڈروم میں چاولوں کی دو بوریاں پڑی تھیں۔ ایک لپٹا ہوا قالین کا نکڑا پڑا ہوا تھا۔ ایک ٹیلیفون سیٹ تھا۔ جس کے بارے ارباب طالع محمد نے مجھ سے پوچھا کہ یہ ٹیلیفون سیٹ اصلی ہے یا نقلی۔ میں نے جواب دیا جناب اصلی ہے۔ چاولوں کی دو بوریاں دیکھ کر کہنے لگا۔ اتنے چاول گھر میں کیوں رکھے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہم کشمیری دوٹائم چاول کھاتے ہیں اور بوریوں کے حساب سے ہی خریدتے ہیں۔

اس نے میرے ٹیلیفون سے ہی کسی کوفون کیا اور اسے بتایا "ہاں سرپکھ ثبوت ملے ہیں" اس نے غالباً پوچھا کیا ثبوت تو کہنے لگا "محمد صدیق کی ایک ٹیلی گرام ملی ہے"۔ اس پر میں سمجھ گیا اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے بتایا جناب یہ صدیق بابا کا ٹیلی گرام نہیں ہے بلکہ میرے بھائی کا ٹیلی گرام ہے۔ جو اس نے مجھے 1954 میں بھیجا تھا۔ اس پر ایسٹ آباد ڈاک خانے کی مہر لگی ہے۔ اس زمانے میں ایسٹ آباد میں تارگھر علیحدہ نہیں تھا بلکہ ڈاک خانے کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔

پولیس ساڑھے نو بجے یہ کارروائی کر کے چلی گئی اور جاتے وقت وہ مجھے تاکید کر گئے کہ آپ ہمارے دفتر آجائیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد بچوں کو تسلی دے کر میں تفتیشی مرکز چلا گیا۔ وہاں چار آفیسر بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

۱۔ مقبول بٹ آپ کا کیا لگتا ہے؟

۲۔ اس سے رشتہ کیا ہے؟

۳۔ وہ آپ کے گھر آ کر رہتا تھا؟

۴۔ وہ ہندوستان کا ایجنت ہے؟

۵۔ آپ کس کے ایجنت ہیں؟

۶۔ آپ کے گھر ٹیلیفون لگا ہے؟

۷۔ اس کا بل دکھائیں۔

۸۔ مقبول بٹ آپ کے نمبر سے کہاں کہاں کالیں کرتا تھا؟

۹۔ آپ کے مقبوسة کشمیر میں کیا تعلقات ہیں؟

۱۰۔ آپ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کیوں کرتے ہیں؟

میں نے اپنی سوچ سمجھ اور حکمت عملی سے انھیں جواب دیا۔ میں نے ان کی تحریکی وسیائی سرگرمیوں سے لालی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ میں سکول ٹیچر ہوں۔ میرا تو کسی جماعت یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال پوچھ گچھ کے بعد انہوں نے کافی دیر بعد مجھے گھر جانے کی اجازت دی۔ اس کے بعد معمول بن گیا کہ صبح تفتیشی مرکز سے ایک آدمی آتا وہ مجھے بلا کر لے جاتا۔ مجھ سے وہی سوال دہراتے جاتے اور ڈرایادھم کا یا جاتا۔ وہ کہتے کہ آپ مقبول بٹ کے بارے میں تمام معلومات رکھتے ہیں۔ ہمیں صاف صاف بتا دیں۔ وہ کہتے کہ ہم نے بڑے بڑے منکروں کو مار مار کر چاہ گوا لیا ہے۔ آپ کے ساتھ بھی ہم یہی سلوک کریں گے۔ انہوں نے میرے سامنے ایک قیدی کو لا یا جو شکل و شابہت سے کشمیری ہی نظر آ رہا تھا۔ تشدد، مار پیٹ سے اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔

اسی دوران میرے کسی ہمدرد نے مفتی محمد ادریس ایڈ ووکیٹ کو میری پریشانی بتائی۔ میں زیر تفتیش تھا کہ وہ مرکز میں پہنچ آیا اور دروازہ ٹھنکھٹا کر سیدھا اس کرے میں آ گیا جہاں میری تفتیش جاری تھی۔ جب اس نے میری یہ حالت دیکھی تو مجھے حوصلہ دیا اور میرے لیے سیگریٹ منگوائے۔ کہنے لگا اگر کوئی بات آپ کے علم میں ہے تو آپ انہیں صاف صاف بتا دیں۔ پولیس آفیسر ان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”اس آدمی سے آپ پولیس والا روائی سلوک نہ کریں۔ اگر یہ بھارت کا ایجنت ہے تو مفتی ادریس بھی اپنے آپ کو بھارت کا ایجنت کہلوانے کے لیے تیار ہے۔“ اس کی ان باتوں کا خاصا اثر ہوا اور پولیس کا رویہ زرم پڑ گیا۔

مفتی صاحب شام کو میری غیر موجودگی میں میرا پتا معلوم کرنے گھر آئے، میں کہیں باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ گھر پیغام دے گئے کہ کل تفتیشی مرکز نہیں جانا۔ میں صبح خود آؤں گا اور آپ کو اپنے ہمراہ پیش کورٹ لے چلوں گا۔ دوسرے دن صبح آئے اور مجھے اپنے ہمراہ سیشن کورٹ لے گئے۔ مجھے بار روم میں بٹھایا اور خود کورٹ روم میں چلے گئے۔ تفتیشی مرکز والوں کا آدمی میرے گھر سے پتا کر کے عدالت میں

میرے پیچے پیچے آگیا۔ کہنے لگا آپ کو مرکز میں بلا رہے ہیں۔ میں نے مفتی صاحب کو اندر پیغام بھیجا۔ وہ باہر آئے تو اس آدمی پر برس پڑے۔ ”بدمعاشی کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک شریف آدمی کا آپ نے جینا درام کر دیا ہے۔ جاؤ اپنے آفیسر طالع محمد کو بتا دو ما سڑ مقبول ادھر آنے سے انکار کر رہا ہے۔ اگر تم اس کے وارث لے کر آئے ہو تو اسے سلے جاؤ۔ ورنہ میں نہیں جانے دوں گا۔“

وہ آدمی مفتی صاحب کی ڈائنس سن کر چلا گیا۔ انہوں نے اپنے فٹی کو بلا کر ڈکٹنیشن دی۔ سیشن کورٹ میں میری طرف سے درخواست دائر کی اور قبل از گرفتاری میری حضانت کروالی۔ اس کے ہاتھ ہی تفتیش آفیسر کو نوٹس جاری کر کے عدالت حاضر کیا اور اس کی سرزنش کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ خواہ مخواہ ایک شریف شہری کو پریشان کر رہے ہیں۔ وہ عدالت کے سامنے مکر گیا کہ میں نے تو انہیں کچھ نہیں کہا۔ ڈسکٹ اینڈ سیشن نجج عبد اللہ جان نے اس کا بیان قلمبند کروالیا۔

چند روز گزرے تو ایک نئی تفتیشی ٹیم پشاور سے آگئی۔ جس کی سربراہی انپکٹر سکندر خان کر رہا تھا۔ ہم نے پھر سیشن کورٹ میں درخواست دائر کی کہ اب پشاور سے آنے والی نئی ٹیم ہمیں تنگ کر رہی ہے حالانکہ ہماری عبوری حضانت ہو چکی ہے۔

عدالت نے نئی ٹیم کو بلا یا اور انہیں ہدایت کی کہ آپ اس شخص کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ مجھے ہدایت کی کہ اگر آپ کے پاس کچھ معلومات ہوں تو انہیں بتائیں۔ نئی ٹیم نہایت ادب سے مجھے بلا ترہی اور دو، تین روز میں پوچھ گچھ کر کے واپس چلی گئی۔

چند روز گزرے تو مجھے راولپنڈی سے ایک کال موصول ہوئی کہ میں فوراً راولپنڈی پنجاب ہاؤس میں آجائیں جہاں مجھ سے کسی نے ضروری میٹنگ کرنی ہے۔

چنانچہ میں اسی وقت ایبٹ آباد سے روانہ ہوا اور راولپنڈی پنجاب ہاؤس پہنچ گیا۔ جہاں کمرہ نمبر سات میں گنگا کیس کا تفتیشی آفیسر اطہر علی میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ آرمی ائمی جس کا ایک سنیم آفیسر بھی تھا۔ وہ مجھے کہنے لگا آپ کی حضانت تو ہو گئی ہے لیکن آپ کی گواہی ہمارے لیے بڑی اہم ہے۔ آپ سب معلومات رکھتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمیں بچ نہ بتایا تو ہم آپ کی حضانت منسوخ کروائیں گے اور آپ کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور میں مقبول بٹ اور جی ایم لوں کے ساتھ رکھیں گے۔ وہاں ان

کی طرح آپ کو بھی سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ ملازمت سے بھی جائیں اور آپ کے پنج آپ کے لیے روتے رہیں۔ میں کراچی سے صرف آپ کے لیے آیا ہوں۔ ابھی میں پشاور جا رہا ہوں۔ آپ گھر جائیں اور جب میرا پیغام آپ کو ملے آپ پشاور فلاں جگہ پر آ جائیں۔

میں واپس پریشانی کے عالم میں گھر آگیا۔ صبح مقامی پولیس نے مجھ سے تعیل کروائی کہ میں پولیس لائن پشاور پہنچ جاؤں اور اطہر علی کے سامنے پیش ہو جاؤں۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں بادل ناخواستہ صبح سویرے پشاور کے لیے روانہ ہوا۔ پولیس لائن میں میری ملاقات مقبول کشمیری سے ہوئی۔ اس نے مجھے سخت ڈرایا کہ تمہارے خلاف پولیس سخت کارروائی کرنے پر تسلی ہوئی ہے۔ اگر تو نے ان کی پسند کا بیان قلم بند نہ کروا یا تو تیرے ساتھ بہت بُراسلوک ہو گا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ جان چھڑانے کے لیے اقبالی بیان دے دو۔

چنانچہ میں نے دو واقف کار آدمی عبدالرحمن بٹ اوزلسہ میر (مرحومین) کو ساتھ لیا اور ہم پولیس لائن پہنچ گئے۔ محسریت حلیم شیر وہاں بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے اطہر علی کے رو برو پیش کیا۔ اس نے مجھے پوچھا "ہاں بھئی تم نے کیا سوچا ہے"

میں نے آہستہ آہستہ بات شروع کی کہ۔ جناب مقبول بٹ رشتے میں میرا بہنوئی ہے۔ اگر اس کی وجہ سے پاکستان کی سلامتی یا اعزت خطرے میں ہوئی تو میں اس کی خاطر ایک مقبول کیا ہزاروں مقبول قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر یہ سارا جھوٹ ہے تو کل روز قیامت میرا اگر بیان ہو گا اور میری بہن مجھ سے پوچھے گی تم نے میرے خاوند کو انڈیا کا ایجنسٹ کیسے کہا تھا۔ وہاں پیش پولیس کا انسپکٹر سکندر خان ہاتھ میں ڈاندا لیے کھڑا تھا۔ میرا یہ جواب سنتے ہی مجھ پر ڈنڈے بر سانے شروع کر دیئے جس سے میری عینک ٹوٹ گئی اور مجھے چوٹیں آئیں۔ اس نے میرے چہرے پر تھپڑ بھی مارے۔ اطہر علی نے مداخلت کرتے ہوئے اس انسپکٹر کو کہا "بھئی شہر جاؤ اسے مارو نہیں۔ یہ مجھے خود بتائے گا"۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اب بھی وقت ہے اس ذلت سے اپنے آپ کو بچالو۔ شریف آدمی لکھتے ہو۔ خواہ مخواہ ذلیل ہو جاؤ گے"۔ یہ کہہ کر اس نے انسپکٹر سے کہا "اسے باہر لے جائیں اور سوچنے کا موقع دیں"۔

مجھے کرے سے باہر لے جا کر ایک برآمدے میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں پہلے ہی ایک آدمی بینجا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ پولیس کا ہی کوئی آدمی ہو گا۔ اس نے مجھ سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے پوچھا ”آپ کون ہیں اور یہاں کیسے آئے ہیں؟“ اس نے بتایا کہ میرا نام یا راجحہ ہے۔ پولیس کئی دنوں سے میری پٹائی کر رہی ہے اور مجھ سے اقبالی بیان لینا چاہتی ہے کہ میں پشاور سے اسلام کرائیٹ آباد میں ماسٹر مقبول کے گھر پہنچتا تھا۔

میرا یہ شک یقین میں بدل گیا کہ یہ پولیس کا ناؤٹ ہے اور میری شناخت کے لیے لا یا گیا ہے۔ میں نے کہا اگر آپ واقعی ماسٹر مقبول کے گھر جاتے تھے اور وہاں اسلام پہنچاتے تھے تو کیوں نہیں پولیس کو سب کچھ بتا دیتے۔ کہنے لگا ”جب میں کبھی گیا ہی نہیں اور نہ ہی میں نے ان کو دیکھا ہے نہ وہاں اسلام پہنچایا ہے تو میں کیسے مان جاؤں؟“

اب مجھے یاد آنے لگا۔ شاید یہ وہی آدمی ہو جب ایک رات میں دیر سے گھر آیا تھا۔ بٹ صاحب کچھ دنوں سے ہمارے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں اندر داخل ہو تو دیر ہونے کے باوجود میں نے دیکھا کہ بٹ صاحب کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں بٹ صاحب کو دیکھنے کے لیے کمرے میں آیا۔ میں نے دیکھا کمرے میں نظریں پیچی کئے اور سر جھکائے ایک اجنبی آدمی بھی بینجا ہے۔ اندر داخل ہوتے وقت کچھ باتوں کی آواز آرہی تھی لیکن جو نبی میں دروازے سے اندر آیا خاموشی چھا گئی۔ میں نے مداخلت مناسب نہ سمجھی اور اٹھ لئے پاؤں واپس مڑ گیا۔

جب صبح ناشستہ تیار ہوا تو میں نے ملازم سے کہا کہ رات والے مہمان کو بھی ناشستہ پر ادھر رہی بلا لو۔ ملازم نے کہا ادھر تو کوئی مہمان نہیں ہے وہ تو شاید چلا گیا ہے۔ ہاں مجھے خیال آیا صبح جب میں اٹھا تو سیڑھیوں والا دروازہ پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک ہم اہل خانہ میں سے تو کوئی بھی باہر نہیں گیا تھا۔

میں نے بٹ صاحب سے پوچھا کہ مہمان کون آدمی تھا اور ناشستہ کے بغیر کیوں چلا گیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ یہ میرے جانے والا تھا اور اسے صبح سویرے مظفر آباد کے لیے لکھنا تھا۔ ہم صبح ناشستہ سے فارغ ہوئے تو میں باہر لکلا۔ گھر کے سامنے والے ہوٹل پر بیٹھے ہوئے آدمی

نے مجھے آواز دی۔ میں نیچے گیا تو دیکھتا ہوں یہ منشی آف کشمیر افیسرز کا ایریا آفسر سلیمان ہے۔ وہ مجھے کہنے لگا ”رات کو آپ کے گھر میں جو مہمان آیا تھا اور اس کے پاس کچھ پمفلٹ ہیں اس میں سے ایک پمفلٹ آپ مجھے لادیں“۔ میں نے بتایا کہ وہ توصیح سویرے کا جا چکا ہے۔ میں نے کہا پھر بھی میں بڑے صاحب سے معلوم کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اندر آگیا اور میں نے بٹ صاحب سے اس بارے میں بات کی تودہ کہنے لگے ”ان لوکے پھوؤں کو اس وقت پتا چلتا ہے جب تیرکمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔ یہ اس سے پمفلٹ نہیں لینا چاہتے تھے بلکہ اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ وہ تواب تک اپنے ٹھکانے پر بھی پہنچ چکا ہو گا۔“

میں آپ کو بتارہا تھا کہ جب میں نے یا رحمد کو کہا کہ آپ انہیں ماشر مقبول کا بتا دیں تو وہ کہنے لگا میں کیسے بتا دوں میں تو انہیں جانتا ہی نہیں ہوں۔ نہ ہی مجھے ان کے گھر کا پتا ہے۔ میں اس کی تمام باتوں کو فریب سمجھا اور مجھے یہی لگا کہ یہ آدمی پولیس کا ٹاؤٹ ہے۔

معاً میرے ذہین میں آیا کہ اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے میں اسے اپنی اصلیت بتا دیتا ہوں۔ میں نے کہا ”میں ہی ماشر مقبول ہوں۔ جاؤ انہیں بتا دو کہ یہ ماشر مقبول ہے اور میں اسے جانتا ہوں“۔

اتنے میں اطہر علی کے کمرے سے انسپکٹر سکندر خان باہر آیا اور گویا ہوا۔ ”گلتا ہے آپ دونوں کی پرانی واقفیت ہے۔ آپس میں کیا باتیں ہو رہی ہیں“

میں نے کہا ہماری کوئی واقفیت نہیں، یہ کہتا ہے مجھے پولیس خواہ مخواہ تنگ کر رہی ہے اور مجھ سے جھوٹا بیان لینا چاہتی ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ میرے بارے میں بتا دو کہ یہ ہے وہ ماشر مقبول۔ میں اسے جانتا ہوں۔ آپ اسی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

مجھے دوبارہ اطہر علی کے پاس لے گئے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کیا سوچا ہے۔ اطہر علی کی طرف جاتے ہوئے میں نے دیکھا ایک کمرے میں ہاشم قریشی کے ماموں ماشر غلام نبی بیگ اور ان کے بیٹے عطاء اللہ بیگ نے ایک کاغذ ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور کچھ پڑھ رہے تھے۔

میں نے اطہر علی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ صحیح تودہ ہی ہے جو میں نے آپ کو پہلے

پتار یا تھا۔ اب اگر آپ مجھ سے مکن پسند بیان ریکارڈ کروانا چاہتے ہیں تو مجھے لکھ دیں میں وہی بیان دوں گا" وہ میرے اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور شینو گرفرو بلا کر اس سے ایک آرڈر لکھوایا۔ "ماسٹر مقبول کو گرفتار کر کے، ہاتھ باندھ کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر لا ہور کے شاہی قلعے میں میر قیوم اور مقبول بٹ کے پاس پہنچا دیا جائے۔"

میرے سر کے بال گھنے اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ اپنے ماتحتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا" اس کے بالوں سے نظر آتا ہے کہ یہ گوریلہ ہے۔ یہ سب کچھ بتادے گا، شرافت سے نہیں مانتا"

تفتیشی ٹیم کے ایک دوسرے آفیسر ایس پی نور محمد نے اطہر علی کو مخاطب کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ "سراس کو ایک دن اور مہلت دیں۔ مجھے امید ہے یہ سب کچھ بتادے گا" اطہر علی نے مجرمیت حلیم شیر کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آپ کو بیان قلم بند کرنے کے لیے بلا یا تھا۔ چلیں اسے ایک رات کی مزید مہلت دیتے ہیں۔ اب آپ کو کل بلا گئیں گے۔ اتنے میں نور محمد نے اطہر علی سے اجازت لی اور مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کر مجھے کہنے لگا" آپ کیوں اپنے اوپر اور اپنے بیوی بچوں پر ظلم کرتے ہیں، پنجاب کی پولیس کے شاید تمھیں ہاتھ نہیں لگے۔ وہ سب کچھ اگلوادیتے ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اس لیے آپ کے لیے ایک رات کی مہلت لی ہے۔ اب آپ چلے جاؤ اور صبح آ کر سب کچھ سچ سچ بتادو۔ اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں نے تفتیشی انچارج سے کہا کہ کل اتوار ہے۔ چھٹی ہے۔ میں ایبٹ آباد واپس چلا جاتا ہوں۔ پرسوں صبح سویرے آجائوں گا۔ پہلے تو وہ اجازت دینے پر رضامند نہ ہوا۔ لیکن کل کی چھٹی کا سن کراس نے مجھے اجازت دے دی اور مجھے تاکید کی کہ کل شام کو ہر حالت میں واپس آجائوں۔ چنانچہ میں ایبٹ آباد واپس آگیا۔

گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے اندر سے رو نے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں جلدی سے اوپر چڑھا اندرون دخل ہوا۔ دیکھا میری زوجہ کان کے ساتھ رسیور لگائے روٹی جا رہی تھی۔ اس کی آواز اس کے حلق میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھی۔ میں نے اس کے پاس جا کر اسے تسلی دی اور پوچھا کہ وہ کیوں رورہی ہے اور کس کافون ہے۔ اس کے حواس اس قدر باختہ تھے کہ مجھے

سامنے کھڑا دیکھنے کے باوجود وہ کہنے لگی۔ پشاور سے عبدالغفار کا ٹیلیفون تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ پولیس ماموں کو ہتھلاکا کر، آنکھوں پر پٹی باندھ کر، بندگاڑی میں بٹھا کر پشاور سے لاہور لے گئی ہے۔ جہاں انہیں مقبول بٹ اور میر عبدالقیوم کے ہمراہ شاہی قلعے میں رکھا جائے گا۔ میں نے اسے ڈائٹ ہوئے کہا "بیگم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں یہاں تمہارے سامنے موجود بھی ہوں اور پولیس مجھے لاہور کے شاہی قلعے میں بھی لے گئی ہو" وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے بیوی کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ دوسرا طرف پشاور سے عبدالغفار بات کر رہا تھا۔ وہ بھی رورہا تھا۔ میں نے جب اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ خبر کس نے دی تو کہنے لگا مجھے عبدالجبار ڈار اور مقبول کشمیری ملے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا۔ بلکہ جب انہوں نے مجھے یہ خبر سنائی تو میں صدمے سے سیڑھیوں پر گر پڑا اور زخمی ہو گیا۔ آخر ڈانٹ ڈپٹ کر کے میں نے اسے یقین دلایا کہ میں تو گھر آگئا ہوں کل پھر پشاور آؤں گا۔ فردوس سینما کے اڈے پر آنا اور مجھ سے ملنا۔

عبدالغفار ان دنوں پشاور یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ میں پشاور پہنچا تو دیکھا اسے واقع چوت آئی تھی۔ اس نے پٹی باندھی ہوئی تھی۔ غفار اور عبدالعزیز بٹ (چچا مقبول بٹ) ویگن اڈے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے ہمراہ میرا گھر جانا مناسب نہیں ہو گا۔ میں سیدھا ڈبگری تفتیشی مرکز چلا گیا۔

ان دنوں مقبول بٹ کی دونوں بیویاں بھی پشاور پولیس لائن میں زیر تفتیش تھیں۔ راجا بیگم نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا تھا۔

میں تفتیشی مرکز پہنچا تو سکندر خان وہاں موجود تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ٹھنڈا پئیں گے یا گرم پئیں گے۔ کیونکہ وہ خوش تھے کہ یہ از خود بیان دینے آگیا ہے۔ مجھے سخت غصہ تھا۔ میں نے کہا میں تمہارے ٹھنڈے یا گرم پر تھوکتا ہوں۔ اگر میں مقبول بٹ کے ساتھ شریک جرم ہوں تو اس کے اور میرے بیوی بچوں کا کیا قصور ہے۔ اگر تمہارے اصرار پر میں یہاں رک جاتا تو کل میری بیوی جھوٹی خبر سن کر موت کے منہ میں چلی گئی تھی۔ وہ دل کی مریضہ ہے۔ مجھے تو آج اس کا

بنازہ اٹھانا پڑتا۔ انہوں نے واقعہ کی تفصیل معلوم کرنا چاہی۔

تفقیشی مرکز تک میرے ساتھ لے میر، عبدالرحمن بٹ اور عبدالغفار بھی آئے تھے۔ عبدالغفار دہاں سے رکشے میں بیٹھ کر واپس آنے لگا تو اسے انہوں نے روک لیا اور اوپر سکندر کے پاس لے گئے۔ مجھے طیش آگیا۔ میں نے کہا اس بے گناہ کو کیوں حراساں کر رہے ہو۔ دیکھتے نہیں اس کی حالت کیا ہے؟ تم اسے فراری مجرم بنانا چاہتے ہو؟

سکندر خان نے جب عبدالغفار سے تفصیلات پوچھیں تو اس نے بتایا کہ عبدالجبار بٹ اور مقبول کشمیری نے آکر مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ماہوں کو پولیس پکڑ کر شاہی قلعہ لاہور لے گئی ہے۔ سکندر نے ان کو برا بھلا کہا اور مجھے تسلی دی۔ اس نے گھنٹہ گھر پولیس چوکی پروفون کیا اور عبدالجبار اور مقبول کشمیری کو یہاں تفہیشی مرکز لانے کی ہدایت کی۔ چوکی والوں کو مقبول کشمیری تو نہ مل سکا البتہ عبدالجبار بٹ کو وہ پکڑ کر لے آئے اور جب اس سے دریافت کیا کہ تم نے گھنٹہ گھر جا کر یہ اطلاع دی تھی۔ اس نے اپنے اس فعل کی تصدیق کی اور ثابت کرنے لگا کہ اس نے تو ہمدردی میں ایسا کیا تھا۔ پھر سکندر نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے سامنے انہیں تھکریاں لگائیں تھیں اور کیا تمہارے سامنے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی؟ کہنے لگا یہ باتیں مجھے مقبول کشمیری نے بتائی تھیں۔ اس کا جواب سن کر سکندر مزید تاؤ میں آگیا اور وہ ان دونوں کو گالیاں دینے لگا اور کہا کہ اگر واقعی تھیں ان سے ہمدردی تھی تو ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتے۔

سکندر نے مجھ سے معدرت چاہی اور ساتھ ہی جبار سے مخاطب ہوا کہ کہنے لگا "شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے دفعہ 161-164 کے تحت بیان دیا ہے میں ایسے بیانات پر پیشab کرتا ہوں۔ ہمیں ایسے بیانات کی کوئی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا آپ نے مزید کیا سوچا ہے۔ میں نے کہا جو بیان میں نے پہلے دیا تھا وہی صحیح ہے اور وہی میرا بیان ہے اور آئندہ میں آپ لوگوں کے اس طرح بانے پر نہیں آؤں گا۔ اب جب بھی آپ کو مجھے بلانا ہو تو میرے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی وساطت سے مجھے بلا یا کریں۔ میں ایک ذمہ دار سرکاری ملازم ہوں اور میں آنے جانے کاٹی۔ اے، ڈی۔ اے، بھی

حاصل کروں گا۔ اگر میرے متعلق کوئی وارث ہوں تو مجھے اسی وقت گرفتار کر لیں۔ میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ”گز شستہ دو تین ماہ سے لگا تار پولیس سنترز اور تفتیشی مرکز کے چکر کاٹنے کے بعد میرے دل سے پولیس کا خوف و خطر جاتا رہا۔ میں نے سوچا اگر انہوں نے مجھے گرفتار کرنا ہے تو کر لیں میں اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لوں۔ میری باتیں سن کر مجھے تھوڑی دیر بٹھائے رکھنے کے بعد سکندر نے آفیسر ان بالا سے بات کی اور مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

کچھ دنوں بعد میں نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ گنگا کیس میں آٹھ آدمیوں کا چالان پیش ہوا ہے۔ ان میں مقبول بٹ، جی ایم لوں، میر قیوم، میر منان، ڈاکٹر فاروق حیدر، ہاشم قریشی، اشرف قریشی اور صدیق بابا شامل ہیں۔ عدالتی کارروائی شروع ہو گئی۔ ٹریبونل میں سپریم کورٹ کے چیزیں چیف جسٹس یعقوب علی اور سندھ ہائی کورٹ کے نجی شیخ عبدالقدار شامل تھے۔ وکلاء صفائی کی طرف سے ڈاکٹر عبدالباسط، اعجاز بٹالوی، ایم انور اور عابد منتو وغیرہ شامل تھے۔ جبکہ استغاثہ کی طرف سے اہل جزل یعنی بختیار اور محمد حیات جو نیجو شامل تھے۔

دورانِ بحث اکثر دیشتر میں بھی عدالتی کارروائی سننے لا ہو رہا جاتا۔ ایک دن اچانک اس پی ایسٹ آباد کی طرف سے مجھے سکول میں آرڈر موصول ہوا کہ کل تمہیں لا ہو رہا میں ٹریبونل کے سامنے پیش ہونا ہے۔ لہذا فوری طور پر لا ہو رہ پہنچو۔ میں نے سمن کی تعییل کی اور لا ہو رکے لیے تیاری کرنے لگا۔ اسی روز میں ابھی سکول میں ہی تھا کہ پشاور سے ایک ڈی ایس پی آیا اور گھر میں پیغام چھوڑ گیا کہ ان کو پشاور طلب کیا گیا ہے۔ وہ فوراً پشاور پہنچیں ورنہ انہیں گرفتار کر کے لا یا جائے گا۔ وہ میرے لیے ایک تحریری پیغام بھی چھوڑ گیا کہ ہم نے دو تین چکر لگائے ہیں آپ ہمیں نہیں ملے۔ اگر اب بھی نہ آئے تو چھاپ مار کر آپ کو گرفتار کریں گے۔

لا ہو رہا تھا سے قبل مجھے گنگا ہائی جیکنگ ڈیفس کمیٹی کی طرف سے ہدایت ملی کہ میں لا ہو رہ آئے سے قبل مظفر آباد جاؤں اور وہاں عبدالائق انصاری صاحب سے ملاقات کر کے آؤں۔ یہ پیغام ملتے ہی میرا رخ مظفر آباد کی طرف ہو گیا اور یہاں پہنچ کر میں نے ڈی سی مظفر آبادے آر سلیم سے ملاقات کر کے عبدالائق انصاری صاحب سے ملاقات کی درخواست کی۔ انہوں نے میری ملاقات

کا اہتمام کیا۔ وہ اس وقت مظفر آباد جیل میں قید تھے۔ ان کے پاس کیس سے متعلق کچھ ضروری دستاویزات تھیں جو دکاء صفائی تک پہنچانی تھیں۔ یہ دستاویزات لے کر میں شام پانچ بجے ایبٹ آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب میں باہر نکلا تو انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ ڈاکٹر یکٹ ایبٹ آباد والی گاڑی پر نہ بیٹھوں بلکہ شاپ بائی شاپ جاؤ۔ چنانچہ میں گڑھی حبیب اللہ آیا، وہاں سے مانسہرہ اور پھر ایبٹ آباد والی گاڑی پر سوار ہو کر رات کو گھر پہنچ گیا۔

میں اگلے روز ایبٹ آباد سے راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں نزکاری بازار میں غلام رسول میر کے ہاں چلا گیا۔ جو اس وقت جی۔ ایج۔ کیوں میں ملازم تھا۔ رات گیارہ بجے تک میں اس کے ہاں زکا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں اپنے ہمراہ چلنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ رات بارہ بجے ہم دونوں لیاقت باغ اڈے سے خان بس سروس کے ذریعے لا ہو روانہ ہو گئے۔

راستے میں جہلم کے قریب گاڑی حادثے کا شکار ہوئی۔ جس سے میں اور غلام رسول زخمی ہو گئے۔ میرے پاس ضروری دستاویزات تھیں۔ جنہیں ہر حال میں بحفاظت لا ہو رپہنچانا تھا۔ ہم نے اپنے کپڑے پھاڑ کر زخموں پر پٹیاں باندھیں اور دوسری گاڑی پکڑ کر لا ہو روانہ ہو گئے۔ میکلوڈ روڈ پر ڈینس کمیٹی کے دفتر پہنچنے تو میری حالت دیکھ کر سیف الدین اور فاروق شخچ مجھے قریب ہی ایک کلینک پر لے گئے اور مرہم پٹی کروائی۔ جب ڈاکٹر اعیاز بٹالوی نے میری حالت دیکھی تو کہنے لگا میں اس حال میں اس کی گواہی نہیں کروتا۔ میں تین دن تک وہاں ٹھہر ا رہا۔ لیکن میری گواہی نہ لی گئی۔

چنانچہ پریم کورٹ سے حاضری تصدیقی سر ٹیکلیٹ لے کر میں واپس ایبٹ آباد آگیا۔

آخر کار 17 مئی 1973 کو خصوصی ٹریبوٹ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ دوسرے یا تیسرے روز مقبول بٹ صاحب سید ہے ایبٹ آباد میرے پاس پہنچے۔ ان کے بیوی پنج بھی میرے پاس آئے ہوئے تھے۔



1976ء میں محاذ رائے شماری کے فیصلے کے تحت مقبول بٹ نے ولی کی تینوں نشتوں سے ایکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی، مری ولی اور صوبہ سرحد ولی۔ صوبہ سرحد میں ان کا مقابلہ پی پی کے

امیدوار خان حمید خان سے تھا جبکہ دوسری طرف مسلم کافزنس کے بشیر حسین خان بھی ان کے مدد مقابل

تھے۔

ابھی کاغذات نامزوگی داخل نہیں ہوئے تھے کہ خان حمید خان اپنے جمایتوں کا ایک وفد لے کر میرے پاس آئے۔ ان کے ہمراہ راجہ افضل خان، محمد یوسف خان ایڈ ووکیٹ وغیرہ تھے۔ خان حمید خان مجھے کہنے لگا مقبول بٹ صاحب کو سمجھا تھیں وہ میرے مقابلے میں کھڑے نہ ہوں۔ اگر وہ چاہیہ تو انہیں ایڈ یشن نج کے عہدے پر تعینات کروادیتے ہیں یا اس کے علاوہ جو بھی وہ عہدہ چاہیں انہیں ہم تعینات کروا سکیں گے۔ کیونکہ بھٹو صاحب کی سربراہی میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ آزاد کشمیر میں جو پہلے پارلیمانی انتخاب ہو گئے ان میں خان حمید خان کو کامیاب کروا کر انہیں وزیر اعظم کا منصب سونپا جائے گا۔ اس ضمن میں بھٹو صاحب کی کچھ مجبوریاں تھیں۔

خان حمید خان نے مزید بتایا کہ اب بھٹو صاحب یہ فیصلہ کر چکے ہیں اب کسی اور کے جتنے کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ مقبول بٹ کے کھڑے رہنے سے مجھے یہ نقصان ہو گا کہ میرے دوست کم ہو جائیں گے۔

اس وقت ہائی کورٹ آزاد کشمیر کے ایک نج محمد یوسف صراف بھی میرے پاس آئے اور کہنے لگے مقبول بٹ اگر جیت بھی گئے تو ایک ممبر اتنے بڑے ایوان میں کیا کرے گا۔ بہتر یہی ہے کہ حمید خان کا مقابلہ نہ کیا جائے اور اس کے بدالے میں پرکشش مراعات یا ملازمت لے لی جائے۔ انہوں نے مجھے یقین دیا لیکہ میں آپ کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

میں نے انہیں بتایا کہ یہ بات براہ راست مقبول بٹ سے کریں۔ البتہ میں مقبول بٹ اور خان حمید خان کی ملاقات کا اہتمام کر سکتا ہوں۔ صراف صاحب کو یہ بات پسند آئی اور انہوں نے مجھے تاکید کی کہ میں اس ملاقات کا بندوبست کراؤں۔

میں نے بٹ صاحب سے رابطہ کر کے انہیں بتایا کہ پہلے پارٹی والے آپ سے ملنا چاہئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی ملاقات کروادوں۔ پہلے تو وہ کہنے لگے چھوڑ یا زہمیں جتنے ہارنے سے غرض نہیں۔ ہم نے لوگوں کے پاس جانا ہے اور انہیں اپنا پیغام دینا ہے۔ لیکن میرے اصرار پر وہ راضی

ہو گئے اور پشاور میں یہ ملاقات طے پائی۔ میں مقررہ تاریخ کو پشاور چلا گیا۔ خان حمید خان کو بھی مطلع کیا۔

خان حمید خان اور مقبول بٹ کی جب ملاقات ہوئی تو خان ان کی بڑی تعریفیں کرنے لگا اور پھر انہیں پیش کش کی کہ اگر آپ ایکشن سے دستبردار ہو جائیں تو آپ جو چاہیں گے ہم آپ کو دیں گے۔ بٹ صاحب فرمائے گے "میں ہار جیت کی پرواکنے بغیر ایکشن لڑوں گا۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ بھی ایک جہاد ہے۔ مجھے پتا ہے کہ اگر میں جیت گیا تب بھی اسمبلی میں زیادہ موثر نہیں ہو سکوں گا۔ لیکن بحیثیت کشمیری اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر جو فرائض عائد کئے گئے ہیں میں ان سے تو عہدہ برآ ہو سکوں گا۔ اسمبلی میں ہوتے ہوئے میں اپنے ملکی مفاد کی حفاظت کروں گا۔ کسی نے میرے وطن کا سودا کرنے کی کوشش کی یا عوامی مفاد کے خلاف کوئی بات کی تو اس پر صدائے احتجاج بلند کروں گا۔ میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرواؤں گا۔ اگر میں ہار بھی گیا تو تب بھی خدا کے سامنے سرخ رو ہوں گا۔ جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے ملک کے خلاف یہ سازشیں ہو رہی تھیں تو اس وقت تم کہاں تھے تو میں یہ جواب دینے میں حق بجانب ہوں گا کہ میں قوم کے پاس گیا تھا۔ قوم نے مجھ پر اعتاد نہیں کیا۔ اس لیے خان صاحب ایکشن سے دستبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

میں نے آپ کو بٹ صاحب کی گفتگو کا صرف خلاصہ بتایا ہے۔ ان کا صاف اور دوٹوک جواب سن کر خان حمید خان کو مایوسی ہوئی اور یہ مینگ برخاست ہو گئی۔

کاغذات جمع کروانے کے بعد مختلف امیدوار پر اعتراض کرنے کا جو دن مقرر تھا اس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی خان حمید خان کے یکمپ کے ایک آدمی مقبول کشمیری نے بٹ صاحب کو بتا دیا کہ حمید خان آپ کے خلاف یہ اعتراض کرے گا کہ اس شخص کو پریم کورٹ سے تا بخاست عدالت سزا ہو چکی ہے لہذا یہ ایکشن لڑنے کا اہل نہیں ہے۔ اس نے بٹ صاحب کو مشورہ دیا کہ اس اعتراض کا سامنا کرنے کے لیے تیاری کر لیں۔

میں بٹ صاحب کے تجویز کنندگان میں سے تھا۔ اس روز میں بھی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے مجھے بیس روپے دیئے اور کہا کہ ریاض ڈار کو بھیجو میری الماری میں کورٹ کے فیصلے کی کاپی پڑی ہوئی

ہے۔ جلدی سے رکھئے پر جائے اور وہ کاپی لے آئے۔ چنانچہ میں نے ریاض کوئیں روپے دیئے وہ گمراہ اور کورٹ کے فیصلے کی کاپی لے آیا۔ ریٹرننگ آفیسر کے رو برو جب خان حمید خان نے بٹ صاحب پر اعتراض کیا اور ان کے کاغذات مسترد کرنے اور انہیں نااہل قرار دینے کی استدعا کی۔ اس کے الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔ اس نے کہا،

"میرے مقابل مقبول بٹ کو چونکہ عدالت نے ڈمن کا ایکجٹ ہونے کے جرم میں سزا دی ہوئی ہے لہذا یہ ایکشن لڑنے کا اہل نہیں ہے۔ اس کے کاغذات مسترد کئے جائیں"

یہ اعتراض سن کر بٹ صاحب نے ریٹرننگ آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا،

"میں اس موقع پر خان حمید خان صاحب کے اعتراض کو سن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ لہذا میں پاکستان کی عدالت عظمی کے فیصلے کا وہ حصہ آپ کے رو برو پیش کرنا چاہتا ہوں جو متفقہ طور پر میرے بارے میں دیا گیا ہے"

چنانچہ بٹ صاحب نے وہ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں انہیں ایک عظیم حریت پسند اور آزادی کا متواہ قرار دیا گیا تھا۔

جب وہ یہ اقتباس پیش کر چکے تو خان حمید خان نے اپنے سر سے گلکتی ٹوپی اتنا ری اور نہایت ادب سے جھک کر بٹ صاحب سے معافی کا طلب گارہوا اور کہنے لگا "میں معافی چاہتا ہوں مجھے کسی نے غلط گائیڈ کیا تھا"۔ اس طرح مقبول بٹ کے کاغذات منظور ہو گئے۔

بٹ صاحب کو انتخابی نشان کشی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انتخابی مہم کے دوران خان حمید خان نے ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ مقبول بٹ اس کے حق میں ایکشن سے دستبردار ہو جائیں۔ اس نے بتایا کہ عبدالخزینہ پیرزادہ اور حیات خان ٹمن کو بھروسہ صاحب نے خصوصی طور پر یہ ٹاکس سونپا ہے کہ مقبول بٹ کو خان حمید کے حق میں دستبردار کروائیں۔ بٹ صاحب نے اس میٹنگ میں بھی صاف صاف انکار کر دیا اور کسی لائق میں نہ آئے۔

مینگ کے بعد میرے ساتھ تبرہ کرتے ہوئے بٹ صاحب نے کہا "خان حمید خان بہت سادہ اور صاف گوآدمی ہے یا پھر انہیں بے دوقوف ہے"۔



(81)

میں صوبہ سرحد میں ہر جگہ ان کے شانہ بشانہ رہا۔ مردان، پشاور، سوات، میکورہ، شنکوئی، بھرین، کalam، ایبٹ آباد، ہری پور اور مانسہرہ میں ہم نے انتخابی مہم چالائی۔ ہمارے جلے بھر پور ہوئے۔ لوگوں کے اندر جوش و خروش بہت تھا۔ لوگ مقبول بٹ سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر منافین بوکھلا گئے۔ پیپلز پارٹی والوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ چنانچہ انہوں نے دنکافسا دشروع کر دیا۔ کئی جگہوں پر پی پی کے کارکنوں نے ہمارے جلے درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ شنکیاری میں مجاز کے ایک کارکن غازی محمد انور خان تھے۔ ان کے پولنگ اسٹیشن سے بٹ صاحب جیت رہے تھے۔ محمد یوسف زرگر، نذیر احمد اور غلام دین اللہ بھی وہاں ڈیوٹی پر تھے۔ پی پی والوں نے جب دیکھا کہ مجاز کے امیدوار کو دوڑ زیادہ مل رہے ہیں تو انہوں نے لاٹھیوں اور چاقوؤں سے انور خان پر حملہ کر دیا۔ جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ زخمی حالت میں وہ ایبٹ آباد ہمارے پاس پہنچے۔ بٹ صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ چنانچہ دو چار گاڑیاں لے کر ہم ایس۔ پی مانسہرہ کے پاس چلے گئے اور اسے شرپسندوں کے خلاف کارروائی کی درخواست دی۔ شنکیاری میں پہنچ کر انہوں نے احتجاجی مظاہرہ بھی کیا۔

راجابیگم:

بٹ صاحب کی زوجہ راجابیگم بڑی ملنسار، بردبار اور با حوصلہ خاتون تھی۔ اس نے دو بچوں اور گھر کے معاملات و مسائل کو بڑی بردباری اور عالی حوصلگی سے ساتھ چلایا۔ اس نے کبھی بھی یہ لگنہ نہیں کیا کہ بٹ صاحب اسے وقت نہیں دیتے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ بٹ صاحب کی زندگی کا زیادہ تر حصہ گھر اور بچوں سے دور ہی گزرا۔ وہ بٹ صاحب کی قومی جدوجہد کو اپنی ذاتی خواہشات پر ترجیح دیتی تھیں۔ اسے خاوند پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ ان سے کوئی گلہ شکوہ نہ کرتیں۔ وہ بڑی صابر اور شاکر خاتون تھی۔ اس نے بڑے مشکل حالات میں صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ان کے صبر کا ایک واقعہ سنئے۔ گنگا ہائی جیکنگ کیس زیر ساعت تھا۔ میں بٹ صاحب کے بیٹی، بچوں کو ان سے ملاقات کروانے لا ہو رہے گیا۔ اس روز نجح صاحبان مری گئے ہوئے تھے۔ عدالت دہیں لگی تھی۔ مری کے کچھ لوگوں کے بیانات قلمبند ہو رہے تھے۔ ہم نے ایک جانے والے کشمیری کے گھر جانا تھا۔ وہ گھر نہ ملاتو اس کے گھر نہ بھرنے کے بجائے ہوٹل میں بھرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم

کھانا کھا کر ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ پیدل چل رہے تھے۔ سامنے سے ایک بے قابو تانگہ آیا۔ کوچوان نے بڑی کوشش کی لیکن گھوڑا خود سر تھا۔ اس کی زد میں آ کر راجا بیگم زخمی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر چوٹیں آئیں اور خون میں لٹ پت ہو گئی اور ساتھ ہی بے ہوش بھی ہو گئیں۔ میرے تو اوسان خطاب ہو گئے۔ میں نے سوچا شاید یہ مر جائے۔ مقامی لوگوں کی مدد سے میں نے راجا بیگم کو اٹھایا اور ایک ٹیکسی پر ڈال کر نوکھا کے قریب ایک عیسائی ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئے۔ رات کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چھپتی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ لیکن کپوڑا بھی کلینک میں موجود تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا تو وہ آگیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو کہنے لگا کہ کسی بڑے ہسپتال میں لے جائیں۔ میں نے اس کی منت سماجت کی اور بتایا کہ چھوٹے بچے بھی ساتھ ہیں اور یہ کشمیری راہنماء مقبول بٹ کی بیوی ہے۔ ہم پر دیکی لوگ ہیں۔ حادثہ کاشکار ہو گئے ہیں۔ بمہربانی ان کا علاج کر دیں۔

وہ ڈاکٹر مقبول بٹ کے نام اور کردار سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس نے راجا بیگم کے زخم صاف کئے۔ اس کے چہرے پر سات نانکے لگے اور مرہم پٹی کی۔ وہ ہوش میں آگئیں۔ یہ میری زندگی کا ایک خوفناک حادثہ تھا۔ میرا جیسا کوئی ہوتا تو چنچ و پکار کرتا رہتا۔ اس عورت نے ایک آہ تک نہ نکالی اور ساری رات خاموشی سے درد سنتی رہیں۔ صبح کہنے لگیں میرا خون دینا بھی ضروری تھا۔ اس تحریک میں اب میرا خون بھی شامل ہو گیا ہے۔ اب یہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اب میرے خاوند کی رہائی ہو جائے گی۔ میں اس رہائی کے لیے قربانی دے رہی ہوں۔

دوروز کے بعد بٹ صاحب کی سماحت شروع ہوئی تو ہم عدالت میں ان سے ملاقات کرنے گئے۔ راجا بیگم کو دیکھتے ہی بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔ اب تو کشمیر کی تحریک آزادی میں راجا بیگم کا خون بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس لیے اب کشمیر بھی چھوٹ جائے گا اور ہماری بھی رہائی ہو جائے گی۔ یہ ان کر فرط جذبات میں راجا بیگم کے آنسو پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگے۔ جیسے کوئی رکا ہوا طوفان املا آیا ہو۔

ہم چند روزوں ہاں ٹھہرے اور عدالت کی کارروائی دیکھتے رہے۔ ایک روز راجا بیگم مجھے کہنے لگی سنائے رادی روڈ پر کوئی چھتری والا کشمیری بازار رہتا ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کے

پاس لے چلیں۔ چنانچہ ہم اس کے پاس چلے گئے۔ میں نے بٹ صاحب کے حوالے سے بابے کو راجا کا توارف کر دایا تو اس نے ہماری خوب آور بھگت کی۔ مالے کھلائے، چائے بھی پلائی اور کہنے لگا۔

"شیقہری رضو ساختھ چھوک گند موت کیا کرن یمن گو ہ تھہ کر یو"

(ترجمہ) لو ہے کی رسیوں سے باندھ کر اسے کیا کریں گے۔ ان کا اپنا ہی منہ کالا ہو گا۔

اس نے مقبول بٹ صاحب اور ہمارے لیے دعا کی اور ہم واپس آگئے۔

دوسرے روز ہم پھر عدالت گئے۔ راجا بیگم بٹ صاحب سے کہنے لگیں۔ "بچے اکثر مجھے پوچھتے ہیں ہمارے ابو کہاں ہیں؟ بٹ صاحب نے پوچھا آپ کیا جواب دیتی ہو انہیں؟ وہ کہنے لگیں میں انہیں بتاتی ہوں کہ آپ کا ابو بھی میں ہوں اور آپ کی ماں بھی میں ہوں"

بٹ صاحب نے بیوی کو ہدایت کی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھیں۔ وہ کہنے لگیں "میرے بس میں جتنا ہے میں کر رہی ہوں"

راجا بیگم بچوں کو گھر پر تعلیم دیتیں۔ انہیں تختیاں لکھواتیں، پہاڑے یاد کرواتیں۔ بچے جب سکول جاتے تو وہ والدہ کو سلام کر کے جاتے۔ اسی طرح واپس آتے تو سلام کرتے۔ ماں نے بچوں کو یہ عادت سکھائی تھی۔ اب ان کی عادت بن گئی تھی۔ وہ گھر سے یہڑیاں اترتے وقت بچے پہنچنے تک سلام کی آوازیں دیتے رہتے۔ وہ بچوں کو کبھی کبھار آنہ دو آنے دیتیں تو بچے زیادہ مانگتے۔ وہ کہتیں "تمہارے ابو نے مجھے اتنے ہی دیئے تھے" وہ ہوم درک بھی اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ ان کے بچوں کے پاس سکول کے لیے میلیشیا کا ایک ایک جوڑا تھا۔ بچے شکوہ کرتے تو کہتیں "یہ کافی ہے فکر نہ کرو میلا ہوا تو وہ دو گئی"



بٹ صاحب سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ 21 اپریل 1976 کو جیب اللہ علوں کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے پشاور سے ایبٹ آباد آئے۔ بچے بھی ہمراہ تھے۔ وہ تمکن چار دن یہاں ٹھہرے لیکن صحیح کہیں چلے جاتے اور شام کو واپس لوٹتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ زیادہ دیر لگا گئے اور ہم کھانے پر ان کا انتظار کرتے رہے۔ جب دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے مجھے

پچھوں اقت کار لوگ مل گئے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ کھانا کھالیا ہے۔ معدودت چاہتا ہوں میری وجہ سے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔

بٹ صاحب بچوں کے ہمراہ واپس پشاور جانے لگے تو میں نے کہا کہ میں بھی ساتھ چلا ہوں کیونکہ میرے پاس پورٹ کا مسئلہ ہے۔ فرمائے گئے، مجھے شاید پنڈی جانا پڑے میں پنڈی سے آپ کو پشاور آنے کا پروگرام بتاؤں گا اس وقت آ جانا۔ چنانچہ میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ بچوں کو لیکر چلے گئے۔ انہوں نے بچوں کو پشاور کی گاڑی پر بٹھایا اور خود پنڈی چلے گئے۔ تیرے روز مجھے پنڈی سے فون کر کے بتایا کہ میں پشاور جا رہا ہوں آپ میرے گھر آ جائیں۔ میں کسی وجہ سے دو دن کے بعد گیا۔ پشاور ان کے گھر پہنچا تو بیوی نے بتایا کہ وہ دو دن پہلے پنڈی سے آئے تھے۔ پچھے سفر کا ضروری سامان لے کر گھر سے چلے گئے ہیں۔ جاتے ہوئے بتایا کہ سردی ہے۔ میں آزاد کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں جا رہا ہوں وہاں سردی ہوتی ہے اس لیے گرم کپڑے بھی ساتھ رکھے ہیں۔ میں نے کہا میرے پاس کچھ بھی خرچے کے لیے نہیں کچھ دے کر جائیں۔ جیب سے میں روپے نکال کر دیئے۔ میں نے کہا ان نہیں روپوں سے کیا بنے گا۔ بھلی کابل اور دیگر اخراجات ہیں پندرہ دن کیسے گزریں گے۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈالا تو پچاس روپے نکال کر دیئے اور کہا "خرچہ کم کیا کریں۔ وقت گزاریں"۔ اس کے بعد بٹ صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکی اور نہ ہی کوئی رابطہ ہوا۔ بعد ازاں پاچلا کوہ 10 مئی 1976 کو دوبارہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے تھے۔

(گفتگو 12-04-1994)

11 فروری کا قومی دن.....تاریخی تناول میں!

عبدالخالق انصاری

(سابق صدر جموں کشمیر مجاز رائے شماری)

گیارہ فروری کشمیریوں کا قومی دن ہے جسے کشمیر کی تمام سیاسی، مذہبی، سماجی اور عسکری تنظیمیں اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف بھارتی مقبوضہ کشمیر بلکہ آزاد کشمیر بشمل گلگت و بلستان میں مناتی چلی آتی ہیں۔ بھارت، پاکستان، یورپ، امریکہ، مشرق وسطیٰ کے علاوہ دنیا میں جہاں کشمیری آباد ہیں، چند سالوں سے 11 فروری کا دن قومی عظمت کے یادگار دن کی حیثیت سے مناتے چلے آرہے ہیں۔ یہ دن ہے جس کا سورج کشمیر کے اتحاد، آزادی اور سالمیت کا پیغام لے کر طلوع ہوا تھا، 11 فروری 1984ء کی صبح بھارت نے کشمیر کے عظیم انقلابی لیڈر کو تہاڑ جیل والی میں تختہ دار پر لٹکایا تھا، اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے معاهدہ امرتر، معاهدہ الحاق، معاهدہ تاشقند، معاهدہ شملہ اور دہلی ایکارڈ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے بھارت کے جبری قبضہ کے خلاف گوریلا جنگ کا اعلان کر دیا تھا، وہ خود بندوق لے کر آگے بڑھا تھا، اس نے حدِ متار کے جنگ جو کشمیر کے سینے پر ایک خونی لکیر ہے اپنے پاؤں تلے روند کر اہل وطن کی رہنمائی کرتے ہوئے دکھا دیا تھا کہ کشمیر کی آزادی کی راہ بندوق کی نالی سے گزرتی ہے۔ کشمیر کا یہ جانباز سپاہی جسے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوی ایش نے ان کی شہادت کے بعد فیلڈ مارشل کا خطاب دیا تھا۔ مجاز رائے شماری کا صدر اور اس کے خفیہ عسکری بازوں کی مجاز آزادی کا سربراہ تھا، جس نے ایک مختصر مدت میں صدیوں کی غلام قوم کو گھروں سے نکال کر میدان میں لاکھڑا کیا تھا۔ کشمیری قوم نے پوری ایک صدی تک ڈوگرہ راج کے خلاف پر اسن چد و جہد جنگ میں لاکھڑا کیا تھا۔ کشمیری قوم کے خاتمے کے بعد بھارت اور پاکستان نے ان کے وطن پر قبضہ کیا جس کے جاری رکھی، ڈوگرہ شاہی کے خاتمے کے بعد تمام ذرائع استعمال کیے جنہیں پر امن کہا جا سکتا ہے، جلے اور جلوس کے خلاف دو عشروں تک اس نے وہ تمام ذرائع استعمال کیے جنہیں پر امن کہا جا سکتا ہے، جلے اور جلوس کے ذریعے اپنے حق خود ارادیت کا مطالبہ کرتی رہی، اس نے قراردادیں پاس کیں، میمورنڈم پیش کیے، یو اے

سیاہ منائے، غلامی کے خلاف نظرے لگائے، کالی پٹیاں باندھیں، مظاہرے کیے، لانگ مارچ کیے۔
 غیر ملکی سفارتخانوں میں جا کر احتجاج کیا، اقوام متحده کے دفاتر کے سامنے بھوک ہڑتا لیں
 کیں، بین الاقوامی کانفرنسوں کے انعقاد کے موقع پر کانفرنس ہال کے باہر کتبے لے کر کھڑے ہوئے،
 اقوام متحده کی جزیل اسپلی کے ہال کے اندر داخل ہو کر پھلات اور پوسٹر پھینکے، کٹھ پتکی اسپلیوں کے
 انتخابات کا بایکاٹ کیا، جس کے نتیجہ میں کشمیری حریت پسندوں کو وہ تمام اذیتیں دی گئیں، جو ہر دور کے
 فراغت اور نمارود نے دی ہیں، پُر امن جدوجہد کے نتیجہ میں کشمیری جلاوطن ہوئے اُن سے جیلیں بھری
 گئیں۔ اُن کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے گئے۔ اُن سے غیر انسانی سلوک کیا گیا، اُن پر تشدد کے
 تمام حریبے آزمائے گئے، انہیں نارچ سیلوں میں رکھا گیا۔ انھیں اپاچ بنایا گیا، نہ صرف آنسو گیس سے
 اُن کے جلوس منتشر کیے گئے بلکہ نہتے اور پُر امن عوام پر اندر ھادھنڈ گولیاں برسائیں۔ عوام کو بھوکوں مارا
 گیا، عزت بھی لٹی، مال بھی گیا، جان بھی گئی، بالآخر کشمیریوں نے دیکھا کہ پُر امن ذراائع سے قابض
 فوجوں کو باہر نکالنا مشکل ہے تو انہوں نے اقوام متحده کے چارڑکی روشنی میں وہ حق استعمال کیا جسے اقوام
 عالم نے دنیا بھر کے غلاموں کے لیے تسلیم کر رکھا ہے، غلام تو میں اپنی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد
 کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ کشمیر کی غلام قوم نے بحالت مجبوری ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ اور وہ قائد انقلاب
 مقبول احمد بٹ شہید کشمیر کی راہ پر چلنگی ہے، کشمیریوں کو یقین ہے کہ وہ اب کشمیر کی خوبصورت سر زمین
 سے غیر ملکی دہشت گروں، فوجی درندوں اور انسانی روپ میں چھپی ہوئی کالی بھیڑیوں کو نکال کر آزادی
 کی منزل پا لیں گے۔ ۱۱ فروری کو بھارت نے ایک گوریلا جرنیل کو پھانسی پر لٹکا کر اپنے آپ کو یہ
 دھوکہ اور فریب دیا تھا کہ کشمیریوں کی جنگ آزادی ختم کر دی گئی ہے حالانکہ اسی روز آزادی کے پیش کی
 شہید کشمیر کے خون سے آبیاری کی تھی۔

دنیا نے نہ صرف یہی نہیں دیکھا کہ اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندر اگاندھی کشمیر کے لوگوں
 کو اپنی ساری دولت اور فوجی قوت کے مل بوتے پر اپنا ہمنوا نہ بنا سکی بلکہ یہ بھی دیکھا کہ جس وزیر اعظم
 نے مقبول بٹ شہید کو پھانسی دی تھی وہ اسی سال اپنے سکھ محافظوں کے ہاتھوں گولیوں سے بھون کر رکھ
 دی گئی تھی۔ قدرت کے اس انقام کا یہ نظارہ ساری نوع انسانی نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ خون

شہادت کے وہ قطرے جو حق اور سچائی کی راہ میں گرے تھے ان قطروں نے شاندار نتائج بھی مرتب کر لیے ہیں۔ آج کشمیری مرتبے ہیں وہ لذت پاتے ہیں جو بھارتی فوجوں کو شراب پینے میں نہیں آتی ہے، کشمیر میں نہ کوئی کنٹرول لائن باقی ہے نہ سیز فائر لائن کا کوئی وجود موجود ہے، نہ ہی دیت نام، جرمی اور کوریا کی طرح کوئی ایسی تقسیم نظر آتی ہے۔ جس کی پابندی قانون کی نظر میں لازمی ہو۔ کشمیر کی سیز فائر لائن اس وقت ختم ہو گئی تھی، جب کشمیر کی دونوں طرف بننے والے کشمیریوں نے اقوام متحده کی قراردادوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ کشمیری کسی ایسے معاہدے کے پابند نہیں ہو سکتے جس میں انھیں فریق نہ بنایا گیا ہو۔ کشمیری بھیڑ بکریاں یا جائیداد نہ تھے کہ اُسے قابض قومیں آپس میں بانٹ لیں، کشمیر کی سالمیت کو اُس وقت بچالیا گیا تھا جب کشمیر بریشن مودود منٹ نے پر امن مارچ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ معاہدہ تاشقندہ سے قائم کی جانے والی مصنوعی لکیر کو سال 1966ء میں اُس وقت پامال ملک کیا تھا۔ معاہدہ تاشقندہ سے قائم کی جانے والی مصنوعی لکیر کو سال 1966ء میں اُس وقت پامال ملک کیا تھا جب بندوق اٹھا کر مقبول بٹ شہید اپنے ساتھی اور نگزیب شہید کے ساتھ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوا تھا۔ مقبول بٹ شہید اس وقت مجاز رائے شماری کے مرکزی پبلیٹی بورڈ کا چیزیں میں تھا۔ مجاز نے گوریا جنگ شروع کرنے کی منظوری دے دی تھی، مقبول بٹ شہید کو گوریلا کارروائیوں کی وجہ سے ملک کی اجنی عدالت نے سزاۓ موت دی تھی۔ لیکن مقبول بٹ شہید دشمن کے ہاتھ نہ آیا اور وہ جیل توڑ کر آزاد کشمیر میں داخل ہو گیا تھا۔ جہاں سے اُسے مظفر آباد کے بلیک فورٹ میں قید کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سازشوں کے تحت معاہدہ شملہ کی رو سے قائم کی جانے والی کنٹرول لائن اُسی روز مٹا دی گئی تھی، جب مقبول بٹ شہید سال 1976ء میں معاہدہ شملہ کی وہیں فضاۓ آسمانی میں بکھیرتے ہوئے شیر کی طرح گرفتار ہوا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں دوسری بار داخل ہو گیا تھا۔ اُس وقت مقبول احمد بٹ شہید شاہی قلعہ لاہور سے ہوتا ہوا کوٹ لکھپت جیل میں پہنچ کر پسپر یہ کورٹ سے مجاز رائے شماری اور اس کے عسکری بازو تو می محاذ آزادی کے لیے حب الوطنی کا سرٹیفیکیٹ لے کر باہر آیا تھا۔ 1971ء میں مقبول بٹ شہید اپنے سیکڑوں ساتھیوں کے ساتھ مسلح جدوجہد کے بحرب میں حکومت پاکستان کی عاقبت نا اندیش نو کر شاہی کے اشاروں پر گرفتار کر لیا گیا تھا، کراچی سے پشاور تک اور میر پور سے مظفر آباد تک مجاز رائے شماری کے رہنماء جیلوں اور تفتیشی مرکز میں ڈال دیئے گئے تھے، 1971ء میں گنگاطیارے کے اغواء

نے نوکر شاہی کی نیندیں حرام کر دی تھیں اور ریاست کے قد آور رہنماؤں کو بونا بنا کر رکھ دیا تھا، مارشل لاءِ حکومت نے ہمارے خلاف ایک ٹریپول قائم کیا تھا، ہمارے خلاف وطن دشمنی، بغاوت، غداری، پاکستان دشمنی، گلگت کو آزاد کشمیر میں شامل کرنے، خود مختاری کا حق تسلیم کرانے اور بھارتی ایجنسٹ کے گھاؤنے الازمات لگائے گئے تھے۔ ہم نے گلگت کو آزاد کشمیر میں شامل کرنے اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کے لیے جدوجہد کرنے کے الازمات کو تسلیم کرتے ہوئے اقبال جرم کیا تھا، محاذ رائے شماری کے صدر مقبول احمد بٹ، سیکرٹری جزل میر عبدالمنان، خزانچی میر عبدالقیوم، ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے خلاف مسٹر جسٹس یعقوب علی چودھری چیف جسٹس پاکستان کی سربراہی میں قائم ہونے والے دور کنی اپنی ٹریپول نے ان الازمات میں بری کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارت نے ربع صدی سے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ شروع میں کشمیریوں سے وعدہ کیا گیا تھا، کہ کشمیریوں کو رائے شماری کا حق دیا جائے گا تاکہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں، لیکن بھارت بعد میں اس سے مخفف ہو گیا تھا اور ریاست پر اپنے قبضے کو دوام بخشنے لگا، لوگوں کی سیاسی و فاداریاں خریدی گئیں، ایک غیر نمائندہ ریاستی اسمبلی سے الماق کے حق میں فیصلہ حاصل کیا گیا اور کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیا گیا، ان حالات میں کشمیری نوجوانوں کے لیے مسلح جدوجہد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ان کے سامنے الجزاير، تیونس اور فلسطینیوں کی مثالیں بھی موجود تھیں اس لیے بھارتی فوج کے خلاف تحریک مزاحمت کو منظم کرنے کے لیے ان نوجوانوں کو مسلح جدوجہد کی راہ اپنا ناپڑی، اس لیے ان طzman نے صرف اسلحہ سے متعلق آرڈیننس اور آتش گیر مادہ کے قانون کے تحت جو جرائم کیے ہیں، انھیں تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے مزادریتے ہوئے زیر غور لانا ہوگا۔ عدالت نے فیصلے میں یہ لکھا کہ ملزمان دو سال سے زائد عرصہ تک زیر حراست بھی رہ پکے ہیں۔ اس لیے ہم (جو اپنی ٹریپول) مقبول احمد بٹ شہید، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان اور اشرف قریشی کو غیر قانونی طور پر اسلحہ رکھنے اور بھارتی مقبوضہ کشمیر لے جانے کی پاداش میں تاب خواست عدالت کی مزادریتے ہیں۔ عدالت نے کشمیریوں کے اس حق کو تسلیم کیا تھا، کہ کشمیر کو آزاد و خود مختار رہنے کا حق حاصل ہے اور آزادی و خود مختاری کا مطالبہ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔

کشمیریوں کے سینے پر سے گزرنے والی خونی لائن اُس وقت توڑ دی گئی تھی جب

ایں۔ ایف کے بہادر نوجوانوں لیاقت اعوان شہید، فرخ شہید اور سجاد مرزا شہید نے دیوانہ وار بڑھنے ہوئے چکٹھی کے اُس پار سب سے اوپھی چوٹی پر این۔ ایں۔ ایف کا جھنڈا الہر ایاتھا، یہ جھنڈا ششیر کی آزادی کی خود مختاری کی علامت تھا۔ یہ جھنڈا کشمیر کے لوگوں کو استھان سے نجات دلانے کا نشان تھا۔ یہ نوجوان نسل کے پُر عزم ارادوں کی نشاندہی کرتا تھا، این ایں ایف کے ان جانبازوں نے ہزاروں طلباًء کے ساتھ پر امن مارچ کیا تھا، میں نے انھیں بہت سمجھایا تھا لیکن میں اُن کے بڑھنے ہوئے قدموں کو روک نہ سکا وہ شہادت کا رُتبہ پا گئے اور حریت پسندوں کے لیے درس عبرت چھوڑ گئے۔ ہمارا دشمن بزدل ہے اُسے پر امن شہریوں پر آگ کے گولے برسانے پر عار نہیں ہے، اسے تو ہمارے خون کی چاٹ لگ گئی ہے ہمیں خون کا بدلہ لینا ہوگا۔ جنگ بندی لائیں کو پر امن عبور کرنے کے نرے کشمیری نوجوانوں کو مسلح جدو جہد کی راہ سے ہٹانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس طرح ہماری تحریک مزاحمت جو اپنے عروج پر ہے اُسے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے، ہم اپنے بہادر نوجوانوں سے ایک حل ایک امنگ، گوریلا جنگ، گوریلا جنگ آزادی کا ایک ہی ڈھنگ، گوریلا جنگ، گوریلا جنگ کے نرے لگواتے چلے آتے ہیں، اب وہ اپنے سروں پر کفن باندھ کر کلاشنکوفیں اٹھائے ہوئے پہاڑوں اور جنگلوں میں، وادیوں اور میدانوں میں اپنے دشمن پر حملہ آور ہو رہے ہیں، دشمن فوج کو احساس دلا دیا گیا ہے، کہ وہ اجنبی ملک میں طاقت کے بل بوتے پر بیٹھی ہوئی ہے، جسے جلد اپنا بستر باندھنا ہوگا، کشمیریوں کو بھی احساس ہو گیا ہے کہ الحاق کے نرے اور محدود علاقے میں مسلح جدو جہد سے تقسیم کی راہ ہموار ہو رہی ہے جب کہ کشمیری تقسیم کشمیر کو کسی صورت تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، عالمِ غیب سے آوازیں آرہی ہیں کہ کشمیری حریت پسندوں کو اپنی پالیسی خود بنانا ہوگی اور اپنی آزادی کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں دینی ہوگی۔ یہ جنگ آزادی صرف وادی کے اندر نہیں لڑی جانی چاہیے، بلکہ سوچیت گڑھ جموں سے لداخ تک، کٹھوونہ سے سیاچین گلکیشیر تک غیر ملکی فوجوں کا مقابلہ کرنا ہوگا، اور دنیا کو بتا دینا ہوگا کہ کشمیر کے چھپے چھپے بلکہ اتنے حصے پر جس میں کشمیر کے گرد وغبار کا ایک ذرہ بھی سما سکتا ہے جب تک حملہ آور فوجوں سے آزاد نہیں کرالیا جاتا کشمیری اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اور جہاد آزادی جاری رکھیں گے، وہ لوگ جوزندگی کو قیمتی سمجھتے ہیں، نیز وہ لوگ جو امن کو دکش، پسندیدہ اور شیریں سمجھتے ہیں

انھیں بتادینا ہو گا۔ کہ ہم کشمیری اس زندگی اور امن کو غلامی کی بوجھل زنجروں کے عوض خریدنے کو تیار نہیں ہیں، ہم آزادی یا شہادت کی خواہش رکھتے ہیں۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا

گرجیت گئے تو کیا کہنا، ہمارے بھی تو بازی مات نہیں

کشمیر کی سیز فائر لائیں جرمی کی دیوار برلن نہیں کشمیر ہمارا ہے اور سارے کاسارا ہے، ہم اس میں لداخ کے بلند و بالا پہاڑوں کو عبور کر کے داخل ہو سکتے ہیں۔ سیالکوٹ کے میدانوں سے اور ریاست چنہ سے ہو کر بھی کشمیر میں جاسکتے ہیں، بھبھر سے لے کر خنجراب تک ہمارے بڑھتے ہوئے قدموں کو دنیا کی کوئی طاقت کشمیر کے دونوں طرف آنے جانے سے نہیں روک سکتی، آزادی کے قافلے سری نگر سے مظفر آباد اور مظفر آباد سے سری نگر آتے جاتے ہوئے کشمیر کی تاریخِ خون شہادت کے مقدس قطروں سے رقم کر رہے ہیں۔، اکٹھ برس پہلے کی بات ہے جب کشمیری ڈوگرہ فوج کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کے سینوں کو ڈوگرہ فوجی گولیوں سے چھلنی کر دیتے تھے مگر ان میں انتقام کا جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا ب وہ دشمنوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا کر آگے بڑھ کر موت کو سینے سے لگاتے ہیں، انہوں نے بزدی کے تمام داغ اپنے روشن ہاتھوں سے مٹا دیئے ہیں اور وہ بہادروں کی طرح صرف ایک بار موت کا ذائقہ چکھنا پسند کرتے ہیں! بزدل موت سے پہلے کئی بار مر جاتا ہے جب کہ بہادر ایک ہی بار موت کا مرا چکھتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس وقت امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک ظلم ختم نہ کیا جائے، آج

کشمیریوں کو زندہ رہنے کی خواہش اس لیے باقی ہے کہ وہ آزادی کا پرچم دنیا کی آزاد اقوام کے پرچوں کے ساتھ اقوام متحده میں لہراتا ہوادیکھنا چاہتے ہیں، بھارت کو نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیے۔ کہ اب وہ زیادہ دیر تک کشمیر میں نکل نہیں سکتا، کشمیر کی غلامی کی تاریک اور طویل ترین رات ختم ہونے والی ہے، اور آزادی کی صبح طلوع ہونے والی ہے بھارتی سامراج کا جنازہ اٹھنے والا ہے، بھارت اگر اپنے وطن کو متحرکھنا چاہتا ہے تو کشمیر کشمیریوں کے حوالے کر دے، آج کے دن ہم شہید کشمیر کی عظمت کو سلام کرتے ہیں، جس نے اپنے وطن کی آبرو، قوم کی لاج اور انسانیت کے وقار کو تختہ دار پر مُسکراتے ہوئے کھڑے

ہو کر پچانی کی رسی کو چوم کر قائم کیا تھا، اور کشمیر کے ان ہزاروں شہیدوں کو بھی سلام پیش کرتے ہیں جن کے بے گور و گفن لاشے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔

مجاہدین آزادی کے لیے ہمارا اس یادگار دن کے موقع پر پیغام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو یاد رکھیں کہ ”اگر تم لڑائی میں دشمنوں کو موجود پاؤ تو نہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کی پشت پر ہیں نہیں بھاگتا دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑے ہوں“۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو حرز جان بنالیں کہ جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلے کے لیے اپنا ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر اللہ کے (کلمہ حق) اور اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھانے رکھو گے، ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی کو ضرب لگاؤ۔ جب سچائی کے منکروں سے تمہاری مذہبیہ ہو جائے تو نہیں پیٹھنہ دکھاؤ، سینہ پر ہو کر مقابلہ کرو اور جو کوئی ایسے موقع پر پیٹھ دکھادے گا تو سمجھ لو کہ وہ خدا کے عذاب میں آگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو گا۔ یاد رکھو کہ ہم حالت جنگ میں ہیں ایسی حالت میں حکم رب انبی کو سامنے رکھتے ہوئے مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور وہ جہاں کہیں ملیں گرفتار کرو، نیز ان کا محاصرہ کرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، جنگ کی حالت میں پر امن آگے بڑھنا جنگی حکمت عملی کے خلاف ہے، دشمن کا چاروں طرف سے گھیراؤ کیا جائے اور تحریک آزادی کو منزل تک پہنچانے کے لیے صرف چکوٹھی نہیں بلکہ جموں سے لداخ تک اور بھر سے لے کر اقصائے چین تک ہتھیاروں سے لیں ہو کر جنگی نفعے گاتے ہوئے بڑھتے چلو۔

مقبول احمد بٹ شہید نے داروں سن کی منزلوں سے گزر کر آزادی کو روشن کیا تھا، اس آگ کو اپنے خون کے ساتھ شعلوں میں بدل کر صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ! یہ نہ بھولو کہ جہاد کی اصل روح یہ ہے کہ عرض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے جانیں لڑاؤ کسی بچے بوڑھے اور عورت کو قتل نہ کرو صرف ان کے خلاف لڑو جو تمہارے خلاف لڑتے ہیں۔ بستیاں نہ جلاو، عبادت خانوں کو دیران نہ کرو، جو پناہ مانگئے اُسے پناہ دو، ہتھیار ڈال دے اُسے امان دو، اور آخری فتح تک جہاد آزادی جاری رکھو، شہید کشمیر کی مقدس روح تب ہی خوش رہ سکتی ہے کہ تمہارا نعرہ آزادی یا شہادت ہو، خدا خود تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ جمای اللہ حق زَهْقُ الْبَاطِلِ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهْقًا۔ (بحوالہ ہفت روزہ قائد مظفر آباد) (20 فروری 1992ء)

مقبول بٹ کی شہادت اور کشمیری قوم کا رد عمل

کے۔ انج۔ خورشید

(مرکزی صدر جوں و کشمیر ارڈیننس لیگ)

(نوت) 24 فروری 1984 کو روز نامہ نواۓ وقت کے جمعہ میگزین نے مقبول بٹ شہید کو دہلی کی تھاڑ جیل میں سزاۓ موت دیئے جانے کے واقعہ پر نامور کشمیری راہنماء جناب کے۔ انج۔ خورشید کے تاثرات و احساسات جانے کے لیے ایک انٹرو یو شائع کیا تھا۔ انٹرو یو ٹیئنل میں بیدار سرمدی اور محمد شریف کیانی شامل تھے۔ اس انٹرو یو کے مندرجات اس کتاب میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں"

محمد مقبول بٹ کو بھارتی حکومت نے دہلی کی تھاڑ جیل میں گزشتہ روز جن حالات میں اور جس "جرم" کی پاداش میں سزاۓ موت دی ہے اس پر میرا فوری رد عمل وہی ہے جو ہر محب وطن کشمیری کا ہے۔ اس افسوس ناک واقعہ نے ایک بار پھر ہم لوگوں کو جھنջوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں یہاں تھوڑا سا کشمیر کی تحریک آزادی کا پس منظر بیان کروں گا۔ کشمیر کی تحریک آزادی تو 1931 میں شروع ہو گئی تھی اور کسی نہ کسی صورت میں آج تک جاری ہے۔ اس جنگ نے مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ دہلی کی تھاڑ جیل میں مقبول بٹ کے مسکراتے ہوئے تختہ دار پر جانے کے تازہ ترین واقعہ نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ کشمیری اپنے نصب الین کی خاطر جان کا نذر رانہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ خیال باطل ہو جاتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو گیا ہے۔ 13 جولائی 1931 کو سری نگر میں 22 مسلمان کشمیری نوجوانوں نے شہید ہو کر جس تحریک آزادی کا آغاز کیا تھا وہ مقبول بٹ کی شہادت سے ایک بار پھر دنیا میں موضوع بحث بن گئی ہے۔

اس وقت پوری ریاست میں آگ پھیلی ہوئی تھی تو مہاراجہ کشمیر کی فوجیں اس صورتِ حال پر قابو نہ پا سکیں اور اس نے وائرسائے ہند سے اپیل کی اور وائرسائے ہند نے کشمیر آرڈیننس پاس کیا



(93)

بس کے تحت برطانوی ہند کی فوجیں کشمیر بھیجی گئیں۔ کشمیر میں مارشل لاء نافذ ہوا اور ریاست کے مختلف علاقوں میں گولیاں چلتی رہیں۔ اس طرح سیاسی تحریکیں بھی جاری رہا۔ 1947 میں اس تحریک نے جنگ آزادی کی صورت اختیار کر لی۔ پاکستان بننے کے بعد صوبہ سرحد کے قبائلی دستوں نے ریاست پر یا غار کر دی۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا تو مہاراجہ کشمیر نے وائرائے کو خط لکھ کر فوجی امداد طلب کی۔ چنانچہ 27 اکتوبر 1947 کو بھارتی افواج کشمیر کے دار الحکومت سری گر میں داخل ہو گئیں۔ پھر پاکستانی اور ہندوستانی افواج آئنے سامنے ہو گئیں۔

مقبول بٹ شہید اور ان کے ساتھیوں کی کارروائی کو اس زادویہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ آزاد کشمیر کی حکومت کا بنیادی مقصد تھا اور ہے بھی کہ پورے کشمیر کی ریاست کو آزاد کرا کے وہاں پر مقامی باشندوں کی مرضی کے مطابق جیسا کہ سلامتی کوسل میں بھی طے ہو چکا ہے، ان کے مستقبل کا فیصلہ وہ خود کریں۔ مگر بدستی سے آزاد کشمیر کی حکومت کو اس کا صحیح کردار ادا نہ کرنے دیا گیا اور اسے وزارتِ امورِ کشمیر کے ماتحت ایک ذیلی ادارے کی صورت دے دی گئی۔

آزاد کشمیر حکومت کو چونکہ اس کا اصل کردار ادا نہ کرنے دیا گیا۔ اس لیے کشمیری نوجوانوں نے روائی انداز سے ہٹ کر سوچنا شروع کر دیا گیا۔ 1965 کی جنگ کے بعد تاشقندہ معاهدے میں اور پھر 1971 کی جنگ کے بعد شملہ معاهدے میں کسی کشمیری کو نمائندگی نہیں دی گئی۔ ہم نے اس بنیاد پر دونوں معاهدوں کو تسلیم نہیں کیا۔ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم بھارت اور پاکستان کے درمیان دوستی کے خلاف نہیں ہیں، ہم تو چاہتے ہیں کہ ان دونوں ممالک کے درمیان اچھے ہمایوں جیسے تعلقات قائم ہوں اور کشمیر دیوار بننے کے بجائے ٹپل کا کام کرے مگر ایسا نہیں ہونے دیا جا رہا۔ معاهدہ تاشقندہ اور معاهدہ شملہ کے بعد کشمیر کا مسئلہ جوں کاتوں ہے۔

1964 میں اس ضمن میں ایک آخری کوشش ہوئی تھی جب بھارت نے شیخ محمد عبداللہ کو اس خیال سے پاکستان بھیجا تھا کہ شاید دونوں ممالک کے درمیان کشمیر کے تازعہ کا کوئی پر امن حل نکل آئے لیکن شیخ محمد عبداللہ کے پاکستان پہنچتے ہی کچھ سازشی عناصر نے میرے اور ان کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور ہم پر بھارت اور پاکستان کے خلاف ساز باز کا جھوٹا الزام لگا دیا گیا۔

وزارتِ امورِ کشمیر اور پنجاب دیگر ایوانوں میں ہمارے خلاف زبردست ہم جوئی کر کے عوامِ الناس کو گراہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آزادی ہر قوم کا پیدائشی حق ہے اور آزادی کے لیے سوچنا یا یاتگ و دوکرنا کوئی جرم نہیں ہے۔

کچھ عرصہ بعد یہ امید بھی بندھی کہ بھارت اپنے رویے میں تبدیلی کرے گا مگر شیخ عبداللہ بھی مظفر آباد پہنچے ہی تھے کہ پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا۔ اس سے دل گرفتہ ہو کر شیخ عبداللہ اپنا دورہ ادھورا چھوڑ کر پنڈت نہرو کی آخری رسومات میں شرکت کرنے واپسِ دہلی چلے گئے۔ اس کے بعد 1965 کی جنگ کے بعد بھارتی رہنماؤں نے یہ بہانے تراشنے شروع کر دیئے کہ اب اس مسئلے پر بات چیت نہیں ہو گی۔

کشمیر برطانوی ہند کی شخصی ریاستوں میں سے وہ ریاست ہے جس کے عوام آج تک صحیح معنوں میں آزادی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔ باقی ریاستوں نے یا خطوں نے مثلاً سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب وغیرہ نے اپنی مرضی سے 1947 میں پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔ اسی طرح بہت ساری ریاستیں اپنی پسند کے مطابق بھارت کا حصہ بنیں اور کچھ ریاستوں پر بھارت نے فوجی طاقت کے ذریعہ جمالیا۔ مگر کشمیریوں کو اپنی مرضی سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ حیدر آباد اور جونا گڑھ میں فوجی آپریشن کیا گیا۔

میں کشمیر کا ذکر کر رہا تھا جب بین الاقوامی سطح پر تعطل پیدا ہوا تو نوجوانوں نے سوچا کہ اب کشمیر کی آزادی کے لیے دوسرے طریقے اختیار کرنے چاہیں۔ میری جماعت کے نوجوان آج بھی مجھ سے کہتے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے لیے روایتی طریقے بے فائدہ ہیں۔ مگر میں خود باضابطہ طور پر آزاد کشمیر حکومت کے پلیٹ فارم سے جدوجہد کا قائل ہوں۔ ہم نے جوں کشمیر لبریشن لیگ 1962 میں بنائی۔ اس میں پہلی بار "LIBERATION" یعنی آزادی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ گویا ہم نے اس لفظ کو جماعت کے نام کا حصہ بنایا۔ اس سے پہلے مسلم کائفنس، پیپلز کائفنس، عوامی کائفنس اور دیگر جماعتوں بھی تھیں لیکن "لبریشن" کا لفظ ہم نے استعمال کرنا شروع کیا۔ ہماری پالیسی یہ ہی ہے کہ آزاد کشمیر کے علاوہ گلگت بلستان کے علاقے بھی ریاست جوں کشمیر کا حصہ ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالادنوں

ریاستی خطوطوں پر ایک آزاد اور با اختیار حکومت قائم ہوتا کہ وہ پوری یکسوئی اور تنہیٰ کے ساتھ پوری ریاست جموں و کشمیر کی آزادی کی تحریک کونقطہ عروج پر لے جائے۔ ہم گلگت بلستان کو بھی آزاد کشمیر اہمی میں نہ استندگی دینے کا اس لیے مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک مشترکہ حکومت عملی تیار کر کے جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہماری جدوجہد یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی۔

مقبول بٹ شہید 1962 میں ہماری جماعت میں شامل ہوئے تھے۔ تحوزے عرصے بعد انہوں نے ہماری جماعت چھوڑ دی۔ شیخ محمد عبداللہ کے دورہ پاکستان کے بعد وہ مجاز رائے شماری میں شامل ہو گئے اور انہوں نے پھر نیشنل لبریشن فرنٹ (NLF) بنالیا۔ نیشنل لبریشن فرنٹ کی تشکیل کے بعد پہلا بڑا واقعہ گنگاطیارے کا اغوا تھا۔ اس وقت طیارہ اغوا کرنے والے نوجوان ہاشم قریشی وغیرہ نے کہا تھا کہ وہ مقبول بٹ کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر مقبول بٹ خود بھارت جانے کے بعد گرفتار ہو گئے۔

مقبول بٹ کی رہائی کے لیے ہم نے کوشش کی صدر رضیاء کو دو مرتبہ درخواستیں ارسال کیں۔ بیانات بھی دیئے اور مطالبہ کرتے رہے کہ مقبول بٹ کے پاس پاکستانی پاسپورٹ ہے اسے قیدیوں کے تبادلے میں پاکستان بلوایا جا سکتا ہے۔ خدا جانے کیا مصلحتیں تھیں کہ کسی طرف سے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مقبول بٹ کشمیر کو بھارت کا حصہ نہیں سمجھتے تھے ہم بھی یہی سوچ رکھتے ہیں۔

بھارت کی سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر مقبول بٹ نے کوئی جرم کیا تھا تو بھارت کی عدالتون کو یا صدر کو اس بارے میں کوئی کارروائی کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مقبوضہ کشمیر میں ان کے جتنے ملکے کام کر رہے ہیں ہماری نظر میں ان کا وجود غیر قانونی ہے۔ مقبول بٹ لبریشن فرنٹ کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ نیشنل لبریشن فرنٹ کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ ان حالات میں کسی بھی سکول ٹیچر یا بینک آفیسر کو اپنی حفاظت یا بچاؤ کے لیے قتل کرنے کا الزام بے معنی تھا۔ کیونکہ اس طرح کی چھوٹی موٹی کارروائیاں گوریلا سرگرمیوں کے دوران ناگزیر ہوتی ہیں۔ ایک طرف جاپان میں لاکھوں افراد کو ایتم بم کے ذریعے ہلاک کر دینے کو جائز تصور کیا جاتا ہے اور دوسری طرف آزادی کے لیے کسی شخص کا ایسا جرم بھی ناقابل معافی گردانا جاتا ہے جو بے معنی بات ہے۔ مقبول بٹ شہید کو تختہ دار پر لٹکانے کے اس واقعہ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں اور وہ

یہ ہیں کہ کشمیری نوجوانوں میں آزادی کا جذبہ موجود ہے، دوم پاکستان کی حکومت کو کشمیر کے بارے میں اپنی پالیسی پر اچھی طرح سے نظر ثانی کرنی چاہیے۔

مقبول بٹ شہید کا دشمن کی قید میں مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگانے کے واقعہ سے یقیناً کشمیری نوجوانوں کی سوچ میں ایک انقلاب برپا ہو گا۔ اگر بھارت کی حکومت یہ تجھحتی ہے کہ وہ کشمیریوں کے جذبہ آزادی کو گھل دے گا تو یہ اس کی بھول ہے۔ مقبول بٹ شہید کی قربانی نے بھارت کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کر کے اس کے سیکولر ازم کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ بھارت اور پاکستان دونوں کو کشمیر کے معاملے میں اپنی پالیسی کو تبدیل کرنا ہو گا۔ میں 1962 سے کہہ رہا ہوں کہ کشمیر کے معاملے میں حکومت پاکستان کی پالیسی واضح ہونی چاہیے مگر پاکستان کی حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی۔

برطانیہ میں مقبول بٹ کو رہا کروانے کا مطالبہ کرنے والوں نے بھارتی سفارتخانے کے ایک آفیسر رویند مہاترے کو انگو اکر کے الٹی میٹم کی مدت بھی پوری نہیں ہونے دی اور اسے قتل کر دیا۔ ادھر بھارتی کا بینہ کے ہنگامی اجلاس اور پاکستان آنے والے بھارتی صحافیوں کی اندر اگاندھی کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم ہر چیز کی تاریخ کو سامنے رکھیں تو ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ بھارت کو تحد رکھنے کے لیے یا تو ایک بڑے حکمران کا وجود ہونا ضروری ہے یا پھر خوف و ہراس کی فضاء پیدا کر کے اور نفرت کے ہتھیار کو کام میں لا کر ہندورہ نماوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مقبول بٹ کو پھانسی دینے کا اقدام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔ آخر میں میں پاکستان کی سیاسی جماعتوں اور موجودہ حکومت سے مطالبہ کرو گا کہ وہ کشمیر کے بارے میں مشترکہ قوی پالیسی وضع کریں۔ گلگت بلتستان کو آزاد کشمیر اسمبلی میں نمائندگی دے جائے اور آزاد کشمیر میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ لوگ اپنی تحریک کو از خود چلانے کے لیے اپنے وسائل کو پوری طرح استعمال کر سکیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ممکن ہے کشمیری نوجوان اپنے طور پر ایسی تنظیمیں بنائیں اور انفرادی سطح پر ایسے کام کریں جن سے مقبوضہ کشمیر میں موجود بھارت کی بڑی فوج کا صحیح مقابلہ ممکن نہ ہو سکے۔

(پینل انٹرو یو۔ بیدار سرداری، محمد شریف کیانی)

(نوابے وقت جمعہ میگزین 24 فروری 1984)

کاروانِ آزادی کا سپہ سالار

شہید کشمیر مقبول احمد بٹ

میر عبد القیوم (کراچی)

آزادی کا دیوانہ شمع حریت کا پروانہ مقبول احمد بٹ اپنی جان کا نذر انہ پیش کر کے کشمیر کی
لوح تاریخ پر ہمت، جرأت، تڑپ اور خلوص و قربانی کا ایک لافانی باب رقم کر گیا۔ ان کی شہادت پر
جناب عبدالحق انصاری صاحب نے میر منان کے نام ایک خط لکھا تھا کہ مقبول احمد بٹ نے تختہ دار پر
جھول کر ایک کروڑ کشمیریوں کی آبرو رکھ لی ہے۔ بھارت نے آزادی کے سپہ سالار کو پھانسی پر لٹکا کر اس
کی جان چھینی ہے لیکن وہ حیات جاوہاں پا گیا ہے۔ اس کی شہادت نے مظلوم کشمیریوں کی رگوں میں
زندگی کا خون دوڑا دیا ہے۔ مفاد پرست عناصر نے جو سنگین الزامات کے داغ لگائے تھے اور جسے مسٹر
جسٹس یعقوب علی کی سربراہی میں قائم ہونے والا ٹریبیਊن بھی نہ دھوسکا۔ اسے ہمارے ساتھی نے پھانسی
کا پھندا گلے میں ڈال کر دھو دیا ہے۔ آج کشمیری پھر اپنا سر بلند کر سکتے ہیں۔ میرا یہ ساتھی جب تختہ دار
پر کھڑا ہوا تھا اس وقت کشمیریوں کی آزادی کی علامت بن گیا تھا اور جب کلمہ شہادت پڑھ کر اس نے
پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا تو وہ امت مسلمہ کا گراں قدر سرمایہ بن گیا اور اراب اسے تختہ دار سے نیچے
لا یا گیا تو وہ ساری دنیا کے غلاموں معمکنوں اور مجبوروں کی آواز، دھڑکن اور سبل بن چکا تھا۔ یہ ہمارا کتنا
عظیم اور پیارا ساتھی تھا۔ سارے آزاد کشمیر بشمول گلگت کا سفر ہم نے اکٹھے ہی طے کیا تھا وہ سچائی کا رجع

بوتا چلا گیا اور بالآخر

مقام فیض کوئی راہ میں بچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکل تو سوئے دار چلے

بھارت کے نزدیک وہ دہشت پسند تھا لیکن تاریخ یہ ضرور پوچھے گی کہ بھگت سنگھ، اس کو

دیو اور راج گرو، یہ کس طرح کے ہیرو تھے؟ اگر وہ دہشت پسند تھا تو رام محمد نگہ جس نے جزل ایڈ وائز کو گولی مار کر جلیا نوالہ باغ کا بدلہ لیا تھا وہ کیسے انقلابی ہو سکتا ہے؟ اگر وہ مسلح جدو جہد پر ایمان رکھنے کی وجہ سے مجرم تھا تو پنڈت جواہر لال نہرو آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کی پیش شاہ نواز سہیل اور ڈھلوں کے دفاع کے لیے اپنے جسم پر دکلا کا لباس پہن کر عدالت میں کیوں پیش ہوا تھا؟ - پنڈت جواہر لال نہرو نے بھری عدالت میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ مسلح جدو جہد غلام قوموں کا حق ہے۔ اگر یہ لوگ ہیرو تھے تو مقبول احمد بٹ کشمیر کا ہیرو اور سرز میں کشمیر کا مایہ ناز سپوت ہے وہ شہادت کا مزہ چکھنا چاہتا تھا۔ خدا نے اس کی خواہش پوری کر دی۔

سے یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعا کے واسطے دار و رسن کہاں

اس شہید کی موت نے نئی پود کے لیے ایک مثال قائم کر دی ہے۔ مقبول احمد بٹ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے جس سے آزادی کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو راہ ملا کرے گی۔ اس کی موت نے سارے کشمیر کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور جولا و اندر، ہی اندر پک رہا تھا وہ پھٹ چکا ہے۔ اب بھارتی استبداد زیادہ عرصے کے لیے کشمیریوں کو غلام نہیں رکھ سکے گا۔ میرا کشمیر جو ایشیاء کی انگوٹھی کا نگینہ ہے، جو ایشیاء کا سوئزر لینڈ ہے وہ آزاد ہو گا ان شاء اللہ۔ مقبول احمد بٹ سپریم کورٹ میں ایک دفعہ گر جا تھا کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ میں دشمنوں سے خون منٹ لوں گا۔ ہمارے ساتھی کے حصے میں عزت کی موت تھی اسے پا کر وہ حیاتِ جاوداں پا گیا۔

یہ تھے جناب انصاری صاحب کے جذبات جو میں نے حرفاً حرف اس لیے بیان کر دیئے تھے تاکہ ہماری نئی نسل اس سے استفادہ کر سکے مقبول احمد بٹ شہید کشمیر ایک تعلیم یافتہ خوش شکل و خوش گفتار، خوش اطوار، ذہین اور با وقار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی شخصیت تھے جن کے پاس وہ سب کچھ تھا جس سے وہ عزت، دولت، شہرت، اقتدار، غرض ہر وہ شے حاصل کر سکتے تھے جس کے لیے دنیا ترسی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے آخر کیوں وہ اپنے بیوی بچوں،

کمر کے آرام و سکون اور آسانش کو تیاگ کر اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر دیوانوں کی طرح ایک ایسی راہ پر چل پڑے جس کی راہیں زندان کی طرف جاتی تھیں اور ہر قدم نہ صرف خنجروں کی نوک پر رکھنا پڑتا تھا بلکہ ہر وقت چنانی کا چند اسر پر لگتا نظر آتا تھا۔ دراصل ان کے نزدیک انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد وطن عزیز کی آزادی تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ آزادی کھو کھلنے عروں، بیانوں، لمحے دار تحریروں اور مظاہروں سے نہیں ملا کرتی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے پختہ شعور، عزم یقین اور ایمان کی مضبوطی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عوامی جنگ میدان میں رہ کر قوم کو منظم اور متحرک کر کے وطن کے اندر ہی سے لڑی جاسکتی ہے۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں خود اندر رہ کر انقلاب برپا کرنے کے خواہشمند تھے، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کشمیر کے اندر ان کے سر کی قیمت مقرر ہو چکی ہے۔ اگر وہ پکڑے گئے تو انھیں سولی پر لٹکا دیا جاسکتا ہے۔ ان سب چیزوں کو جانتے ہوئے بھی کشمیر کا یہ جیالا سپوت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے نتیجے سے بے خطر ہو کر اپنی سرز میں میں داخل ہو گیا۔ ان کا ایمان تھا جورات قبر کے اندر آنا لکھی ہے وہ باہر کھینچنی نہیں آسکتی۔ ایمان کے اس بیش بہاذبے کو سینے سے لگائے وہ احتیاط کی دیواروں اور مصلحت اندریشی کی تمام فصیلوں کو روندتا ہوا 1976ء میں اپنے وطن عزیز کی سر زمین میں کمال ہمت اور جرأت سے داخل ہو گیا اور وہاں پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ ہندوستان کی حکومت نے اس کی سابقہ مزا بحال تور کھی لیکن انھیں آٹھ برس کے طویل عرصے تک تنہا جیل کی شگ و تاریک کوٹھری میں مقید رکھا۔ چنانی دینے کے اعلان کے بعد اتنے طویل عرصے تک کسی شخص کو مقید رکھنے کا جواز نظر نہیں آتا۔

драصل حقیقت یہ تھی کہ ہندوستان کی حکومت خائف تھی کہ اگر مقبول احمد بٹ کو چنانی دے دی گئی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کشمیر کے دونوں حصوں میں بغاوت کالاؤ اپھٹ پڑے۔ اندر اگاندھی کی حکومت چنانی دینا تو چاہتی تھی مگر وہ مناسب موقع کی منتظر تھی۔ ادھر لوگ اس خوش ہنگی میں بتلار ہے کہ حریت پسندوں کو پابند سلاسل تو کیا جاسکتا ہے لیکن انھیں چنانی نہیں دی جاسکتی۔ دور فرنگی کی مثالیں ان کے سامنے تھیں لیکن قوم کی ساری خوش فہمیاں وہری کی وہری رہ گئیں۔ جب ہندوستان کی ہوشیار اور شاطر حکومت نے مقبول احمد بٹ کو ختم کرنے کے لیے لندن کے سفارتکار کے قتل کا بہانہ بنایا کہ انھیں

سوی پر لکا دیا اور قتل کا سارا الزام مقبول احمد بٹ پر منڈھ دیا۔ دنیا کے ہر مہذب ملک میں کسی کوموت کی سزا دینے سے پہلے اس کے لواحقین کو آخری بار ملاقات کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کی ظالم اور جابر حکومت نے اس بنیادی انسانی حق کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے مقبول احمد بٹ کے برادر اصغر کو بھائی سے ملنے سے پہلے گرفتار کر لیا۔ سکندری اور سفرا کی کا یہ مظاہرہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ کشمیری قوم کے عظیم ہیرود کے جسد خاکی کو ان کے دکاء کے حوالے کرنے کی بجائے جیل کے کسی گمانام گوشے میں گڑھا کھود کر دبادیا گیا۔ غالباً ہندوستانی حکومت یہ سمجھتی کہ مقبول احمد بٹ کو سیاسی اتفاق سے ہٹا دینے سے کشمیر کی آزادی کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے دن ہو جائے گا۔ کیا ایک حریت پسند مجاہد کی پھانسی کشمیر کے ایک کروڑ فرزندان کشمیر کی پھانسی ہے؟ کیا ایک مجاہد کو دن کر دینے سے کشمیر کے ایک کروڑ فرزندان دن کر دیئے گئے ہیں؟ مقبول احمد بٹ ایک فرد ہی نہیں کشمیر کی ایک آواز تھا جو آج بھی کشمیر کے دونوں حصوں کی وادیوں میں گونج رہی ہے۔ مقبول احمد بٹ ایک شعلہ تھا جس کی چنگاریاں ہندوستان کے ارباب اقتدار کے آشیانوں کو نوالہ بنانے کے لیے اب بھی لپک رہی ہیں۔ مقبول احمد بٹ ایک بھلی تھا جو ایک نہ ایک دن نئی دہلی کے خرمن امن کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ مقبول احمد بٹ آج ہم میں نہیں ان کی جگہ خالی ہے اور خالی رہے گی اس لیے کہ مصلحتوں اور خود غرضیوں کے اس بازار میں شہرت اور پبلسٹی کے بھوکے لوگ تو بہت ملیں گے جو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے لوگوں کے دل موبہ لینے کے پورے ہتھکنڈے استعمال کریں گے ان میں لفاظی تو ہو گی مگر مقبول احمد بٹ کی سی لگن تڑپ، جرأت، جنون اور طبع کی سرز میں میں خود پہنچ کر قربانی پیش کرنے کا جذبہ دور دور تک نظر نہیں آسکا۔

اقبال کا یہ شعر مقبول احمد بٹ جیسے عظیم شہیدوں ہی کے لیے لکھا گیا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا



مقبول بٹ شہید

کچھ یاد میں..... کچھ باتیں

امان اللہ خان

شہید کشمیر مقبول بٹ جدید کشمیر کے عظیم ترین فرزندوں میں سے ایک تھے۔ کشمیر کے اس عظیم فرزند کی زندگی کے حالات، حصول آزادی کے لیے جدوجہد کی تفصیلات، جدوجہد آزادی سے متعلق ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی وضاحت اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے طرزِ عمل کی تفصیلات اہل کشمیر کے لیے بالعموم اور جدوجہد آزادی کے علمبردار کشمیریوں کے لیے بالخصوص ایک اہم مشعل راہ کا کام دے سکتی ہیں۔ شہید کشمیر سے متعلق ان ہی معلومات کو جن کا میں خود یعنی شاہد ہوں انتہائی خنثیر پیرائے میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہوں۔

میں جب مقبول بٹ شہید کے ساتھ بیس سال سے زائد مدت پر چھلی اپنی ذہنی اور سیاسی رفاقت کے دوران کے حالات اور واقعات کی روشنی میں اسے انسانی عظمت کی ان انتہائی سخت کسوٹیوں پر پرکھتا ہوں تو وہ میرے سامنے عظمت کا ایک اونچا مینار نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً عظیم تھا۔

1962ء میں ہونے والے آزاد کشمیر کے صدارتی انتخابات کے دوران صدارتی امیدوار کے اتیخ خورشید کے جماعتی کی حیثیت سے مقبول بٹ کا نام اخبارات میں آتا رہا۔ اس کے بعد آزاد کشمیر اسٹیٹ کونسل کے لیے کراچی سے منتخب ہونے والے ممبر خواجہ غلام محمد لون پشاور سے ہو کر کراچی پہنچنے تو انہوں نے مجھ سے اور دوسرے احباب سے مقبول بٹ، ان کی اعلیٰ تعلیم اور ان کی صلاحیتوں کا ذکر کیا۔ کچھ مدت بعد میں پشاور گیا تو بٹ صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی، میں نے ان کی خصیت میں ایک خاص کشش پائی، ایک ہی ملاقات کے بعد ہم ذہنی اور سیاسی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اپریل 1965ء میں سیالکوٹ میں ہونے والے محاذ رائے شماری کے پہلے کنوش میں وہ

اس کے مرکزی پہلوی سیکرٹری منتخب ہو گئے اور جب مجاز کے مرکزی عہدے داروں نے سوچیت گزہ جا کر مقبوضہ کشمیر کی مٹی ہاتھ میں لے کر حصول آزادی کے لیے جان تک کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرنے کا حلف اٹھایا تو بجز مقبول بٹ سب جذبات سے مغلوب زار و قطار رور ہے تھے لیکن مقبول بٹ کے چہرے پر جذباتیت کے بجائے سنجیدگی تھی۔ چیخ چیخ کروتے ہوئے حلف اٹھانے والوں میں سے اکثر تو بعد میں اس عہد کو بھول گئے لیکن جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے دل کی گہرا یوں سے اور انہائی سنجیدگی سے حلف اٹھانے والے نے حلف کی لاج رکھی اور آخر میں حلف پر عمل کرتے ہوئے اپنی جان مادر وطن کی آزادی کی راہ میں قربان کر دی۔

یہ ہے قول فعل میں مکمل ہم آہنگی رکھنے والے عظیم انسانوں کا طرہ امتیاز۔ حلف اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں اس پر پوری طرح عمل کرنا عظیم انسانوں کا ہی شیوه ہے۔

این۔ ایں۔ ایف یعنی جموں کشمیر نیشنل بریشن فرنٹ جس نے تحریک آزادی کشمیر میں مسلح جدو جہد کے عضو کو 1949ء کی جنگ بندی کے بعد دوبارہ نئے سرے سے شامل کیا اور 1971ء میں بھارتی جہاز گنگا اگوا کرایا، نے 13 جولائی 1965ء کو میر پور میں ہونے والے مجاز رائے شماری کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس میں چند ایسے واقعات پیش آئے جن سے بٹ صاحب کو اور مجھے انہائی ناامیدی ہوئی۔ چنانچہ یومِ شہداء کشمیر کے سلسلے میں ہونے والے دوسرے دن جلسہ عام کے اختتام کے فوراً بعد ہم دونوں راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسی سفر کے دوران فیصلہ کیا کہ چونکہ تحریک آزادی کو انقلابی طریقے پر ڈالنے کے لیے مجاز رائے شماری مناسب ادارہ ثابت نہیں ہو سکتا اس لیے ایک ایسی زیر زمین تنظیم بنائی جائے جو ردا یتی سیاست سے بالاتر ہو کر تحریک آزادی کو مسلح جدو جہد کی انقلابی راہ پر ڈال دے۔ اس فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہم نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کئی گھنٹے تک تبادلہ خیال کیا آخر تنظیم کے قیام کے حق میں فیصلہ ہوا اور یہ بھی طے پایا کہ ہم دونوں اپنے حلقوں میں ہم خیال احباب کو اعتماد میں لے کر مجوزہ تنظیم کے قیام کی تیاری خاموشی سے کریں۔ میں نے بٹ صاحب سے کہا کہ وہ پشاور میں آزاد کشمیر فورسز کے ریٹائرڈ میجر امان اللہ خان کو اس سلسلے میں اعتماد میں لینے اور مجوزہ تنظیم میں شامل کرنے کی کوشش کریں۔ میجر صاحب بھارتی مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں

نے دوسری جنگ عظیم کے دوران سچاہش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو کر جاپانیوں سے گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کی تھی۔ کشمیر کی 1947ء کی جنگ آزادی میں بھی ان کا خاصا حصہ تھا اس سے پہلے ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ کیوں نہ ان کے فوجی اور ہمارے سیاسی تجربے کو ملا کر ایک انقلابی تنظیم بنائی جائے اور میں نے تجویز پر غور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ بٹ صاحب دوسرے دن پشاور چلے گئے اور میں میر پور آگیا۔

بٹ صاحب نے مجرماں اللہ سے بات کی تو وہ مان گئے۔ ادھر میں نے کراچی میں میر عبدالقیوم صاحب سے بات کی تو وہ بھی مان گئے۔ میر صاحب تحریک آزادی کے سلسلے میں ذاتی طور پر جذباتی ہونے کے علاوہ جموں کے ایک حریت پسند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ہم چاروں 12 اگست 1965ء کو پشاور میں اکٹھے ہو گئے اور جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے نام سے زیر زمین تنظیم کی تشكیل با قاعدہ طور پر عمل میں آئی۔ اس سے قبل میں نے الجزار کی انقلابی تنظیم ایف۔ ایل۔ این کے طریقہ کار اور تنظیمی ڈھانچے کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے میری تجویز پر ہماری تنظیم این۔ ایل۔ ایف کا تنظیمی ڈھانچہ بھی الجزار کی ایف۔ ایل۔ این کے ڈھانچے کی طرز پر بنایا گیا۔ یعنی تنظیم کو عہدوں کی بجائے شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ تنظیم کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے اپنے خون سے حلف اٹھایا۔

یہ حلف اٹھاتے وقت بھی بٹ صاحب کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی قابل دیدھی غالباً اس لیے کہ ان کے خون سے لکھے گئے یہ حروف تاریخ کشمیر کا ایک اہم باب بننے والے تھے۔

محاذ رائے ثماری سے ہماری وابستگی قائم تھی۔ 14 اگست 1965ء کو اول پنڈی میں محاذ کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ جس میں مقبوضہ کشمیر میں شروع ہونے والی گوریلا کارروائیوں پر بحث کے بعد ان کے بارے میں محاذ کا طرزِ عمل اور موقف متعین ہونا تھا۔ بٹ صاحب نے مقبوضہ کشمیر کے ٹوام کو اعتماد میں لیے بغیر ان گوریلا کارروائیوں کی ابتداء اور ان کے طریقہ کار پر سخت تنقید کرتے ہوئے پیش گوئی کی کہ ان کے نتیجے میں بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی جو زیادہ سے زیادہ تمدنی نہتے جاری رہے گی لیکن اس سے کشمیریوں اور پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

6 ستمبر 1965ء کو پاکستان اور بھارت میں جنگ شروع ہو گئی جو ڈھائی ہفتے جاری رہی اور بٹ صاحب کی پیش گوئی کے عین مطابق اس سے کشمیریوں اور پاکستان کو فائدے کی بجائے شدید نقصان ہی ہوا۔

نومبر 1965ء کے اوپر میں کراچی میں این۔ ایل۔ ایف کی سینٹرل کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں فیصلہ ہوا کہ مسلح جدو چہد اور سیاسی شعبوں کے سربراہ مقبوضہ کشمیر جائیں اور وہاں دونوں شعبوں میں ابتدائی تیاری کر کے واپس آئیں اور سینٹرل کمیٹی کو اپنی رپورٹ پیش کریں۔ جس کی روشنی میں سینٹرل کمیٹی آئندہ اقدام کا پروگرام مرتب کرے گی۔

بٹ صاحب کو میری چند مجبوریوں کا علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے تجویز پیش کی کہ میرے بجائے وہ خود مقبوضہ کشمیر جائیں گے اور سیاسی شعبے کا کام کریں گے، 10 جنوری 1966ء کو اعلانِ تاشقند کے مندرجات ریڈیو پاکستان اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے۔ اس روز بٹ صاحب کراچی میں میرے ہاں تھے۔ اعلان کے دوسرے ہی دن اس کے حق میں آزاد کشمیر کے لیڈروں کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے تو یہ بیانات پڑھ کر بٹ صاحب غصتے سے لال پیلے ہو گئے اور کہنے لگے۔

”جس قوم کو اس قسم کے لیڈر ملے ہوں اس کی قسمت میں غلامی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ ذاتی مفادات اور حاکم وقت کو خوش کرنے کے لیے غلامی کے طوق کو آزادی کا ہار گردانتے ہیں۔“

کچھ عملی مشکلات کی وجہ سے بٹ صاحب اور مسیح امان اللہ کے مقبوضہ کشمیر کے فیصلے پر چھ ماہ تک عمل نہ ہو سکا۔ مئی 1966ء میں بٹ صاحب کراچی آئے اور ان کے مقبوضہ کشمیر جانے کے پروگرام کو آخری شکل دی گئی اور فیصلہ ہوا کہ دونوں اول جوں میں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر مقبوضہ کشمیر جائیں۔ اس دورانِ گلگت کے ایک نذر نوجوان اور نگزیب اور مظفر آباد کے ریٹائرڈ صوبیدار کا لاخان جو 1947ء کی جنگِ آزادی کے دوران بھارتی فوجوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئے تھے، این۔ ایل۔ ایف میں شامل کیے گئے۔

بٹ صاحب کی کراچی سے روانگی کے دن میں انہیں الوداع کہنے کیسٹ ریلوے اسٹیشن تک گیا۔ گاڑی کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ہم دونوں پلیٹ فارم پر چھل قدمی کرتے ہوئے پروگرام کے

مختلف پہلوؤں پر تباہ لئے خیال کرتے رہے۔ جوں جوں گاڑی کی روائی کا وقت نزدیک ہو رہا تھا میری چینی صس کہہ رہی تھی کہ مقبول کے ہاتھوں تحریک آزادی میں دوبارہ جان پڑنے والی ہے۔ ساتھ ہی مجھ کو ان کی دو بیویوں اور تین بچوں (بیٹی بیٹی ان دونوں صرف نوماہ کی تھی جب کہ جاوید اور شوکت غالباً چھوڑا اور چار سال کے تھے) کا خیال آیا۔

اچانک غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا "مقبول! تم موت کے منہ میں جا رہے ہو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے بیوی بچوں کا کیا ہو گا؟"؟ ایسے موقعوں پر ایسے سوالات بڑوں بڑوں کو متزلزل کر دیتے ہیں لیکن بٹ صاحب کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ اُبھر آئی۔ آہستہ سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے پلیٹ فارم کے کنارے لے گئے اور دور سے آتی ہوئی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"وہ جو گاڑی آرہی ہے عین ممکن ہے اس کے ہمارے نزدیک پہنچتے ہی میں پلیٹ فارم سے پھسل کر پڑوی پر گرجاؤں اور گاڑی میرے جسم کے نکلے کرتے ہوئے آگے نکل جائے یا ممکن ہے کل کسی اور حادثے کا شکار ہو جاؤں یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں ہو کر ہپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤں، تینوں صورتوں میں بے مقصد مردوں گا اور تینوں میں میرے بیوی بچوں کو کسی نہ کسی طرح زندگی بسر کرنی ہی ہوگی۔ اس لیے کیوں نہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جان دے دوں اور ہمارے لیے قوی آزادی سے بڑا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔"

اس قسم کے سوال کا ایسا جواب مقبول جیسے عظیم انسانوں کی طرف سے ہی ہو سکتا ہے۔ کاش ایک گروہ انسانوں پر مشتمل یہ قوم صرف چند ہزار مقبول بٹ پیدا کرتی، صدیوں سے اس کے پاؤں میں پڑی غلامی کی زنجیروں اور گلے میں پڑے غلامی کے طوق سے نجات صدیوں یا عشروں کی نہیں سالوں کی بات ہوتی۔

بٹ صاحب اور ساتھی جون 66ء میں مقبوضہ کشمیر چلے گئے۔ تین ماہ تک وہاں خاموشی سے کام کرنے کے بعد آزاد کشمیر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ بھارتی فوج کا ایک کشمیری ائمیلی جس افراد مر چند اور نگز زیب کے ہاتھوں قتل ہوا جس کے بعد بھارتی فوج نے سو مرلے میل علاقے کو گھیرے میں لے کر چھپ چھپ چھان مارا۔ آخر بٹ صاحب، اور نگز زیب، کالاخان اور میر احمد گھیرے میں آگئے۔

مکان کے اندر سے فائزگر کے اور نگزیب اور کالا خان نے متعدد بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ آخران کا اسلحوں تھم ہو گیا تو اور نگزیب خبر ہاتھ میں لیے باہر نکلا، بھارتی اسے زندہ پکڑنا چاہئے تھے اس لیے اس پر گولی نہیں چلائی لیکن جب خبر سے اور نگزیب نے کئی فوجیوں کو موت کے گھاٹ آتھا تو بھارتیوں نے برین گن کے ایک ہی برست سے اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے۔ ادھر کالا خان بھی رُخی ہو گیا اور بٹ صاحب اور میر احمد بھی گرفتار ہو گئے۔ بٹ صاحب گرفتار کر کے سری نگر لے جائے گئے۔ جہاں دو سال کے بعد انھیں اور میر احمد کو سزاۓ موت اور کالا خان کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ لیکن اس سزا پر عمل ہونے سے پہلے ہی بٹ صاحب اور میر احمد دسمبر 1968ء میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر کئی گز برف میں فلک بوس پہاڑ عبور کر کے آزاد کشمیر سولہ دن کے بعد پہنچ گئے۔

غالباً وسط 1969ء کا واقعہ ہے بٹ صاحب کراچی میں تھے۔ ایک شام میرے دفتر میں بیٹھے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے شبینہ کالج کے تاریخ و سیاست کے پیکھر روز غیر حاضر ہیں۔ میں نے مذاقاب بٹ صاحب سے کہا کہ وہ غیر حاضر پیکھر روز کی کلاسیں لیں۔ بٹ صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اٹھے کلرک سے غیر حاضر پیکھر روز کا نامم ثیبل لیا اور کلاس میں چلے گئے۔ چھٹی کے بعد ہر اس کلاس کے طلباء کے وفد جسے بٹ صاحب نے پڑھایا تھا میرے دفتر میں آئے اور مجھ سے مطالبة کرنے لگے کہ بٹ صاحب کو کالج میں مستقلانہ پیکھر مقرر کیا جائے۔ یہ بٹ صاحب کے اعلیٰ اندازِ تدریس اور ان کی شخصیت کی جاذبیت کا نتیجہ تھا۔ ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔

1970ء میں ہم تحریک کے سلسلے میں گلگت میں غیر معمولی سردی تھی۔ صبح نیند سے جا گے تو دیکھا کہ بٹ صاحب غائب ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میر ایک عزیز آیا اور مجھ سے کہنے لگا آپ کا دوست انسان ہے یا جن؟ وہ اس وقت دریا میں تختہ پانی میں نہارہا ہے۔ بٹ صاحب کی صفائی پسندی انھیں خطرناک ہم پسندی تک لے جاتی تھی۔

1970ء ہی میں ہم نے ہاشم قریشی کو جہاز ہائی جیک کرنے کی تربیت دلا کر مقبولہ کشمیر واپس بھیج دیا تھا۔ پروگرام کے مطابق بھارتی جہاز کو اگست میں ہائی جیک کیا جانا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ادھر نومبر میں مجھے گلگت میں گرفتار کیا گیا اور بٹ صاحب کو جہاز کے ذریعے راولپنڈی بھیج دیا گیا

پھر ہمیں جیل بھیج دیا گیا اس دوران بیرونی دنیا سے ہمارا رابطہ بالکل منقطع رہا اور اسی دوران بھارتی چہار گناہ انواع ہوا جس کی خبر مجھے پانچ دن بعد اس وقت ملی جب جہاز جلا یا بھی جا پکا تھا، خبر بھی ایک عام قیدی نے ایک کاغذ کے پڑے کے ذریعے کسی طرح مجھ تک پہنچائی تھی۔

ہائی جیکنگ کے اصل پروگرام کے مطابق ہائی جیکنگ کے بعد اس سے متعلق سیاسی اور سفارتی معاملات سے نہ نتا میری ذمہ داری تھی لیکن میری اسیری کی وجہ سے یہ ذمہ داری بھی بٹ صاحب کے سر پر رہی لیکن انہوں نے جس مہارت کے ساتھ اپنی اصل ذمہ داری کے علاوہ میری ذمہ داریوں کو بھی بھایا وہ ان کی اعلیٰ سیاسی اور سفارتی مہارت کا جیتا جاتا ثبوت تھا۔ البتہ ان کی مردود بھری طبیعت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی ایک بڑی پارٹی کے کچھ سیاست کاروں نے ان کے گرد حلقہ پاندھ دیا جس سے بٹ صاحب کے اپنے کچھ ساتھی ان سے دور ہو گئے اور یہ دوری بعد میں کچھ تینوں کا موجب بندی۔

بھارتی چہاز گناہ کی ہائی جیکنگ کے سلسلے میں سوادوسال کی اسیری کے دوران جب بھی وہ اپنے دوسرے اسیر ساتھیوں غلام محمد لوں، میر قیوم، میر عبد المنان، ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے ساتھ عدالت میں پیش ہوتے وہاں ان کا طرز عمل نہایت باوقار ہوتا، اپنی نشست پر انہیانی وقار کے ساتھ بیٹھتے اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرتے جس سے ان کے مجاہدانہ وقار پر حرف آنے کا احتمال ہو۔ استغاش کے گواہوں کے بیانات کے دوران (استغاش کے بہت سے گواہ بٹ صاحب کے قربی جانے والے تھے) جب یہ کرائے کے گواہ بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں پر انہیانی سنگین قسم کے بے بنیاد الزامات لگاتے تو بٹ صاحب کے چہرے پر غصے کی بجائے ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے نہ تو کبھی جیل میں سہولتوں کی بھیک مانگی نہ جیل حکام کے غلط رویے کا رد نہ کیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کی پریم کورٹ کے نجج بھی بٹ صاحب کی باوقار خصیت سے بہت متاثر تھے۔

مئی 1973ء میں بٹ صاحب اور ان کے ساتھی گناہ کیس سے بری ہو گئے البتہ ہاشم قریشی کو طویل مزادی ملنی۔

1980ء میں بربپشن فرنٹ کے ایک اہم عہدہ دار حاجی غلام سرور صاحب کسی نجی کام سے

برطانیہ سے بھارت گئے جہاں انہوں نے تہاڑ جیل میں بٹ صاحب سے ملاقات کی۔ غلام سرور صاحب کا کہنا ہے کہ 45 منٹ کی اس ملاقات کے دوران بٹ صاحب نے اپنے بیوی بچوں اور اپنے کیس سے متعلق معاملات پر زیادہ پانچ منٹ صرف کیے اور باقی چالیس منٹ صرف تحریک آزادی کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے رہے۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ وہ طبعی موت سے نہیں ڈرتے البتہ جس دن کشمیری عوام نے ناساعد حالات سے متاثر ہو کر جدوجہد آزادترک کی وہ دن یقیناً ان کی موت کا ہوگا۔ اپنے ساتھیوں کے لیے ان کا بھی پیغام تھا۔

تحریک آزادی کے سلسلے میں انہوں نے مجاہد خیز سرزی میں پونچھ، گلگت بلستان سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان دو علاقوں کے عوام نے 1947ء میں آزاد کشمیر بشمول گلگت بلستان کی آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ دوسرے حریت پسندوں کی طرح بٹ صاحب بھی اس بات کے انتہائی شاکی تھے کہ مجاہدین پونچھ کی اعلیٰ جنگجو یانہ صلاحیتوں اور حریت پسندانہ جذبات کو تحریک آزادی کے بجائے اقتدار کی سیاست کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب کہ گلگت بلستان کے عوام کو تحریک آزادی اور کشمیری سیاست سے جبراً دور رکھا گیا ہے۔

ستمبر 1966ء اور مئی 1972ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں اور جنوری 1969ء میں سری نگر جیل سے فرار ہو کر آزاد کشمیر آنے پر گوجرہ قلعہ مظفر آباد میں اور اپریل 1971ء کے بعد کئی ماہ تک شاہی قلعہ لاہور میں بٹ صاحب جس بربریت کا نشانہ بنے اس کی تفصیلات دوسرے ذرائع سے جس شخص تک پہنچیں اس کے روگھنے کھڑے ہو گئے لیکن خود بٹ صاحب کے منہ سے یا قلم سے ایک بات بھی نہیں نکلی۔ جب بھی کوئی پوچھتا کہ ان پر سری نگر، مظفر آباد اور لاہور میں کیا گزری وہ اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ موضوع ہی بدل دیتے ہیں۔

چجھے عظیم انسان عظیم مقاصد کے لیے عظیم قربانیاں دے کر اور مصائب برداشت کر کے ان کا ذہن ہمارا نہیں پیشتے۔

11 فروری 1984ء کو صبح سویرے جب بٹ صاحب کو تہاڑ جیل والی میں تختہ دار کی طرف لے جایا گیا تو وہ انتہائی سکون اور وقار کے ساتھ چل کر پھانسی کے پھندے تک پہنچے۔ پھانسی کی رسی کو

چہما اور مادرِ وطن کی آزادی پر اپنے آپ کو قربان کر کے امر ہو گئے۔ یہ تمیٰ ان کی عظمت کی معراج افرض مقبول بٹ شہید نے کشمیریوں کی قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد کے سلسلے میں جام شہادت نوش کر کے تاریخ کشمیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی تحریک آزادی کی تواریخ میں بھی اپنے لیے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ان کے کردار کی پختگی، اعلیٰ جذبہ حب الوطنی، جہد مسلسل کی عادت، جرأت و بہادری، اعلیٰ جذبہ ایثار و قربانی، اصول پرستی و حق گوئی اور ان کے انقلابی طرز فکر اور طرز عمل نے انھیں اعلیٰ مقام کا پوری طرح مستحق بنادیا۔

یہیج ہے کہ عظیم انسان عظیم مقاصد کے لیے عظیم قربانیاں دے کر اور مصائب برداشت کر کے ان کا ڈھنڈو رانہیں پیٹتے مقبول بٹ اس سلسلے میں بھی عظیم تھا۔ اقبال کے دو اشعار۔

—

پرواز ہے دونوں کی ایک ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

نگاہ بلند ، سخن دل نواز ، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے
اُن پر فٹ آتے ہیں مقبول بٹ اقبال کے شاہین اور میر کارواں کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔
(روزنامہ جنگ)



مقبول بٹ شہید

افکار و نظریات

جی۔ ایم۔ میر (میرپور)

مقبول بٹ شہید کی زندگی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ آج کے اس مضمون میں ہم ان کی آئیڈیا بوجی، ان کے مشن اور ان کی سیاسی، عسکری جدوجہد کے مقاصد پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے، تاکہ موجودہ نوجوان پوڈ اور آنے والی نسلیں شہید کشمیر کے واضح اور بے داغ نظریات کی روشنی میں اپنے عمل کا جائزہ لے سکیں۔ اپنی منزل کا تعین کر سکیں اور منزل تک پہنچنے کے لیے صحیح لا جعل کا انتخاب کر سکیں۔

مقبول بٹ شہید اول و آخر ایک سچے قوم پرست را ہمata تھے۔ خاکِ وطن کا ہر ذرہ ان کے لیے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔ پوری کشمیری قوم کو وہ اپنا خاندان اپنا کنبہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے وطن عزیز کی وحدت و سالمیت کا تحفظ اور بلا لحاظ مذہب و ملت اپنی قوم کے لیے آزادی و خود مختاری کا حصول ہمیشہ ان کی تمام تر جدوجہد کا محور رہا۔ قوم پرستی اور قومی آزادی کے حوالہ سے انہوں نے دنیا کی مختلف تحریکوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ عمومی جمہوری یہ چین، الجزاائر اور فلسطین کی تحریک آزادی سے خاص طور پر بہت متاثر تھے اور انہی خطوط پر اپنی تحریک کو استوار کرنا چاہتے تھے۔ کشمیر کی تحریک آزادی ان کی نظر میں کسی ایک فرقے یا علاقے کی نہیں بلکہ یہ پوری کشمیری قوم کی تحریک تھی۔ یہ کوئی کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی بلکہ ایک مظلوم و مجبور قوم کی ظالم اور جابر حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ مادرِ وطن جموں کشمیر کو اقوامِ عالم میں باعزت مقام دلا کر اس پورے بر صیغہ کو امن کا ایک ایسا گھوارہ بنانا چاہتے تھے جس میں اس خطے کے تمام ممالک برابری کی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کر کے تعمیر و ترقی کی بلند یوں کوچھوں سکیں۔ وہ انسانیت اور انسان کی عظمت کے قابل تھے۔ شہادت سے قبل ایک صحافی کو

انڑو یو دیتے ہوئے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کس چیز پر یقین رکھتے ہیں۔ ”انھوں نے فی البدیہہ کہا تھا۔ بنی نوع انسان کی مساوات جس میں سماجی انصاف میسر ہو،“ اسی انڑو یو میں جب ان سے ان کے پسندیدہ شعراء کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو انھوں نے غالب، اقبال، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری اور فراق گورکھ پوری کا نام لیا۔ یہ سب شعراء زندگی میں حرکت، حرارت، جدت، ترقی پسندی اور انقلاب کے نقیب ہیں۔ چنانچہ اس سے مقبول بٹ شہید کے فلسفہ حیات اور ذہنی رجحان کا پتا چلتا ہے۔

اب ہم شہید کشمیر کی سیاسی زندگی کے مختلف مراحل کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے نکتہ نظر کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

پاکستان آ کر مقبول بٹ شہید کی سیاسی زندگی کا آغاز 1961ء میں اس وقت ہوا جب انھوں نے پشاور شہر سے بنیادی جمہوریت کے نظام کے تحت وادی کشمیر کی مہاجرنشت پر انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال منعقد ہونے والے آزاد کشمیر کے انتخابات میں انھوں نے صدارت کے لیے کے۔ ایم۔ خورشید (مرحوم) اور سٹیٹ کوسل کی رکنیت کے لیے جی۔ ایم۔ لوں (مرحوم) کی حمایت میں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اس طرح ان دونوں حضرات سے ان کے گھرے مراسم قائم ہو گئے۔ خاص طور پر جی۔ ایم۔ لوں سے فکری ہم آہنگی اور نظریاتی تعلق خاطر پیدا ہو گیا۔

اسی دور میں مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے پاکستان اور بھارت کے وزراء خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، (مرحوم) اور سردار سورن سنگھ کے مابین مذاکرات کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب ریاست جموں کشمیر کو تقسیم کرنے کی تجویزیں سامنے آنے لگیں۔ ان میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ریاست کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جاوے۔ مادرِ وطن کی ان بندربانٹ کی تجاویز نے محب وطن عوام میں شہد بد رہ عمل پیدا کر دیا۔

چنانچہ 1962ء میں جی۔ ایم۔ لوں (مرحوم) کی سربراہی میں کشمیر انڈی پینڈنٹس کمیٹی (KIC) کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی کا نصب اعین ریاست جموں کشمیر کی وحدت کا تحفظ اور ریاست کی مکمل آزادی و خود مختاری کا حصول تھا، مقبول بٹ شہید اس کمیٹی میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس کمیٹی

کے ارکین میں خواجہ غلام نبی گلکار (مرحوم) قاضی خورشید عالم (مرحوم) ملک عبدالحمید (موجودہ چیف جسٹ آزاد کشمیر ہائی کورٹ)، ذاکر غلام احمد جراح، میر عبدالقیوم، میر عبدالعزیز، مدیر (انصاف) میر عبدالرشید، عبدالحالق النصاری ایڈ ووکیٹ، ایم اے فاروق ایڈ ووکیٹ، امان اللہ خان، محمد سعید شاہ نازکی، علی محمد ملک، مجید امجد بٹ وغیرہ شامل تھے۔

اپریل 1965ء میں سیالکوٹ میں جموں کشمیر مجاز رائے شاری کا قیام عمل میں آیا اور کشمیر انڈی پینڈنس کمیٹی کے تقریباً سبھی ارکین اس میں شامل ہوئے نئی جماعت کے مقاصد میں پچاسی ہزار مرلے میل پر پھیل ہوئی ریاست کی وحدت و سالمیت کا تحفظ اور ریاستی عوام کے لیے خالصتاً قوم پرستی اور غیر فرقہ وار انہ بندیاں پر حق خود اختیاری کی تحریک کو منظم کرنا شامل تھا۔ مقبول بٹ شہید کو اس جماعت کا پبلنی سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

1965ء میں ہی پاک بھارت جنگ چھڑ گئی تو ایک محض وطن کشمیری کی حیثیت سے بٹ صاحب نے اپنی ملازمت اور گھر بار کو خیر باد کہا اور مظفر آباد پہنچ کر حکومت کو اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن کئی روز انتظار کرنے کے بعد انہیں جواب دیا گیا کہ ان کی پیشکش کو اعلیٰ حکام کی منظوری حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے ارباب اقتدار اس جنگ کو اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر اپنے طور پر ہی جاری رکھنا چاہتے تھے اور کسی ایسے قوم پرست کشمیری کا اس میں شریک ہونا انھیں گوارانہ تھا۔ جو کشمیر کی تحریک آزادی کو کشمیریوں کے ہاتھ میں رکھنے کا قائل ہو۔

آپریشن جبراٹر کی ناکامی کے بعد اعلانِ تاشقند نے کشمیری عوام میں ماہی کی لہر دوڑادی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کشمیریوں کو باعزت مقام حاصل کرنا ہے تو جدوجہد آزادی کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔ چنانچہ مقبول بٹ شہید کی قیادت میں 1966ء میں جموں کشمیر قومی مجاز آزادی (JKLF) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد بھی قومی آزادی و خود مختاری کے لیے کشمیر کی نوجوان نسل کو عسکری لحاظ سے تیار کرنا تھا۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شہید مقبول بٹ چند ساتھیوں کے ساتھ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے اور کئی ماہ تک وہاں مصروف کار رہے۔ ستمبر 1966ء میں ایک جاسوس کی مخبری پر پولیس نے اس گروپ کو گھیرے میں لے لیا۔ مقابلہ ہوا جس میں گروپ کا

ایک نوجوان اور نگزیر ب شہید ہو گیا اور بٹ صاحب سمیت دوسرے ساتھی گرفتار ہوئے۔ کئی ماہ تک مہتاب باغ کے عقوبت خانے میں تشدد کے مراحل سے گزرنے کے بعد ان پر مقدمہ چلا جس میں پولیس بٹ صاحب کے ایک ساتھی عبداللہ دار کو سلطانی گواہ بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ ڈیڑھ سال مقدمہ چلنے کے بعد خصوصی عدالت نے 18 اگست 1968ء کو مقبول بٹ شہید کو سزاۓ موت اور ان کے دوساریوں کو عمر قید کی سزا سنادی۔ چار ماہ بعد بٹ صاحب دوساریوں کے ہمراہ جیل توڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کئی ہفتوں کے طویل اور صبر آزماسفر کے بعد سرفلک برپوش پہاڑوں کو عبور کر کے آزاد کشمیر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں نئے سرے سے گرفتاری اور تشدد کے اذیت ناک مرطبوں سے گزرنے کے بعد آخر کار مارچ 1969ء میں انھیں رہا کر دیا گیا۔

اور انھوں نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ نومبر 1969ء میں انھیں محاذ رائے شماری کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس موقع پر کونشن کے آخری اجلاس میں خطاب کے دوران انھوں نے اپنا سیاسی فلسفہ بیان کرتے ہوئے کشمیری عوام کو الگزائر اور فلسطین کی تحریک آزادی کو اپنے لیے نمونہ بنانے کا مشورہ دیا۔ ان دونوں ممالک کی تحریکوں پر نظر ڈالیں تو دونوں باتیں نمایاں طور سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ یہ دونوں تحریکیں قوم پرستی کی بنیاد پر چلائی گئیں نہ کہ مذہبی بنیادوں پر، دوسری بات یہ دونوں تحریکیں مکمل آزادی و خود مختاری یعنی قومی ریاستوں کے قیام کے لیے تھیں، کسی پڑوسی ملک کا حصہ بننے کے لیے نہیں۔ ان دونوں ممالک کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن انھوں نے کسی موقع پر اپنی جدوجہد کو مذہبی رنگ نہیں دیا۔ الگزائری عوام نے منیش القوم فرانسیسی تسلط کے خلاف جدوجہد کی اور کامیاب ہو گئے۔ فلسطینی عوام بھی منیش القوم اسرائیلی جارحیت کے خلاف مصروف جدوجہد ہیں اور اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔

محاذ کے صدر منتخب ہونے کے بعد سیالکوٹ کے مقام پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بٹ صاحب نے ایک بار پھر اپنے سیاسی موقف کی ان الفاظ میں وضاحت کی۔

”بھیثیت ایک قوم کے ہمارا یہ حق ہے کہ ہم اپنے ملک کا مستقبل جس طرح چاہیں بنائیں بھیثیت ایک قوم کے کشمیریوں پر کوئی قید نہیں ہو گی۔ کتنے یہ فیصلہ کرنا ہے یا وہ فیصلہ کرنا ہے۔ بلکہ

جب وہ وقت آئے گا۔ اسی وقت یہ ہماری مرضی ہوگی ہماری قوم کی مرضی ہوگی۔ من جیسے اقوام ہمارے عوام کی اکثریت کی مرضی ہوگی۔ کہ جس قسم کا مستقبل جو بھی مستقبل وہ اپنی ریاست کے لیے اپنے وطن کے لیے مناسب سمجھتے ہیں اسی طریقہ پر اپنے ملک کا فیصلہ کریں گے۔

ظاہر ہوا کہ شہید کشمیریوں کو محض عوام کا ایک ہجوم نہیں بلکہ مسلمہ طور پر ایک قوم اور جموں کشمیر کی سر زمین کو محض زمین کا ایک خطہ نہیں بلکہ ایک ملک تصور کرتے تھے۔ وہ اس جنت نظری ریاست کو حقیقی معنوں میں جنت ارضی بنانا چاہتے تھے جس میں رہنے والے تمام لوگ آپس میں پیار محبت بھائی چارے اور دوستی کے اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل ہوں۔ جہاں نفرتوں تنگ نظری، فرقہ پرستی سے پاک معاشرہ امن عالم کے لیے ایک نمونے کا کردار ادا کرے۔

بہشت آنجا کہ آزادے نہ باشد

کے را با کے کارے نہ باشد

انہی اعلیٰ وارفع اقدار کی خاطر امن و آزادی اور انسانیت کی سربلندی کے لیے وہ ساری عمر مصروف پیار رہے اور انہی عظیم مقاصد کی راہ میں انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

مقبول بٹ شہید کو کشمیر کی تاریخ پر خاصاً عبور حاصل تھا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کشمیری قوم کے مزاج اور کردار کی تخلیق میں مختلف مذاہب جن میں بدھ مت، جین مت، شیعومت ہندومت اور اسلام نے گھرے اثرات ڈالے ہیں۔ اسلام یہاں حکمرانوں اور فاتحین کی یلغار کے نتیجے میں نہیں بلکہ درویشوں اور مبلغوں کی کوشش سے امن سلامتی اور بھائی چارے کا پیغام بن کر آیا۔ اور پوری ریاست میں پھیل گیا۔ کشمیر شیوں اور ولیوں کی سر زمین ہے جو ہمیشہ پیار محبت اور رواداری کا درس دیتے رہے ہیں۔ بٹ صاحب کی نظر میں ظالم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ظالم صرف ظالم ہوتا ہے۔ وہ اکثر ویژت اپنی تقاریر میں افغانوں کے دور حکومت کا ذکر کرتے ہوئے افغان گورنر چراغ بیگ کا ذکر پوری تفصیل سے کیا کرتے تھے جس نے ریاست کی حدود میں داخل ہوتے ہی کسی جنازے کو روک کر مریت کے کان کاٹ لیے تھے۔ جب کسی نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا ”یہ مردوں کو خبر دے گا کہ کشمیر میں چراغ بیگ آگیا ہے، زندوں سے تو میں خود نپٹ لوں گا“۔

1970ء کے سال کو گلگت بلستان کے عوام کے حقوق کی خاطر مقبول بٹ شہید کی جدوجہد ہا سال قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں پھر وہی ریاست کی وحدت اور سالمیت کا سوال سامنے آتا ہے۔ پاکستان کی بیوروکریسی نے 1947ء سے ہی گلگت بلستان کے وسیع علاقے کو آزاد کشمیر سے جدا کر کے ایک طرف ریاست کی سالمیت کو زک پہنچائی تھی دوسری طرف اس علاقے میں رہنے والے لاکھوں عوام کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ آزاد کشمیر کی سیاسی جماعتیں اس طرف آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں۔ بٹ صاحب نے پہلی بار اس طرف توجہ دی چنانچہ ان کی قیادت میں ہفتہ گلگت بلستان منا کر آزاد کشمیر اور پاکستان بھر میں ان مسائل پر آواز بلند کی گئی۔ بٹ صاحب نے اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ دوبار گلگت کا دورہ کیا۔ دونوں بار انھیں گرفتار کر کے جریye طور پر وہاں سے واپس بھیج دیا گیا۔ تاہم اس جدوجہد کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ حکومت پاکستان گلگت و بلستان کے عوام کی اشک شوئی کے لیے ایک کوسل بنانے پر مجبور ہو گئی۔

1971ء کا سال نئی آزمائشیں لے کر آیا۔ گنگا کے انواع کے بعد شہید کشمیر کو سیکڑوں کارکنوں اور ساتھیوں سمیت ایک سازش کے تحت مہینوں تک مختلف اذیت گاہوں میں انسانیت سوز اور شرمناک تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ حکومت انھیں بھارت کا ایجنت ثابت کرنا چاہتی تھی۔ تم ظریفی کی بات یہ ہے کہ مقبول بٹ شہید پر بھارتی حکومت نے جو مقدمہ سری نگر میں قائم کیا تھا اس میں اور بہت سی دفعات کے علاوہ تعزیرات ہند کی دفعہ B 120 اور انہی ایجنس آرڈیننس مجریہ 1943 شامل تھے اور حکومت پاکستان نے جو مقدمہ اُن پر لاہور میں چلایا اُس میں بھی علاوہ دیگر دفعات کے تعزیرات پاکستان دفعہ B 120 اور انہی ایجنس آرڈیننس مجریہ 1943 شامل تھے۔ دونوں ملکوں میں اس عظیم بطل حریت پر ”دشمن“ کے ایجنت کی حیثیت سے کام کرنے، حکومت کے خلاف بغاوت کرنے، بغاوت پر اسکانے اور قومی سلامتی کو خطرے میں ڈالنے کی سازش کے الزامات شامل تھے۔ ان الزامات کو ثابت کرنے کے لیے دونوں حکومتوں نے اپنی اپنی اذیت گاہوں میں انھیں ہولناک تکدد کے مراحل سے گزارا۔ سری نگر کے مہتاب باغ مظفر آباد کے بلیک فورٹ اور لاہور کے شاہی قلعہ کی اذیت گاہوں کا ذکر انہوں نے پاکستان کی خصوصی عدالت میں ان الفاظ میں کیا۔

”مجھے، ذاتی طور پر تشدد کے قیم ادوار سے گزرنما پڑا۔ یہ دور میری اسیری کے ان ایام پر مشتمل ہیں جن میں مجھے مقبوضہ کشمیر کے قابض حکام، آزاد کشمیر میں معین ایف آئی یو کے گشاپو قسم کے فوجی افسران اور آخر میں لاہور کے رسوائے زمانہ شاہی قلعہ کے پولیس افسران سے پوچھ چکھے اور تحقیقات کے دوران واسطہ پڑا ہے۔ تینوں مقامات پر مجھ پر کیے جانے والے تشدد کے مقاصد بھی بالکل مختلف تھے مقبوضہ کشمیر میں مجھ پر اس لیے تشدد کیا گیا کہ قابض حکام میری ذات اور تحریک کے بارے میں حقائق کی تلاش میں تھے۔ مظفر آباد کے ایف آئی یو کو حقائق کی تلاش نہ تھی البتہ وہ پہلے سے قائم کیے ہوئے مفروضات کے بارے میں مجھ سے تائیدی شہادت چاہتے تھے۔ اور شاہی قلعہ لاہور کے گشاپو صرخ جھوٹ کہلوانا چاہتے تھے اور ایک طے شدہ سازشی منصوبہ کی تجھیں کے لیے مجھ سے اپنی مرضی کے بیان دلوانا چاہتے تھے۔“

سری نگر جیل کے اندر قائم خصوصی عدالت میں استغاشہ مذکورہ الزامات میں سے تو کوئی بھی الزام ثابت نہ کر سکا البتہ ایک اٹھیلی جنس افسر کے قتل کے جھوٹے الزام میں دفعہ 302 کے تحت سزاۓ موت منادی گئی۔ ادھر لاہور کی خصوصی عدالت میں مقبول بٹ شہید پر لگائے گئے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے پولیس نے ان کے کئی ساتھیوں کو ان کے خلاف استعمال کیا۔ سری نگر جیل سے فرار کے واقعہ کو مشکوک بنانے کے لیے ان کے ایک ہمراہی سے یہ بیان دلوایا گیا کہ جیل کی دیوار میں کیا جانے والا سوراخ اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں سے بلی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔ لیکن ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود استغاشہ کے تمام الزامات بے بنیاد ثابت ہوئے حتیٰ کہ خصوصی عدالت اپنے فیصلے میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئی کہ جو کہانی استغاشہ نے بیان کی ہے اگر اس کی تائید میں معمولی سی شہادت بھی ہوئی تو جیل سے فرار کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن استغاشہ اپنے موقف کو ثابت کرنے میں بالکل ناکام رہا ہے۔ خود شہید کشمیر مقبول بٹ ان الزامات کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ ان ہی سے سنئے۔ سری نگر کی خصوصی عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا.....

”جسکے اس عدالت سے صرف اتنا کہنا ہے کہ حکومت مجھ پر ملط قانون کے تحت مقدمہ چلا رہی ہے بہر حال اگر اس قانون کا عنوان بدل دیا جائے تو میں استغاشہ کے لگائے ہوئے الزامات کو درست تسلیم کر لوں گا۔ میں اس قانون کے عنوان کو خصوصی طور پر روکرتا ہوں۔ مجھ پر

بھارتی مقبوضہ کشمیر کی حکومت یہ الزام لگاتی ہے کہ میں دشمن کا ایجنت ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے میں کسی کا ایجنت نہیں ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مقبول بٹ کسی کا ایجنت بن سکے۔ اس حکومت کو چاہیے کہ مجھے اچھی طرح پہچان لے، میں ہی تو دراصل اس کا دشمن ہوں حقیقی اور ازالی دشمن ہوں۔ کشمیری عوام کی آزادی حاصل کرنے کے ارادے کا مظہر ہوں۔“

لاہور میں پاکستان کی خصوصی عدالت میں بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا.....

”میرے خلاف جواز امداد عائد کیے گئے ہیں ان کی حقیقت اس وقت مفکشف نہیں ہو سکتی جب تک میرا وطن جنگ بندی کی منحوس لکیر کے باعث دونتا قابل عبور حصول میں منقسم رہے گا۔ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ میرے وطن کے افق پر آزادی کا حقیقی سورج طاوع ہو کر رہے گا۔ اور ہمارے دلوں پر کچھ بھی یہ منحوس لکیر مٹ کر رہے گی۔ جس وقت یہ صورت حال پیدا ہو گی تو میرے کردار کے بارے میں اصل حقائق منظیر عام پر آ کر رہیں گے۔ میرے ساتھ صرف اسی وقت انصاف ہو گا۔ یہ انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہو گا۔ مجھ پر عائد کیے جانے والا ہندوستانی قابض حکام کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہو گا کہ میں نے پاکستانی ایجنت بن کر مقبوضہ کشمیر میں حکومت کا تختہ اٹھنے کی مجرمانہ سازش کی تکمیل کے لیے وہاں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور پاکستانی نوکر شاہی کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہو گا کہ میں نے ہندوستانی ایجنت بن کر ہائی جیکنگ جیسا حریت پسندانہ آپریشن کرایا۔“

مقبول بٹ شہید نے ٹھیک کہا تھا کہ ان کے ساتھ اصل انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہو گا۔ تاریخ نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ 1976ء میں انھیں دوسری بار گرفتار کر کے ریاست کی حدود سے باہر اپنے وطن سے دور دہلی تہار ڈیل میں منتقل کر دیا گیا تو وہ ایک عام سیاست دان نہیں بلکہ سرزنش سے باہر اپنے وطن سے دور دہلی تہار ڈیل میں منتقل کر دیا گیا تو وہ ایک عام سیاست دان نہیں بلکہ سرزنش کشمیر کے نامور سپوت، کشمیری عوام کی آنکھ کا تارا اور نوجوان نسل کے لیے ایک سمبل کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انھیں قبول عام اور شہرتِ دوام حاصل ہو چکی تھی۔ انھیں ریاست سے باہر منتقل کرنے کے اقدام پر احتجاج کی ایک لہر پورے ملک میں دوڑ گئی۔ سری گر کی قانون ساز اسمبلی کے رکن اور وادی کشمیر کے نامور قانون دان پیارے لعل ہندو نے بٹ صاحب کو ریاست کی حدود سے باہر دہلی کی ڈیل میں مقید رکھنے کے قانونی جواز کو چیلنج کیا۔ احتجاج کرنے والوں میں سری گر بار ایسوی ایش، سری گر کی سول بریز کوسل، مختلف سیاسی اور غیر سیاسی تنظیمیں شامل تھیں۔ سرکردہ تعلیم یافتہ قلم کار اختر محی الدین نے

سخت الفاظ میں سزاۓ موت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ کشمیر کے اخبارات نے بڑے جاندار اداریے لکھے۔ روزنامہ آئینہ سری نگرنے اپنے اداریے کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔

”مقبول بٹ ایک فرد کا نہیں کشمیری نوجوانوں کی اس نسل کا نام ہے جو ہندوستان کی حقیقوں اور پاکستان کے خوابوں سے مایوس اور بیزار ہو کر کشمیر کے لیے آزادی خود اختاری کی آرزو میں گرفتار ہو چکے ہیں۔“

پھر بھارتی حکومت نے مقبول بٹ کی سزاۓ موت پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا تو ساری دنیا میں آزادی پسند حلقوں میں سخت تشویش پیدا ہوئی اور اطرافِ عالم سے بھارتی حکومت پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اس سزا پر عمل درآمد روک لے۔ یہ اپلیس کرنے والوں میں ایمنشی انٹر نیشنل، انسانی حقوق کا بین الاقوامی کمیشن، کرنل معمر قدانی اور یاسر عرفات جیسی جلیل القدر ہستیاں شامل تھیں لیکن بھارتی حکمرانوں نے ان تمام اپلیوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور 11 فروری 1984ء کو کشمیر کے اس عظیم فرزند کو تہاڑ جیل کے ایک گنام گوشے میں سولی پر لٹکا دیا گیا۔ کوتاہ اندیش حکمران یہ سمجھتے تھے کہ مقبول بٹ کا شکل میں زونما ہونے والی آزادی کی لہر کو ختم کر دیا ہے لیکن تاریخ کے فیصلے کچھ اور ہوتے ہیں۔ مقبول بٹ چنانی کا بچنده گلے میں ڈال کر حیات جاوداں حاصل کر گیا۔ اس کی ذات ظلم و جبراً و تحصال اور غلامی کی لعنتوں کے خلاف ایک روشنی کا مینار بن گئی۔ بقول فیض۔

سلا دیا جسے زندگی میں تم نے موت کی نیند
جگائے گی اسے حالات کی صدا لوگو!

شہادت نے مقبول بٹ کو پوری کشمیری قوم کے لیے وجہ افخار بنادیا ہے۔ قومی آزادی، انسانی عظمت، رواداری، فرقہ دارانہ ہم آہنگی، بے لاگ حب الوطنی، انصاف اور مساوات کے بلند اور ارفع جذبات سے معمور اس کے خیالات، افکار اور نظریات نوجوان نسل کے لیے مشعل راہ بنے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ہمارے وطن کے افق پر آزادی کا وہ حقیقی سورج طوع ہو کر رہے گا جس کا اظہار مقبول بٹ شہید نے اپنے بیان میں کیا تھا۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ آج کل متفاہ اور رجعت پسندانہ نظریات رکھنے والی کئی جماعتیں مقبول بٹ شہید سے اپنا رشتہ جوڑ کر ان کے افکار کے بارے میں ابہام پیدا کر رہی ہیں۔ شہادت کے بعد مقبول بٹ شہید کو جو رتبہ بلند حاصل ہو گیا۔ اس کا ایک نتیجہ نکلا کہ کشمیر کی کئی سیاسی تنظیمیں انھیں اپنا نے لگیں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کا شہید کشمیر اور ان کی تحریک سے کسی نہ کسی طور تعلق رہا ہے لیکن بہت سے ایسے لوگ اور تنظیمیں ہیں جن کا نہ مقبول بٹ شہید کی ذات سے کوئی تعلق رہا ہے۔ نہ ہی ان کے نظریات سے، ایسے لوگ محض شہید کشمیر کی نیک نامی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر ان کا نام استعمال کر رہے ہیں مثال کے طور پر ایسی جماعت کا مقبول بٹ شہید سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جو جوں کشمیر کی آزادی اور خود مختاری کے تصور سے ہی انکاری ہیں۔ ایسے لوگ جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر ریاست جوں کشمیر کو تقسیم کرنے کی راہ ہموار کر رہے ہیں جو ایک ایسی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں صرف ایک فرقے کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور دیگر فرقوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مقبول بٹ شہید کے وارث یا پیر و کار کیسے کہلا سکتے ہیں؟ کیوں کہ اس سرزی میں پر یہاں کی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اکثریت کا۔

دنیا کے حالات آج بھی انتہائی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ کل تک یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ سپر پاور روس کی مغربی ریاستیں ایک ایک کر کے اپنی آزادیوں کے لیے آواز بلند کریں گی یا یہ کہ مشرقی اور مغربی برلن کے عوام دیوار برلن کو توڑ کر زمین بوس کر دیں گے۔ 22 اگست 1989ء کو روس کی تین بالشیک ریاستوں ایسٹونیا، یکھوانیا اور لیتوانیا کے عوام نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر 1939ء کے اس روس جمن معاهدے کے خلاف تاریخی مظاہرہ کیا جس کی رو سے ان ریاستوں کی خود مختاری کو ختم کر دیا گیا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں تین ریاستوں کے دارالحکومتوں کو ملانے والی چھ سوکلو میٹر لبی یا انسانی زنجیر حصول آزادی کے لیے اپنی طرز کا پہلا اور انوکھا مظاہرہ تھا۔ اسی طرح آذربائیجان، آرمینیا، جارجیا، اور یوکرین وغیرہ میں بھی آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہے۔ صدر گورباچوف نے اس سلسلے میں حیرت انگیز طور پر نہایت مصالحتی اور معتدلانہ روپی افتیار کر رکھا ہے۔

پاکستان کے اندر بھی مسئلہ کشمیر کے بارے میں سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کے اندازِ فکر میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔ اب یہاں کے اکثر سیاسی رہنماء بر ملا اسی بات کا اظہار کر رہے ہیں کہ کشمیر کے مسئلے کا حلِ الحق نہیں بلکہ ایک آزاد اور غیر جانب دار ریاست کا قیام ہے۔ اس سلسلے میں بعض مذہبی جماعتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملک کے نامور دینی رہنماء پروفیسر محمد طاہر القادری نے کشمیر کے بارے میں اپنے ایک اٹرڈیو میں (جواب ایک کتاب پر کی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے) واضح الفاظ میں کہا ہے کہ کشمیر کو بطور خود مختار علیحدہ ریاست کے Deal کیا جانا چاہیے۔ ان کی رائے میں یہ مسئلہِ الحق کشمیر کا نہیں بلکہ آزادی کشمیر کا ہے۔ اسی طرح مولانا احمد شاہ نورانی اور مولانا عبدالستار خان نیازی واشگاٹ الفاظ میں اعلان کر چکے ہیں کہ جموں کشمیر کو ایک آزاد خود مختار ملک کی حیثیت سے وجود میں آتا چاہیے پاکستان کے نامور صحافی نذرِ ناجی نے حال ہی میں ایک کالم میں مسئلہ کشمیر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہو یا ہندوستان میں نہایت فرسودہ بات ہے۔ اب سیاسی رہنماؤں کو نئے انداز اپنانے ہوں گے۔

حاصل کلام یہ کہ ہمارے ہمدرد اور خیر خواہ سیاسی حلقتے تو ہماری آزادی و خود مختاری پر زور دے رہے ہیں لیکن کس قدر شرم کی بات ہے کہ ہمارے بیشتر برخود غلط لیڈر حضرات خود مختاری کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ مقبول بٹ کے راستے پر پُس رہے ہیں اب یہ ہماری بالغ نظر نوجوان نسل کا فرض ہے کہ کھرے کھوٹے میں تمیز پیدا کرے اور شہید کشمیر کے انکار کا گہرا مطالعہ کر کے وہ راستہ اختیار کرے جو عزت، وقار، آزادی اور انسانی اُخوت و نسباندی کی منزل کی طرف جاتا ہے۔



مقبول بٹ ضمیر فروش نہیں تھے

پیر محمد سعید شاہ ناز کی (لاہور)

شہید کشمیر مقبول احمد بٹ عمل پیغم، یقینِ محکم کا اعلیٰ نمونہ تھے اور اپنے نظریے پر محکم تھے، اس لیے ان کا ضمیر کوئی نہ خرید سکا۔ جناب مقبول احمد بٹ کے ساتھ پندرہ، سولہ سال ہم کار، ہم خیال رہا ہوں۔ 1960-62ء تک لبریشن لیگ میں اور 1963-64ء میں اینڈی پنڈٹس کمیٹی میں اور اپریل 1965ء سے تادم تحریر محاذرائے شماری میں۔ ان ایام میں بڑے بڑے واقعات اور دردناک حالات سے دو چار ہونا پڑا۔ جو کہ ایک الگ داستان ہے جو کتاب کی صورت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ فی الحال میں جدو جہد میں مصروف حضرات کے لیے خصوصی اور عوام الناس کے لیے عموماً ایک واقعہ پر قلم کو حرکت دیتا ہوں۔ جب کشمیری حریت پسندوں نے اپنی جانوں پر کھلیل کر گنگا جہاز سری نگر سے لاہور ایز پورٹ پر اتارتا تو قائدین محاذرائے شماری کی ہدایت پر لاڈ پسیکر لگا کر لاہور میں اعلان کر دیا کہ یہ جہاز محاذرائے شماری کے عسکری بازو (قویٰ مجاز آزادی) لائے ہیں۔ جب تک ہمارے مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے جہاز کو آزاد نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال قائدین مجاز انٹرنسیشن ہوٹل سے لاہور ہوٹل میکلور وڈ نقل ہوئے اور پورے ملک کے لیے جلسہ و جلوس کا پروگرام مرتب کیا۔ اسی دوران 4 یا 5 فروری 1971ء کو میں لاہور ہوٹل میں بٹ صاحب کی طرف حسب معمول جا رہا تھا کہ بٹ صاحب کے کرے کے باہر مسلم کا نفر نہ کاوف ذیر قیادت عبدالغفار خان صاحب موجود پایا۔ سب کے ساتھ، شناسائی پرانی قسم، وفد میں جناب مفتی عبدالغفرنگ صاحب لاہور، محمد خان صاحب لاہور، عبد العزیز راجوری صاحب کو جراں والہ شامل تھے۔ مفتی صاحب موصوف نے مجھے بتایا کہ ہم چار پانچ روز سے بٹ صاحب کے ملاقات چاہتے ہیں لیکن بٹ صاحب ملاقات کا وقت نہیں دیتے۔ صدر آزاد کشمیر کا خاص پیغام بھی دینا ہے۔ میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا میں بٹ صاحب سے وجہ دریافت کر کے ملاقات کراؤں گا

- جب میں نے بٹ صاحب سے عرض کیا تو بٹ صاحب فرمانے لگے محاذ کے قائدین نے ملاقات پر پابندی لگادی ہے کہ ان سازشیوں وہوکہ باز مکار اور آزادی کشمیر کے دشمنوں سے ملاقات نہ کریں۔ آپ جناب میر عبدالقیوم سے اجازت لیں میں ان سے ملاقات کروں گا۔ اتفاقاً میر صاحب باہر برآمدے سے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے میں نے ان کو پکڑ لیا، حالات سے آگاہ کیا۔ میری درخواست پر فوراً میر صاحب نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ بندہ نے فوراً خوشی سے بٹ صاحب کو آکر اطلاع دی مختصر یہ کہ ملاقات چاروں کی ہوئی کچھ دیر بعد سردار عالم صاحب اور مفتی عبدالغنی صاحب باہر آئے۔ بعد ازاں عبدالعزیز راجوروی صاحب باہر آئے۔ بندہ اتنی دیر بٹ صاحب کی کالیں ستارہا

- جب سارے چلے گئے میں نے بٹ صاحب سے عرض کیا مجھے خلاصہ کی ضرورت نہیں البتہ میں جاننا چاہوں گا کہ یہ کیا مشن لے کر آئے تھے۔ خدا گواہ بٹ صاحب نے فرمایا کہ یہ کہتے ہیں عبدالقیوم خان صدر آزاد کشمیر چاہتے ہیں کہ بٹ صاحب الجاہد کا سربراہ بنے اور ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کو الجاہد کے گورنیلے ظاہر کریں۔ اس پرفی الحال ہم بٹ صاحب کو بیس لاکھ اور دس لاکھ روپے ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کو دیں گے۔ میں نے یہ پیش کش مسترد کر دی تاکہ ہم خدا اور رسول خصوصاً عوام الناس کے سامنے ذلیل نہ ہوں اور دھوکہ، فراڈ، مکاری میں شامل نہ ہوں۔ یہ کارنامہ قومی آزادی جموں کشمیر محاذ رائے شماری کا ہے۔ یہاں یہ بات ظاہر کرنی ضروری ہے کہ اس وقت پاکستان کے کونے کونے سے ہم مجاہدوں کی پیش کش اور مالی امداد کی پیش کش دن، رات کو ہوتی رہی ہے۔ جب میں نے یہ واقعہ گرفتاری کے دوران میر پور پولیس لائن چونا منڈی سی آئی خانہ لاہور شاہی قلعہ لاہور میں تفتیش کے دوران بیان یا اور ان سے کہا کہ ان حضرات کے گھروں میں فون کی نعمت موجود ہے، انہیں بلا و اور تصدیق کرو۔ پھر انہوں نے جواباً کہا اتنے پیسے دینے سے ان کو کیا فائدہ تھا۔ میں نے عرض کیا ایک جلسہ میں کروڑ روپیہ کی آمدنی ہو سکتی تھی۔ صدر آزاد کشمیر کہتے ہیں کہ یہ میرے الجاہد ہیں اور یہ کارنامہ ہے مگر پیسے نہیں ہیں۔ پاکستانی، کشمیری اپنانوں من وطن قربان کرتے ہیں۔ یہ ہے ان لوگوں کا حال جو صرف اقتدار کی خاطر سیاست کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال صرف جنگ بندی لائن کے ایک طرف نہیں بلکہ دونوں جانب دولت پرست، جان پرست، اقتدار پرست نام نہاد لیڈروں نے کشمیر کو فروخت کیا ہے۔ اس

موقع پر پاکستانی نوکر شاہی سے افسوس اور درد بھرے الفاظ سے میں گزارش کروں گا کہ یہ کیا راز ہے؟ جن کشمیری حریت پسندوں کے پاس جذبہ آزادی تھا، وطن پر قربان ہونے کے لیے تیار تھے، جن کے پاس علم عمل کا بے بہا خزانہ تھا، جن کے پاس طریقہ کار واضح تھا، جو دونوں طرف سے پچھے تھے، جو محب وطن کشمیری اور محب وطن پاکستانی تھے ان کو آپ نے پابند سلاسل کیا، ان کے خلاف گھناؤنی سازشیں کیں، ان کو یہاں بھی مردوا یا، ذلیل کیا، اور ان کو وہاں بھی تباہ و بر باد کرنے کی سازشیں کیں۔ ان سے کن کو فائدہ پہنچا ہے۔ اب کہاں ہے المجاہد اب کہاں ہے جذبہ آزادی؟؟؟ اب کہاں وہ لوگ جو سر باکن رہتے تھے؟؟؟ اب بھی ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ، لیکن صرف وقت کے منتظر ہیں ان حالات کے باوجود مقبول بٹ صاحب نہ گھبرائے نہ عمل پیغم سے زکے، نہ اپنے نظریات، ضمیر کو فروخت کیا۔

ہزاروں سال نگس اپنی بے نوری پر روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بحوالہ ہفت روزہ "مشعل" کوئٹہ)

(14 فروری 1990ء)



میراں، میرا اہبہ

پروفیسر اشرف قریشی

(شعبہ کشمیریات پنجاب یونیورسٹی لاہور)

مقبول بٹ شہید کا نام گرامی میرے کانوں میں تب پڑا جب میں ابھی اپنی سن رجائی میں تھا، یہ 1966ء کا دور تھا جب میں سری نگر کے ایک مقامی ہائی سکول میں طالب علم تھا۔ اس سے قبل 1962ء میں ہند چین جنگ 1964ء میں موئے مقدس کی تحریک اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں حکومت پاکستان کی کشمیر کو آزادی دلوانے میں ناکامی کے بعد کشمیری عوام مایوس ہو گئے تھے۔ بلکہ معاهدہ تاشقند کے بعد حکومت پاکستان کی ہندوستان سے دوستی کے معاهدے نے کشمیریوں کی ساری آس خاک میں ملا دی تھی۔ اس پرستم ظریفی یہ ہے کہ 1965ء کی جنگ کے بعد حکومت پاکستان نے اپنی غلط پالیسیوں اور اپنی تاشقند کی سودا بازی پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ پروپیگنڈا وسیع پیانا نے پر شروع کیا کہ کشمیری بزدل ہیں اور وہ خود اپنی جنگ نہیں لڑتے۔ وہ بزدل ہیں۔ اس سلسلہ میں کشمیریوں پر سرکاری طور پر طعنہ زنی کی جانے لگی اور ”تھپ چڑھی تھمس کری“۔

اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان میں آباد چند محب وطن کشمیریوں نے کشمیر کی تحریک آزادی کو فلسطین، الجزا اور ویت نام کی طرز پر خود چلانے کے لیے غور و خوض شروع کر دیا اور اس مقصد کے لیے جموں کشمیر مجاز رائے شماری جو ایک سیاسی تنظیم تھی، میں ایک عسکری بازو جموں و کشمیر قومی مجاز آزادی کے نام سے شروع کر دیا۔ اس عسکری تنظیم نے کشمیر میں نوجوانوں کو سیاسی شعور دینے کے علاوہ انہیں بھارت کے خلاف عسکری جدو جہد کرنے کا بھی پروگرام مرتب کر دیا اور اس سلسلہ میں بھارتی مقبولہ کشمیر میں دو گروپ بھیج دیے۔ ایک گروپ جس کے ذمہ نوجوانوں میں تحریک آزادی کشمیر کے لیے سیاسی شعور اجاگر کرنا، کے سربراہ مقبول بٹ تھے۔ جو سیاسی شعور دینے کے بعد نوجوانوں میں سے

ایے نوجوانوں کو منتخب کرتے تھے جنہیں عسکری تربیت دی جاسکے۔ وہ ایسے افراد کو عسکری شعبہ کے
کمانڈر میجر امان اللہ خان کے پاس بھیجتے تھے جنہوں نے مقبوضہ کشمیر میں ایک سرحدی جنگل میں اپنا
یکپ قائم کیا تھا۔ اس طرح کچھ دیر یہ سلسلہ کامیابی سے چلتا رہا لیکن اسی دوران جب بھارتی انٹلی جس
کو یہ خبر ملی کہ محمد مقبول بٹ اور میجر امان اللہ کشمیری نوجوانوں کو تحریک آزادی کشمیر کے لیے تربیت دینے
کے لیے آزاد کشمیر سے مقبوضہ کشمیر میں آئے ہیں۔ تو ان کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ان کی
تلائش شروع کر دی انہوں نے ان مجاہدین آزادی کو گرفتار کرنے کے لیے بھارتی رقوم کے انعامات کا
بھی اعلان کر دیا۔ ایک دن مجاہدین کے خلاف بہت ہی سرگرم بھارتی انٹلی جس کا ایک افسر مقبول بٹ
اور ان کے ساتھیوں کے ہتھے چڑھاتو وہ اُس کو زندہ گرفتار کر کے آزاد کشمیر لا رہے تھے کہ رات کو بھارتی
فوجیوں نے مقبول کی کمین گاہ پر دھاوا بولا۔ جس کے دوران مجاہدین اور بھارتی افواج میں فائزگ کا
تبادلہ ہوا لیکن مجاہدین کے پاس محدود اسلحہ و گولہ بارود ہونے کی وجہ سے ان کا گولہ بارود ختم ہو گیا۔ اس
سے قبل بھارتی انٹلی جس افسر امر چند نے مجاہدین کے قبضہ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے وہ
مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا۔ گولہ بارود ختم ہونے کی صورت میں بھارتی افواج اور مجاہدین میں دست
بدست جنگ چھڑ گئی اسی دوران گلگت کے مجاہد اور مقبول بٹ کا ایک ساتھی شہید ہو گیا۔ اس کے بعد مقبول
بٹ اور ان کے ساتھی میر احمد اور کالا خان گرفتار ہو گئے۔ اس خبر سے پوری دادی میں کہرام مچ گیا لیکن
مقبوضہ کشمیر کی ہائی کورٹ نے مقبول بٹ کو سزاۓ موت سنائی اور ان کے ساتھیوں کو طویل معیاد کی
مزائیں سنائیں۔ یہ بھی کشمیریوں کے لیے ایک المناک خبر تھی۔ لوگ بٹ صاحب کی سلامتی کے لیے
دعائیں مانگنے لگے کیوں کہ مقبول بٹ ان کا قومی ہیر و تھا۔ جس نے کشمیریوں کو آزادی کی ایک جدید سوچ
دی تھی اور روایتی سیاست سے انھیں نجات دلائی تھی۔ کیوں کہ روایتی سیاست خالصتاً نظرہ بازی اور
صلحت پر بنی تھی جب کہ مقبول بٹ نے دشمن کے سامنے خود سینہ تان کر اُس سپاہ کی آنکھوں میں آنکھیں
ذال کرنا نہیں لکا را اور اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی۔

وہ کشمیر کے روایتی سیاست دانوں کی طرح دودھ پینے والے مجنوں نہ تھے بلکہ یہاں کی آزادی
کے لیے جان فشار کرنے والے راہنماء تھے۔ اس لیے کشمیر کی تحریک آزادی میں ان کا ایک واضح مقام

ہے اور تمام کشمیری ماسوائے چند ایک گمراہ سیاست دانوں یا ان کے دام میں آئے ہوئے لوگوں کے، سیاسی نظریات کی تخفیف کے بغیر محمد مقبول بٹ کو کشمیر کی آزادی کی تحریک کا ہیر و مانتے ہیں۔ انہوں نے تحریک آزادی کشمیر کی خاطر نہ صرف اپنی جوانی بلکہ اپنے بال بچے اور اپنا مستقبل بھی قربان کر دیا جب کہ ہمارے اکثر سیاسی راہنماؤں اور موجودہ عسکری تنظیموں کے لیڈروں نے تحریک آزادی کشمیر کو اپنا ذریعہ آمدن بنایا ہوا ہے۔ کچھ لوگ تو ”کشمیر بنے گا پاکستان“ اور کچھ ”کشمیر بنے گا ہندوستان“ کا نعرہ لگا کر کشمیریوں، پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی جذبات سے کھلی رہے ہیں اور اپنا الوسیدھا کر رہے ہیں لیکن محمد مقبول بٹ نے تو ہندوستانی یا پاکستانی عوام سے دھوکہ کیا اور نہ ہی کشمیریوں کا استھصال کیا۔ وہ صرف اور صرف ظلم اور ظالم کے خلاف تھے۔ ظالم چاہے ہندوستانی ہو یا پاکستانی یا کشمیری۔ مقبول بٹ ان سے کھل جنگ لڑنے کے داعی تھے۔ مقبول بٹ اپنے ساتھیوں سمیت سری نگر کی سنٹرل جیل سے فرار ہوئے تو یہ خبر کشمیر کے طول و عرض میں جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ کشمیری عوام کو اس خبر پر ایک طرف بہت خوشی ہوئی تو دوسری طرف یہ تشویش بھی ہوئی کہ کہیں بھارتی سامراج نے مقبول بٹ کو کہیں شہید تو نہیں کیا اور یہ خبر عالم کی کہ مقبول بٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ فرار ہو گئے۔ لوگ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کی سلامتی کے لیے دعا میں مانگتے رہے۔ جسٹس (ر) محمد یوسف صراف مرحوم نے اپنے کتاب کشمیریز فائیٹ فار فریڈم جلد دوم میں لکھا ہے کہ لوگوں نے جب بٹ صاحب کے فرار کے بارے میں سناتو انہوں نے اپنے بیڈروموں میں رکھی اُن کی تصاویر سے عقیدت کا اظہار کیا۔

جب مقبول بٹ کے آزاد کشمیر صحیح سلامت پہنچنے کی خبر کشمیریوں نے سنی تو انہوں نے شکرانہ کے نوافل ادا کیے اور خوشی کے اظہار کے لیے دیگیں پکائیں۔ مقبول بٹ نے عام قیدیوں کی طرح سزاۓ موت کی خبر سن کر ہمت نہیں ہاری بلکہ وہ دشمن سے جیل کی خصوصی کال کوٹھی تک اُن کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کی سکیمیں بناتے رہے اور بالآخر شدید سردیوں میں انہوں نے بھارتی سامراج کی زندگی سے فرار ہو کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ آزادی کے پروانوں کو موت کے نام سے خائن نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کشمیر پہنچتے ہوئے مقبول بٹ اور اُن کے ساتھیوں کے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں برفالی سردی اور برف کی وجہ سے گل گئی تھیں۔ آزاد کشمیر آمد پر ان ہیر و زکا استقبال سرکاری طور پر کرنے کے

بجائے انھیں بد نام زمانہ عقوبہ خانہ قلعہ سیاہ پہنچایا گیا۔ جہاں اُن پر انسانیت سوز تشدید کیا گیا اور بعد ازاں انھیں رہا کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ معاہدہ تاشقند کے تحت کیا جا رہا تھا۔ جو بھارت کے اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ تھا۔ اس طرح دراصل حکومتِ پاکستان اور اُس کی طفیلی حکومتِ آزاد کشمیر، کشمیری مجاہدین کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ حکومتِ پاکستان کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی مرضی کے بغیر کسی بھی فرد یا جماعت کی طرف سے کشمیر کی آزادی کے لیے بھارت کے خلاف جدوجہد کے منافی ہے۔ یہ سارا ظلم و تشدد دراصل مجاہدین کو جہاد سے روکنے کی کوشش تھی اور آئندہ انھیں جہاد کرنے سے روکنے کے لیے تشبیہ تھی لیکن آزادی کے پروانے اپنی جان کی بازی لگانے سے کبھی باز نہیں آتے کیوں کہ ان کے جیسے کا مقصد ہی مقبول بٹ کی طرح پروانے کی طرح جانا ہوتا ہے۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر آزادی کی جلتی ہوئی شمع کی لوکو اور بھڑکاتے ہیں۔

محمد مقبول بٹ جب بلیک فورٹ آزاد کشمیر سے رہا ہوئے تو انہوں نے اپنی جدوجہد آزادی کو دوبارہ جاری رکھنے کے لیے مجاہدین کو سیالکوٹ جموں سیکھر سے بھارتی مقبوضہ علاقہ میں بھیجننا شروع کیا اور وہاں بھارتی فوجیوں کے ٹھکانوں، ان کی گاڑیوں اور ان کے گولہ بارود کے ذخائر پر حملے کر داتے رہے۔ بھارتی ذرائع ابلاغ ان کا ررواائیوں کو معمول کی طرح پاکستانی تخریب کاروں کی کاوشیں ظاہر کر کے دنیا پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ کشمیری عوام بھارت کے جبری اقپضہ سے گلوخاصی چاہتے ہیں۔ ادھر پاکستانی خفیہ ادارے کے ارکان اور وزارتِ امور کشمیر ان کا ررواائیوں کو اپنے کارنا میں ظاہر کر کے حکومت کے خزانے سے بھارتی رقم وصول کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اپنا بھرم قائم رکھنے اور رقم ہضم کرنے کے لیے پاکستانی ذرائع ابلاغ کو ترغیب دی تھی کہ جموں کشمیر خواہ آزادی اور محاذ رائے شماری کے پریس ریلیز کو شائع نہ کیا جائے۔ اس طرح کشمیریوں کی تحریک آزادی کے زریں کارنا میں دنیا کی نظروں سے مخفی رکھے گئے اور ہندوستان کو پاکستان پر کچڑا چھالنے اور دنیا میں بد نام کرنے کا موقع صرف اپنا مال کمانے کی خاطر دے دیا۔ ہندوستان دنیا بھر کو معاہدہ تاشقند کے بعد یہ تاثر دے رہا تھا کہ کشمیر اس کا الٹ اٹگ ہے اور پاکستانی تخریب کا رقم وصولہ کشمیر میں در اندازی کرتے ہیں۔ اس تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لیے اور کشمیریوں کی تحریک آزادی کو منوانے کے لیے مقبول بٹ

نے فلسطینی طرز پر بھارتی جہاز انگواء کرانے کا منصوبہ بنایا اور اس مقصد کے لیے محمد ہاشم قریشی کو پاکستان میں تربیت دی گئی۔ محمد ہاشم قریشی کی ملاقات مقبول بٹ سے پشاور میں ہوئی تھی جب محمد مقبول بٹ محمد ہاشم قریشی کی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے ان کے ہاں آئے تھے۔

محمد ہاشم قریشی نے جب کشمیر آ کر مجھے اور دوسرے ساتھیوں کو مقبول بٹ سے ملاقات اور کشمیر میں جموں کشمیر قومی حماڑ آزادی کی تنظیم سازی کے پروگرام کے بارے میں ہمیں بتایا تو ہمیں بہت ہی خوشی ہوئی کہ ہمارا رابطہ کشمیر کی تحریک آزادی کے حقیقی جان باز را ہمہ اور ان کی تنظیم سے ہوا ہے۔ ہم نے کشمیر میں مقبول بٹ کی ہدایت پر قومی حماڑ آزادی کی تنظیم سازی کی اور اس کے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ پھر جب مقبول بٹ نے محمد ہاشم قریشی کو بھارتی طیارہ انگواء کرنے کی ذمہ داری سونپی تو مجھے بھی اس عظیم کارنامہ میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع اللہ تعالیٰ نے بخشنا۔

گنگا کے انگواء سے قبل خطوط کے ذریعہ اور دیزا پر پاکستان سے کشمیر آنے والوں کے ذریعہ ہمیں خفیہ الفاظ میں مقبول بٹ کے پیغامات ملتے رہے۔ گنگا کے انگواء سے قبل بھی ہم نے انھیں جہاز انگواء کرنے کا پیغام بھیجا یا تھا۔ محمد مقبول بٹ نے محمد ہاشم قریشی کو جہاز کے انگواء کی تربیت را ولپنڈی میں پی اے ایف کے ایک سابق پائیلٹ جناب جاوید احمد منٹو سے دلوائی تھی۔

گنگا کے انگواء سے کشمیر کا مسئلہ معاهدہ تاشقند کے پاک بھارت خفیہ معاهدے کے بعد دوبارہ دنیا بھر میں زندہ ہو گیا۔ عالمی شریعتی اداروں میں کشمیر کی تحریک آزادی کے ہیرو کے طور پر مقبول بٹ کا نام گرامی گوئی گوئی بخشنے لگا۔ اس سے جہاں حکومت پاکستان کے عیش پرست اور اسلام و کشمیر پر لوگوں کو بے دوقوف بنانے والے حکمرانوں کو تکلیف ہوئی وہیں پر کشمیر کے نام پر چندہ بنورنے والے اور سیاست چکانے والے روایتی نعرہ باز سیاست دانوں کی آنکھوں اور ضمیر میں مقبول بٹ ایک کائنے کی طرف کھلنے لگا کیوں کہ یہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی کشمیر میں مورثی لیڈر شپ کے بغیر بھی کشمیر کا کوئی اور لیڈر ہو سکتا ہے۔ گنگا کے انگواء کے خلاف اس پار شیخ محمد عبداللہ کی آواز سنائی دی جب کہ اس پار عبدالقیوم خان کی آواز گوئی بخشنے لگی۔ ان تمام سامر اجی طاقتوں اور ان کے گماشتوں کی کوششوں کے نتیجہ میں مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں کو صفحہ ہستی سے منانے کے لیے اور ذلیل درسو اکرنے کے

لے گزگا کیس بنایا گیا لیکن دنیا نے دیکھا اور دیکھ رہی ہے کہ ہمیں آمر اور غاصب یگنی خان کی خصوصی عدالت نے محب وطن کی سند دے کر بطورِ حریت پسند رہا کر دیا لیکن شیخ محمد عبداللہ کو بھارتی پر چم میں پیٹ کر دفنایا گیا اگرچہ ان پر اس کی مورثی حکومت جاری ہے لیکن کشمیریوں کے دلوں میں جوزع نہ اور احترام مقبول بث کا ہے وہ شاید ہی شیخ محمد عبداللہ یا شیخ فاروق عبد اللہ کا ہو۔ اسی طرح عبدالقیوم خان کا حشر بھی ہوا۔ آج بھی اس کی کاغذی تنظیم الحاقد کے فراؤ کا جو چہ چاہے اور اس کے وارث بیٹے عقیق خان نے جو اس کی عزت افزائی کی اور جس طرح آزاد کشمیر کو لوٹا وہ بھی سب پر ظاہر ہے۔

مقبول بث کو میں نے جتنے قریب سے دیکھا ہے شاید ہی کسی اور ان کے دوست نے دیکھا ہو۔ وہ بہت ہونہار، دوستوں کے دوست۔ اسلام کے شیدائی اور ہر لحاظ سے مخلص انسان تھے۔ وہ قالمون کے دشمن اور مظلوموں کے ساتھی تھے۔ ان کا اخلاق حسن دشمن کو بھی دوست بننے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ بے باک اور نذر انسان تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ایک دن انسان نے مرتا ہے لیکن بستر مرگ پر مرنے سے یا کیڑے مکروہوں یا دوسرے حیوانوں کی طرح مرنے سے بہتر ہے کہ انسان کسی بڑے مقصد کے لیے مرنے۔ ان کا یہ بھی پکا ایمان تھا کہ انسان اپنی مختص سانوں سے ایک سانس بھی زائد نہیں لے سکتا۔ کشمیر کی آزادی ان کو اپنی جان، مال اور اولاد اور جائیداد سے بھی عزیز تھی۔ اس کا عملی ثبوت انہوں نے اپنے قول فعل سے دیا۔

گنگا کے اغوا کے بعد میں نے مقبول بث شہید کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ایک مخلص قابل اعتقادی ایسی لیڈر، عسکری راہنماء اور ہمدردانہ انسان تھے۔ ان کا اخلاق اتنا بلند پایا تھا کہ وہ اپنے بدترین دشمن کو بھی پل بھر میں اپنا گرویدہ اور ہم خیال بنالیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے پاکستان کی جیلوں اور بھارتی زندان خانوں میں اپنے بے شمار دوست بنائے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت میں عجیب اتنا طبیعت اور آنکھوں میں ایک خاص روشنی تھی جس سے غیرت، حمیت، حریت اور شفقت کی شعاعیں پھونتی رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سادہ لباس پہننے عموماً قمیض شلوار یا گرتا شلوار اور وا سکٹ ان کا پسندیدہ لباس تھا جس سے ان کی شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا۔

وہ کم گو تھے لیکن گفتگو کرتے وقت نہایت وضاحت سے مدعا بیان کرتے اور مخاطب کو مجھن

سے نکال دیتے۔ ان کی بات میں دلائل اور حقائق ہوتے تھے۔ گنگاہائی جینگ کے دوران انہوں نے ہفتہ روزہ ”زندگی“ لاہور کو ایک انٹرودیوڈ یا تھا۔ آج بھی اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبول بٹ کے افکار کتنے بلند اور حقائق پر مبنی تھے۔ ایسا لگتا ہے کوئی آدمی ہمیں ڈکٹیٹ نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک قاری کو فیضت کر رہا ہے کچھ سمجھا رہا ہے جو اس کے روایتی سیاست دانوں نے اس سے چھپایا ہوا ہے۔ ان کی تقریر بھی اتنی متاثر کن ہوتی تھی کہ کوئی اس دوران اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے اور انھیں علم سے بہت لگاؤ تھا اس لیے مختلف موضوعات پر کتب مبنی کرنا ان کی عادت تھی۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے اردو اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ گنگا اغوا کے وقت انھیں اس وقت افسوس ہوا جب پاکستانی حکام نے اغوا شدہ جہاز سے بھارتی یونیورسٹی مسافر دھو کے سے ہم سے یہ کہہ کر لے لیے کہ ان مسافروں کو کھانا کھلانا حکومت پاکستان کا فرض بنتا ہے اور کھانا کھانے کے بعد مسافر حکومت اغوا کنندگان کے حوالے کر دے گی۔ لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ حکومت پاکستان جو اپنے عوام کے ساتھ ہمیشہ دھو کے کرتی آئی ہے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی نہیں کرے گی اور دراصل حکومت پاکستان کشمیریوں سے زیادہ بھارتی حکمرانوں کی خیرخواہ ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا کہ ہم گنگا کو کامیابی سے اغوا کر کے لاہور لے آنے کے باوجود اپنی بازی پاکستانی حکام کے ہاتھوں ہار گئے۔ کیوں کہ بھارتی حکمرانوں کا مغرب در سر جھکانے کے لیے صرف جہاز کے مسافر ہی ہمارے ہاتھوں میں ایک ہتھیار تھے جن کے بد لے ہم ہندوستانی حکومت سے اپنے مطالبات منواستے تھے۔

پاکستانی حکام نے ان بھارتی مسافروں کی خوب خدمت کی انھیں انٹریشنل ہوٹ میں پی آئی اے کے اخراجات پر نظہرا یا گیا اور ان کی شراب اور کباب سے تواضع کرتے تھے اور پھر ہمارے حوالے کرنے کے بجائے انھیں بھری راستے سے ہندوستان بحفاظت پہنچایا۔ اگر پاکستانی حکام ایسا نہ کرتے تو ممکن ہے بھارت اپنی جیلوں میں بند کئی مجاہدوں کو رہا کرتا اور جن کا ہم نے مطالبة کیا تھا ان کو پاکستان بھیج دیتا۔ لیکن بقول شاعر

حُر ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو

پاکستانی حکام نے دوسرا بڑا ظلم یہ کیا کہ مقبول بٹ کے منع کرنے کے باوجود کہ گنگا کونہ جلا و بلکہ

اس کے شیشے غیرہ توڑ کر اس کو ایز پورٹ پر زیادہ سے زیادہ دیر رہنے دوتا کہ اس طرح مسئلہ کشمیر کو زرع ابلاغ میں بھارت کے خلاف پروپگنڈہ کرنے میں مدل سکے اور پھر اس جہاز کو اقوام متحده کے دو تا کہ اس ادارہ کو یہ احساس ہو کہ وہ مسئلہ کشمیر حل کرانے میں ناکام رہا ہے۔ پاکستانی حکام نے انگوائنڈ گان پر یہ جھوٹ کہہ کر کہ مقبول بٹ نے حکم دیا ہے کہ جہاز کو جلا و جہاز جلوایا۔ اس وقت ایز پورٹ پر تعینات ایس ایس پی نے انگوائنڈ گان کو پڑول اور ڈی ایس پی سید باقر علی شاہ نے اس کام کے لیے ماچس بھی مہبیا کی۔ دراصل حکومت پاکستان کے محکمہ انتیلی جنس کے آفیسر میجر رحیم شاہ نے جہاز سے بھارت کی مرکزی حکومت اور کشمیر کی صوبائی حکومت کے درمیان کچھ سرکاری ڈاک ایک ڈاک کے بیگ سے حاصل کیے تھے۔ جب انہوں نے ان کے نقول حاصل کرنے کے بعد ان پر پہلی جیسی سیل کرنے کی کوشش کی وہ اس سلسلہ میں ناکام ہوئے تو انہوں نے اس کا یہ حل سوچا کہ نہ جہاز واپس جائے تو نہ ہی چوری پکڑی جائے۔ جس کی وجہ سے ان حکام نے جہاز کو آگ لگوادی۔

گنگا جہاز کو آگ لگانے کے بعد جب ہم زخمی حالت میں ہسپتال میں تھے تو اس دوران پاکستان کے مختلف شہروں سے پاکستانی عوام ہمیں عطیات کے طور پر بلینک چیک تک بھیجتے رہے لیکن مقبول بٹ جوان دنوں مجاز رائے شماری کے صدر بھی تھے مجاز رائے شماری کے خازن میر عبدالقیوم مرحوم کو حکم دیا تھا کہ وہ یہ تمام چیک لوگوں کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیں۔ جناب میر عبدالقیوم مقبول بٹ کے حکم کی تعییل کرتے رہے۔ مقبول بٹ کوئی پیشہ ور سیاست دان نہ تھے وہ ایسے راہنماء تھے جو قوم کو صدیوں بعد قسمت سے نصیب ہوتے ہیں اور ایسے راہنماؤں کے لیے علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چن میں دیدہ ور پیدا

لاہور میں گنگا انگو کے دوران ایک دن مقبول بٹ کے پاس اس وقت کے آزاد کشمیر کے صدر عبدالقیوم خان کا پیغام لے کر عبدالقیوم کا بھائی غفار خان آیا کہ اگر بٹ صاحب ہائی جیکر ز سے یہ اعلان کر دائیں کہ وہ المجاہد کے رکن ہیں اور جہاز کا انگوالا مجاهد کا کارنامہ ہے تو انھیں ایک بڑی رقم دی جائے گی اور آزاد کشمیر میں سرکاری مہمانوں جیسا استقبال کیا جائے گا۔ لیکن مقبول بٹ صاحب آزادی کا سوداگر

نہ تھا اس لیے قیوم کے دام میں نہ آیا اور اس کی پیش کش کو محکرا دیا۔

پھر جب نانڈا ذیم (کوہاٹ) میں حکومتِ پاکستان نے ہمیں یہ پیش کش کی کہ وہ معابرہ تاشقند کی رو سے تحریک آزادی کشمیر کو برداشت نہیں کر سکتی ہے اس لئے انھیں کسی بڑے شہر میں کوئی بھی بڑا سا ذیپار معمول سشور کھول کر دیا جائے گا یا کسی بھی میڈیکل کالج یا دوسرے ادارے میں داخلہ دیا جائے گا۔ یا کسی بھی من پسند لڑکی سے اُن کی شادی کر دی جائے گی وہ تحریک آزادی کو ترک کر دیں ٹو مقبول بٹ نے انھیں شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت ہماری واقعی مدد کرنا چاہتی ہے تو ہمیں آزاد کشمیر میں نوجوانوں کے لیے عسکری تربیتی یکمپ کھولنے کی اجازت دیں جس پر حکومت نے یہ بجانپ کر کہ یہ مجاہدین بننے والے نہیں ہمارے خلاف عوام میں نفرت پھیلانی شروع کر دی کہ یہ مجاہدین بھارتی جاسوس ہیں اور جہاز بھارتی ایماء پر اغوا کیا گیا تھا اور ان افواہوں پر مہر تصدیق لگانے کے لیے نور العارفین کمیشن کا اعلان کیا گیا جس میں ہم پیش ہوئے لیکن بیکھی خان کی حکومت نے یہ ایک چال چلی تھی۔

اس کمیشن کے ذریعے ہمیں اور بدنام کیا گیا اور مقبول بٹ سمیت ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ آزاد کشمیر و گلگت بلستان سمیت پورے پاکستان بھر سے سیکڑوں محب وطن کشمیریوں کو گرفتار کیا گیا کہ یہ لوگ بھاتی ایجنت ہیں لیکن ہم اللہ کو اپنی زندگی کا مالک ماننے والے تھے اور مقبول بٹ کی فوج تھے اس لیے بیکھی خان کے شیطانی وار سے نہ گھبرائے اپنے خدا پر مکمل بھروسہ تھا ہمیں شاہی قلعہ پہنچا گیا جہاں ہم پر انسانیت سوز مظالم روا رکھے گئے کہ ہم پولیس کی جھوٹی کہانی کو اپنالیں کیونکہ یہ بیکھی خان کا صداقتی حکم تھا۔ مملکت خداداد اسلامیہ جمہوریہ کے آمر اور غاصب مارشل لاءِ ایڈ منٹریٹر اور صدرِ مملکت کا جابر ان حکم

حالیہ تحریک کے دوران حکومت پاکستان اور اس کے خفیہ اداروں نے بہت سے علیحدگی پسند کشمیریوں کو اسلام آباد میں جمع کر کے "آل پارٹیز حربیت کافرنس" کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور ان کشمیریوں کو یقین دلایا کہ پاکستان کشمیر کو آزاد کروانے میں بھارت سے لکرنیں لے سکتا ہے ابھر ہو گا کہ یہ لوگ ماہانہ وظیفے حاصل کریں، کار، کوئی، بیرون ملک سیر پانے انجوائے کریں۔ ان کے بچوں کو حکومتی اخراجات پر اعلیٰ تقاضی اداروں میں نہ صرف داخلے دیئے جائیں گے بلکہ اعلیٰ ملازمتیں بھی دی جائیں گی۔ یہ معابرہ طے پانے کے بعد یہ کشمیری پاکستانی ایجنسیوں کے ہاتھوں کھلونا بن کر عملہ تحریک آزادی سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کے پچھے عیش و عشرت میں پل رہے ہیں۔)

ایک بار شاہی قلعہ کے یزیدوں نے مجھے کہا کہ مقبول بٹ نے مان لیا ہے کہ وہ بھارتی جاسوس ہے تم بھی مان لو اور جان چھوڑاؤ ہم سے۔ مجھے یقین کیسے آتا کیوں کہ مقبولہ کشمیر میں بھارتی افواج کے خلاف جہاد کرنے والا راہنماء جنہیں بھارتی ہائی کورٹ نے سزاۓ موت کا حکم اس الزام میں سنایا تھا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے پھر اولو العزم بٹ صاحب کیسے مان سکتے ہیں کہ وہ بھارتی ایجنت ہے۔ کیوں کہ انہوں نے مجھ سے میرے خون سے اس حلف نامے پر دستخط لیے تھے کہ میں بھارت کا اذلی دشمن ہوں میں نے شاہی قلعہ کے ظالموں سے کہا کہ یہ جھوٹ ہے اگر یہ حق ہے تو مجھے بٹ صاحب کے پاس لے چلو میں خود ان کی زبانی یہ بات سنوں۔ جس پر ان جلادوں نے مجھے نگا کیا اور چھترول کی اور کہا کہ اچھا تو تم بٹ صاحب سے ملنا چاہتے ہو۔

بٹ صاحب کے ساتھ میں کافی عرصہ تک گنگا کیس کے سلسلے میں پاکستان کی کئی جیلوں میں تید رہا۔ اس دوران انہوں نے جس عزم، حوصلے اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا وہ بات میں نے آج تک کسی انسان میں نہیں محسوس کی ہے۔ وہ جیل میں تمام قیدیوں کی بلا تخصیص مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی مشکلات دور کرنے کے لیے انھیں درخواستیں لکھ کر دینا ان کی سختی اور مالی امداد کرنا اور انھیں یہ احساس دلانا کہ وہ بھی باقی انسانوں جیسے انسان ہیں۔ اللہ نے ہم سب کو ایک جیسا بنا بنا یا ایسا انسان ہے جس نے یہ اس تھکانی نظام ترتیب دیا ہے اور دنیا کا توازن بگاڑا ہے۔ وہ جیل میں بھی اپنے تمام ساتھیوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اگر کوئی کام ہوتا تو اپنے ساتھ تمام میں بانٹ دیتے۔ انہوں نے نظم و ضبط میں اپنے آپ کو اتنا پابند کیا تھا کہ وہ رات کو جس ڈھب سے سوتے صبح اُسی انداز میں جائے گتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے رات بھر کروٹ بھی نہ بد لی ہو۔ وہ صبح صادق کے وقت جائے گتے اور دن کا آغاز فجر کی نماز سے کرتے وہ ہر مسئلہ پر اپنے ساتھیوں سے ضرور مشورہ کرتے تھے آخری بار کشمیر جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ہمیں کشمیر جانے سے قبل کم از کم سیکڑوں ساتھی آزاد کشمیر میں جہاد کے لیے تیار کر کے رکھنے چاہیں تاکہ تحریک ہمارے بعد بھی جاری رہ سکے اگر صرف ہم تین چار لوگ یہاں سے چلے گئے تو پھر تحریک بھی ہمارے ساتھ ختم ہو جائے گی لیکن

کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ مقبوضہ کشمیر جہاد کے لیے جناب حمید بٹ اور ریاض ڈار کو ہمراہ لے جا چکے ہیں۔ پھر یہ خبر بھی آئی کہ ہندوستان انھیں مقبوضہ کشمیر کا وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ بنانے کے لیے سودا بازی کر رہے ہیں۔ تو کچھ ہمارے محاذ کے ساتھی گھبرا گئے لیکن ہمیں یقین نہیں آیا کیوں کہ جب ہم گزگا کیس سے رہائی کے بعد منگلا قلعہ میں اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان مرحوم ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کرچکے تھے تو ذوالفقار بھٹو نے مقبول بٹ سے کہا تھا کہ آپ لوگ پیپلز پارٹی میں شامل ہو جاؤ اور آزاد کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ سنہجات لومقبول بٹ صاحب نے انھیں بڑی خوبصورتی سے یہ کہہ کر تلاکہ کہ ہماری منزل آزاد کشمیر کی وزارتیں نہیں کشمیر کی مکمل آزادی اور خود اختاری ہے۔ پھر 11 فروری 1984ء کو خبر آئی کہ مقبول بٹ کو بھارت نے پھانسی پر لٹکایا حالانکہ ان کا کیس ابھی اپیل میں تھا۔ اس کے باوجود بھارتی راہنماؤں کو یہ زعم ہے کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوری طاقت ہے لیکن کشمیر اور کشمیری بھارت کے اس دعویٰ کو جھلانے کے لیے کافی ہیں۔

آزادی کے جرم میں کسی کو پھانسی دینا برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں 1947ء کے بعد ایک انوکھا واقعہ تھا لیکن شہید کشمیر جناب مقبول بٹ کے پھانسی پر لٹکانے کے باوجود کشمیری عوام نے اپنے قائد کا یہ بیان پورا کر دکھایا کہ ”ہم دمن کے اعصاب پر سوار ہیں۔ ہم کشمیر کی جنگ آزادی کشمیر کی دادیوں، پہاڑوں، میدانوں اور جنگلوں میں لڑیں۔ کشمیر کشمیریوں کا ہے۔ اس کے لیے ہم لڑیں گے، اس کی خاطر ہم مریں گے، اس پر حکومت ہم کریں گے، اس کی حفاظت ہم کریں گے۔“

(گفتگو: 1994ء)



حسین اُبی علیؑ کے پیروکار

مقبول بٹ شہید

ہاشم قریشی (ہالینڈ)

یہ 11 فروری 1990ء ہے اور آج ہی کے دن چھ برس پہلے انہیروں اور تاریکیوں کے رکھوالوں نے میرے محبوب راہبر مقبول بٹ شہید کو یہ سوچ کرتختہ دار پر چڑھا دیا تھا کہ "ہم سچائی، انصاف اور آزادی کی روشنی کو نجھا سکیں گے"۔ مگر تختہ دار پر چڑھنے والا مقبول بٹ اُسی تاریک رات کی روشن صحیح کو کشمیر کی منزل آزادی کا نہیں بلکہ دُنیا کی ہر خریت پسند تحریک کا ایک ایسا مینارِ نور بن گیا جس کی روشنی میں غریب، مظلوم اور آزادی کی جنگ لڑنے والا ہر خریت پسند منزل آزادی کی طرف رواں دواں رہے گا اور خاص طور پر کشمیری نوجوان مقبول بٹ کی اس جدوجہد کا امین بنے گا جو انہوں نے کشمیر کے ایک کروڑ عوام کو ظلم و جبرا، غلامی اور اقتصادی ناہمواری کو ختم کرنے کے لیے شروع کی تھی اور اپنی قوم کو آزاد، سرخود کیخنے کے خوابوں کی قیمت جنہوں نے پندرہ سال ہندوستان و پاکستان کے جیل خانوں اور تشدگاہوں میں نہ صرف بسر کر کے دی بلکہ اپنی عزیز ترین جان بھی انھیں عظیم آ درشوں اور اصولوں کی خاطر قربان کر دی اور یہ پھانسی کا پھندا انہوں نے آج کے ماحول میں نہیں بلکہ اُس وقت اپنے گلے میں خوشی خوشی، ذلا تھا جب کشمیری قوم غلام بنانے والے غاصبوں کے ہی جھوٹے پروپیگنڈے کی وجہ سے شہید کے بارے میں شکوک و شبہات میں بنتا کر دی گئی تھی۔ مگر مقبول بٹ انقلابی شعور سے اس قدر آشنا تھے کہ کبھی نہیں سوچتے کہ قوم نے انھیں کیا دیا بلکہ اس جدوجہد اور لگن میں رہتے تھے کہ "ہم قوم کو کیا دے سکتے ہیں، بٹ صاحب اکثر جیل میں مجھے اور اشرف قریشی کو دُنیا میں ہونے والی جدوجہد آزادی کے بارے میں طویل پیچھہ دیتے تھے اور قوموں کی آزادی کی تحریکوں میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی بیان کرتے تھے۔ اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ تحریک آزادی کی جدوجہد کے

دوران پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کے لیے بہت ضروری ہے کہ انقلابی کارکن سیاسی شور اور نظریاتی ہتھیار سے پوری طرح لیس ہوتا کہ وہ ایسا کوئی عمل یا فیصلہ نہ کریں جس سے پوری تحریک پر برا اثر پڑے۔ مقبول بٹ شہید نے ہمیشہ حق کی پیروکاری کی وہ جھوٹ اور جھوٹی شہرت کے حامل لوگوں سے انتہائی نفرت کرتے تھے، ان کے نزدیک قوم کو آزادی جیسی مقدس جدوجہد کے نام پر دھوکہ دینا سب سے بڑا جرم تھا۔ وہ کسی کے بھی ذاتی دشمن نہ تھے۔ کشمیر کی لیڈر شب سے اور خاص طور پر قوم خان سے وہ اسی لیے بیزار تھے کیوں کہ وہ اور اس قبل کے لیڈر کشمیر کے مظلوم لوگوں کو ہمیشہ آزادی کے نام پر ہی نہ صرف لونتے تھے بلکہ کشمیری قوم کے جذبہ آزادی جیسے نیک اور مقدس جذبات کو کسی نے منبر، کسی نے اسٹچ اور کسی نے سازش کے راستے اپنے اقتدار کی سیڑھی بنایا۔

میرے قائد! حسین ابن علی کی راہ پر چلنے والے مردِ مجاهد کی ساری زندگی ظلم اور خیر کے زندانوں سے لڑتے ہوئے گزری۔ انہوں نے پاکستان کی اپیشل کورٹ میں لالکار کر کہا کہ ”میں نے زندگی کے ہر موڑ پر حق و انصاف کا ساتھ دیا ہے۔ اور ظلم و استھصال کے خلاف مصروف جنگ عوام کی نہ صرف جماعت کی ہے بلکہ اس جنگ میں مظلوم عوام کا نقیب اور مدعی رہا ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر یہ روں اپنے لیے متعین کیا ہے اس لیے کہ میں اسے انبیاء کی سنت اور انقلابیوں کا شیوه تصور کرتا ہوں۔“

مقبول بٹ واقعی ظلم و جبرا کی قوتوں کے خلاف ایک ننگی تلوار تھے، ان کے نزدیک ظلم انفرادی ہو یا اجتماعی ہو۔ ظالم کے ہاتھ روکنا سب سے بڑا فرض ہے۔ وہ جیل میں انفرادی انداز سے ہونے والے ظلم کے خلاف بھی ڈٹ جاتے تھے۔

1969ء اکتوبر کی بات ہے کہ راولپنڈی میں جب الطاف المعروف اعظم انقلابی اور میں یعنی عرف فیروز، مقبول بٹ جیسے راہبر سے الگ الگ تربیت حاصل کرتے تھے۔ اعظم انقلابی کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ مقبول بٹ کس طرح ایک ایک جزیات پر سوال کرتے تھے اور کتنی لگن اور خلوص کے ساتھ جدوجہد میں آنے والی تمام مشکلات اور حادثات کی نشاندہی کرتے تھے۔ جو جو لائی کی تیقی ہوئی گرمی میں جب مجھے تربیت دیتے تھے تو ایک بار راولپنڈی کے ریس کورس گراؤنڈ کے تین چکر لگوائے اور خود بھی میرے ساتھ دوڑتے رہے اور جب گرمی کی شدت سے میں گر گیا تو شفیق اسٹادو کی طرح فوراً

پیورنٹ جو ساتھ ہی تھا لے گئے اور ٹھنڈا اپلایا۔ مجھے تربیت دینے والے نے بٹ صاحب سے شکایت کی کہ یہ ”دوزتے وقت منہ کھلا رکھتے ہیں“ اور بٹ صاحب دوزتے وقت منہ بندر کھنے کی تربیت دینے کے لیے خود بھی گرمیوں میں اکثر ریس کورس گراؤنڈ میں میرے ساتھ دوزتے تھے۔ سب سے بڑی خوبی جو شہید و فاماں تھی کہ وہ کبھی بھی کشمیر کی آزادی کے جذباتی نوجوانوں کے جذبات کا نام تو خود استحصال کیا اور نہ ہی کسی کو استحصال کرنے دیا۔ ان کی تمام تر کوشش ہوتی تھی کہ آزادی کی جدوجہد میں جو جذباتی نوجوان صرف جذبہ آزادی لے کر شامل ہوں اُن کو شعور اور فکر آزادی سے رُوشاس کرایا جائے اور وہ اس سلسلے میں گھنٹوں خاندانی پس منظر ماں باپ بہن بھائیوں کے رشتتوں اور ذمہ داریوں کے حوالے سے باتیں کرتے تھے اور جدوجہد کے دوران پیش آنے والے تمام حالات اور مشکلات کے بارے میں بھی آگاہ کرتے تھے تاکہ جدوجہد کے دوران پیش آنے والے ظلم و جبراً و تکلیفوں کا شعور اور فکر کے ساتھ حریت پسند مقابلہ کریں۔ یہی تربیت تھی جس کی وجہ سے شاہی قلعہ جیسے عقوبت خانے میں ظلم کا مقابلہ کیا اور 9 سال تک پاکستان کی (13) جیلوں میں ظلم و جبراً کے خلاف لڑتا رہا اور مظلوم کے اوپر اٹھنے والے ہر ظالم کے ہاتھ کو روکنے کی کوشش میں، میں نے 22,22 دن تک ٹھوک ہڑتا لیں کی ہیں۔ بٹ صاحب اکثر کہتے تھے کہ آزادی کے سپاہی کے لیے جس قدر جسمانی تربیت اور اسلحہ کی تربیت ضروری ہے اُس سے زیادہ ضرورت شعور اور فکر کی ہے تاکہ ایک جذباتی سپاہی کا اُس کے جذبات کے سہارے کوئی استحصال نہ کرے۔ اسی لیے مقبول بٹ شہید کی ہر تقریر اور تحریر سے فکر اور شعور کی روشنی برتنی ہے مگر صرف اُن لوگوں کے لیے جو اندھی عقیدت کے بجائے فکر اور شعور کی آنکھ سے ان تحریروں اور تقریروں سے رہبری حاصل کرنے کی جستجو کریں۔ انہوں نے کبھی بھی کارکن کو اندھی تقلید کا درس نہیں دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہربات اُن سے کی جاسکتی تھی۔

مقبول بٹ شہید کے ساتھ نہ صرف ایک کارکن کی حیثیت سے بلکہ ایک ادنیٰ سپاہی اور شاگرد کی حیثیت سے جو بھی عرصہ گز رکیا چاہے وہ ان سے تربیت حاصل کرتے ہوئے سیاہی پیچھر لیتے ہوئے یا شاہی قلعہ میں ایک دوسرے کی چینی سننے ہوئے یا جیل میں بسر ہوا یہ سارا عرصہ میری زندگی کا ایک انہوں خزانہ ہے جو دنیا کے تمام مادی خزانوں سے بڑا ہے۔ میں نے متواتر غور کیا کہ کیا وجہ ہے کہ مقبول

بٹ شہید کے ساتھ جو ایک دفعہ بھی کارکن ساختی یا سپاہی کی حیثیت سے کام کرتا ہے وہ ان کا گروپرہ ہو جاتا تھا اور سوائے ان کے بد بخت سیاسی مفادات کے بھینٹ چڑھے ہوئے مخالفوں کے کسی نے بٹ صاحب کی کبھی مخالفت نہ کی۔ اصل میں وہ خلوص دیانتداری اور سچائی کے جیتنے جاگتے وجود کے علاوہ بہت ہی با اخلاق تھے اور بہت دھیکی آواز میں اپنے موقف کی حمایت میں بات کرتے تھے اور تاریخ کے حوالے سے اپنے موقف کی وضاحت کرتے۔ سیاست، ادب اور تاریخ کا گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں کی جیلوں میں ان کی بہادری اور تدبیر کی کہانیاں مشہور ہیں۔ جب ہم گناہائی جینگ کیس کے خصوصی کورٹ میں مارشل لاءِ ریگولیشن کے تحت کیس کا سامنا کر رہے تھے۔ تو اکثر ہم ان گھناؤنے الازمات سے گھبرا تے تھے جو ہم پر پاکستان کے ایک فوجی ٹولے اور نوکر شاہی نے لگائے تھے لیکن مجال ہے کہ بٹ صاحب کے چہرے پر کوئی فکر یا پریشانی کی شکن آئے، وہ خود بھی جیل میں ہنتے تھے اور ہم ساتھیوں کو بھی ہنساتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ اور کروڑ پتی ساختی جناب جی۔ ایم۔ لوں مرحوم اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتے تھے۔ بٹ صاحب ان کو حوصلہ دیتے تھے اور کہتے تھے لوں صاحب اپنی صحت تباہ نہ کریں۔ جو رضاۓ الہی ہو گا وہی ہو گا۔ اور اکثر کہتے تھے کہ ”تحریک آزادی لڑنے والوں کے فیصلے کبھی بھی مروجہ عدالتوں میں نہیں ہوتے بلکہ تاریخ کے ایوانوں میں ہوتے ہیں۔ اگر عدالتی فیصلوں سے حریت کے متوالوں کو روکا جاتا تو آفرینش نسل سے آج تک دنیا میں کوئی قوم آزاد نہ ہوتی“ میں شدید ترین جذباتی آدمی تھا۔ اور میرے لیے نفرت یا محبت خوشی یا غم کے وقت جذبات کو قابو میں رکھنا ممکن تھا اور میرے لیے کبھی بھی یہ ممکن نہ تھا کہ میں اپنی جذباتی طبیعت پر قابو پالوں گا۔ مگر یہ مقبول بٹ جیسا عظیم انقلابی ہی تھا جو شفیق باپ بن کر بھی تربیت دیتا رہا۔ اور ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ اپنے جذبات کو انقلابی شعور اور فکر کی لگام دو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلح جدوجہد کی ابتداء کرنے والوں میں شمار ہونے کے باوجود میں نے انقلابی شعور اور نظریاتی پیانے پر کشمیر میں ہونے والے ہر دفعے کو پر کھا اور اپنے رہبر کے بخشے ہوئے شعور کی روشنی میں جب بھی کشمیر میں ہونے والی جدوجہد کو دیکھا تو میں نے تعمیری تقید سے اجتناب نہیں کیا۔ حالانکہ جذباتی اور مفادات کے چکروں میں پھنسنے ہوئے لوگوں نے میری تعمیری تقید پر مجھ پر گھٹیا جملے کیے۔ مگر مجھے اس کی کبھی پرواہ

نہ رہی کیوں کہ بٹ صاحب کہتے تھے کہ ”جدوجہد کے عمل کے دوران ایسے لمحات بھی آئیں گے جب تم کسی بھی عمل کے پیچھے ساری قوم کو جذباتی ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہو، مگر شعور کی روشنی میں اگر وہ عمل تمہیں ملک اور قوم کے لیے نقصان دہ نظر آتا ہو، تو اپنے نفع و نقصان و بدنامی کی پرواہ کیے بغیر اس کے ہر پہلو کو عوام کے سامنے لانا تمہاری انقلابی اور اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے۔“

بٹ صاحب! عوام سے اور عام آدمی سے محبت کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ عام آدمی سے سیکھو یہی عام آدمی علم کا سمندر ہے۔ ان کے لیے جنگ لڑ رہے ہو تو ان میں رہ کر جنگ لڑو۔ ان سے بحث کرو واقعات کو سمجھنے اور پر کھنے کا شعور ان کو دو۔ ان کے نزدیک عام آدمی کو حقائق سے بے خبر رکھنا سب سے بڑا گناہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جب تم عام آدمی کی بہتری کے لیے جدوجہد کر رہے ہو تو اس جدوجہد سے عام آدمی کو بھی باخبر رکھو۔ وہ قوموں کے ذکر سکھ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے کارکن کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے تھے کہ ایک تو کارکن کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا تھا اور دوسروں کو یہ تاثر ملتا تھا کہ یہ بٹ صاحب کا قربی ساتھی ہے۔

ایک دفعہ کوٹ لکھپت جیل لاہور میں ”بنگلہ دیش نامنور“ کی تحریک میں شوڈنٹ گرفتار ہو کر آئے جن میں جاوید ہاشمی بھی تھے۔ ان کے ساتھ جیل حکام کا رویہ بڑا نامناسب تھا اور ان کو جو دال روٹی ملتی تھی وہ اکثر کنکروں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ (اگرچہ پاکستانی جیلوں میں قیدیوں کو دی جانے والی خوراک میں سے آدمی جیل حکام کے گھروں میں جاتی ہے اور تمام قیدیوں کو کنکروں اور پانی کی طرح دال روٹی ہی دی جاتی ہے)۔ ان شوڈنٹ نے ہم سے کہا کہ ”ہمیں کنکروں والی دال روٹی دی جاتی ہے۔“ میں نے اور اشرف نے ان کو جواب دیا کہ ”تم یہ دال روٹی پر نہنڈنٹ کے منہ پر کیوں نہیں مارتے جب کہ تم باہر بھٹو جیسی حکومت سے نکلے کر آئے ہو۔“ اور میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر جیل کی دیوار پر چڑھ کر ان سے باتیں کیں اور ان کو حوصلہ دیا۔ اُسی دن شام کو جیل حکام نے ہم چھ ساتھیوں کو ایک جگہ بی کلاس سے الگ الگ کر دیا۔ مجھے اشرف بھائی اور بٹ صاحب کو ایک ہی سیل میں بند کر دیا اور جنوری فروری کے مہینے میں تین عدد انتہائی باریک کمبل دیئے اور بٹ صاحب نے اس واقعے کو کوئی اہمیت نہ دی کیوں کہ وہ کہتے تھے کہ جیل حکام ہمیں تکلیف پہنچانے اور سزا دینے کے خیال سے ایسا

کرتے ہیں۔ اور اگر ہم لوگ اس کا شدت سے احساس کریں گے تو جیل حکام کا منشاء اور مرضی پوری ہوگی اس لیے ایسے واقعات کا احساس نہ کرو اور وہ میل میں آزادی کا گیت گاتے تھے۔ میں (فونٹھ) منی کا گڑھا اور اشرف بھائی تھاںی، بجا کر میوزک پیدا کرتے تھے۔ اور بٹ صاحب اکثر گاتے تھے۔ کشمیری اور پہاڑی زبان میں ”ٹوکہ ٹور یلے گڑھ شیترون پنجرون آدمی جیسے سین ارمان“، یعنی جب لوہے کے پنجھے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ تب جا کر ہمارے ارمان پورے ہوں گے اور دوسرا ”لگا آجایا“ جیل حکام نے بٹ صاحب کو تیرے دن کہا کہ آپ اور اشرف قریشی واپس بی کلاس میں جاسکتے ہیں۔ مگر ہاشم قریشی دیوار پر چڑھنے کی وجہ سے ابھی واپس نہیں جا سکتا۔ میرے محبوب قائد نے فوراً جواب دیا ”ہم انقلابی لوگ ہیں سزا اور انعام مشترکہ طور پر بانت کر کھانے کے عادی ہیں اور محمد ہاشم نے تو ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی“، اور اس سارے واقعے کا اثر یہ ضرور ہوا کہ معصوم سٹوڈنٹ کو دال روئی کنکروں کے بغیر اور اچھی طرح صاف سُتھری ملنے لگی تھی۔

بٹ صاحب کی بے غرضی اور کارکن سے محبت کا ثبوت اس سے بڑا کیا ہو گا کہ اپیشل کورس کے نج نے بٹ صاحب کو کہا کہ ”ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کی بی کلاس کا فیصلہ تو ہوم سیکرٹری کریں گے مگر آپ بی کلاس کے حقدار ہیں۔ اور ہم بی کلاس آپ کو دینے کا حکم دیں گے۔“ میرے قائد اور غریب رہبر نے جواب دیا تھا۔ کھدر کا قمیض شلوار پہن کر ”جناب والا میں تب تک بی کلاس نہیں ٹوں گا جب تک میرے ان دونوں بیٹوں اشرف قریشی اور ہاشم قریشی کو بھی بی کلاس نہیں ملتی۔ اور میں تب تک ان کے ساتھ ہی سی کلاس کی سیل میں رہوں گا“ حالانکہ ہمارے تین دوسرے سینئر ساتھی بی کلاس میں رہتے تھے۔ جون جولائی 1970ء کی بات ہے کہ جب شہید رہبر، میں اور صادق نامی گائیڈ شنکیاری سے پیدل چل کر بالا کوٹ کے راستے بندہ کونڈی سے ہوتے ہوئے بابو سرکار اس کے ساتھ ہی پہاڑی عبور کر کے کشن گنا (نیلم) دیلی کی طرف جانا تھا۔ تاکہ وہاں سے ایک اور گائیڈ کے ساتھ وادی کشمیر میں اسلحہ سمیت داخل ہو جاؤں کیوں کہ مظفر آباد کے راستے نیلم دیلی جانے میں خطرہ یہ تھا کہ LIA فیلڈ آئیلی جس لیونٹ ہمیں پکڑنے لیں۔ جون کا مہینہ تھا مگر بابو سرکار کے پاس بر فہاری ہو رہی تھی اور ہمیں دو دن وہاں کراس کرنے سے پہلے رکنا پڑا اور اس دوران رات کو ہم تینوں باری باری جاگ کر ڈیوٹی دیتے تھے اور



(141)

پھر جتنا بھی لٹر پچر اور اسلجھ تھا اس کو بھی برابر وزن میں تقسیم کیا اور خود بھی ایک حصہ لے کر چلتے تھے اور جب ہم پہاڑی چڑھنے لگے تو میں بٹ صاحب سے پیچھے رہ گیا اور جب میں تھک گیا۔ بٹ صاحب واپس آئے اور میر ابو جھن خود انھا کر مجھے حوصلہ دے کر پہاڑ کر اس کرایا۔ یاد رہے میری عمر اس وقت 17 سال کے تریب تھی وہ مشق اُستاد کے ساتھ تربیت میں سختی بھی کرتے تھے۔ جب میں رات کو آگ جلا کر اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ تو میں غالباً سو گیا تھا کہ بٹ صاحب چیک کرنے آئے اور مجھے سوتا ہوا پا کر میری ڈیوٹی دو گھنٹے سے تین گھنٹے کر دی تھی اور میرے اسی شفیق اُستاد کو سامراجی قوتوں کے آہ کاروں نے ظلم اور جبر کے بعد پاکستانی اور ہندوستانی حکمرانوں نے مختلف اوقات میں 15 سال تک قید تھائی میں رکھ کر پھانسی چڑھا دیا مگر وہ بھول گئے کہ اس سے پہلے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھی صلیب پر چڑھایا گیا تھا مگر ابن مریم علیہ السلام کا نام آج چاند سورج کی طرح چمک رہا ہے۔ سامراجی اور غاصب بھول گئے کہ میرے قائد کو پھانسی پر چڑھا کروہ انھیں ابدی زندگی دے رہے ہیں۔ مقبول بٹ کا نام اور جدوجہد سورج کی روشنی کی طرح اس دھرتی پر ہمیشہ مظلوموں اور حریت پسندوں کے لیے مشکل کا کام دے گا۔ بٹ صاحب بڑے با اخلاق تھے۔ جب ہم جیل میں تھے تو اردو ڈا جسٹ لاہور کے الطاف حسین قریشی اور مجیب الرحمن شامی اور پنجاب کے حسین نقی بھی وہاں مارشل لاءِ ریگولیشن کے تحت قید ہو کر آئے اردو ڈا جسٹ والے اور مجیب الرحمن شامی صاحب جناب بٹ صاحب سے ملنے سے پہلے قیوم خان کے بارے میں حُسن ظن رکھتے تھے۔ اور اس کے منافقانہ فعل کو نہیں پہچانتے تھے مگر بٹ صاحب گھنٹوں بحث کرتے تھے اور یوں رائٹ اور لفت یعنی حسین نقی صاحب کو کشمیر کے بارے میں اپنے نظریات کا قالی کیوں کہ بٹ صاحب دھیمی آواز میں بھر پور دلائل کے ساتھ تاریخی حوالوں سے اپنے نظریات کا دفاع کرتے تھے۔ اور جب بٹ صاحب شہید ہوئے تو مجیب الرحمن شامی نے ایک دل گدا مضمون لکھا تھا۔ اور جس کے آخر میں لکھا تھا ””مقبول بٹ تم ہمیشہ چیخ چیخ کرتے رہے کہ میں حریت پسند ہوں مگر کسی نے یقین نہیں کیا لیکن آج تو نے اپنے لہو کی سرفی سے ثابت کیا کہ تم نہ ہی ہندوستان کے اور نہ ہی پاکستان کے ایجنت تھے، بلکہ تم کشمیر اور کشمیریوں کی آزادی کے قائد تھے۔““

بٹ صاحب ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے تعلیم کا شوق تھا۔ سینٹ جوزف کالج

پارہ مولہ سے بی۔ اے کرنے کے بعد پشاور پاکستان منتقل ہوئے اور یہاں پشاور یونیورسٹی میں ایم اے کیا اور پشاور میں ہی ایک آزاد خیال اخبار روز نامہ "انجام" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انگریزی اخبار "ڈیلی نیبیر میل" کے چیف رپورٹر بٹ صاحب نے ذاتی زندگی میں خود کو بہت کچھ دکھ دیئے اور یہوی بچوں کے سلسلے میں کوئی بھی ذمہ داری پوری نہ کر پائے کیوں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کشمیر کی درماندہ اور مظلوم قوم کے لیے وقف کی تھی۔ جب 1976ء میں وہ دوبارہ سرینگر چلے گئے جب ان کی سزاۓ موت برقرار تھی اُس وقت ان کے دو بیٹوں اور ایک بچی کی عمر صرف اور صرف 9، 8 اور 10 سال کی تھی اور خدا کے سہارے کے سوا کوئی بھی آسرا ان کے لیے نہ چھوڑ گئے۔ میں جیل میں تھا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر غالباً وہ میں 1976ء میں گئے تھے۔ اور مجھ سے وہ مارچ میں ملنے آئے اور میرے لیے کھانا پھل وغیرہ لے آئے تھے اور مجھے حوصلہ دیا کہ میں نے اپیل سپریم کورٹ میں کردی ہے۔ اور جلد اپیل میں آپ رہا ہو کر ہم سے ملیں گے،" کاش مجھے احساس تک ہوتا کہ یہ میری اپنے قائد کے ساتھ آخری ملاقات ہو گی۔

بٹ صاحب نے ہائی جیکینگ کیس میں عدالت سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں نے نہ تو خود کوئی سازش تیار کی اور نہ ہی سازشیوں کے کسی گروہ میں شامل رہا ہوں۔ میرا کردار ہمیشہ واضح اور غیر مبہم رہا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ فرسودگی، دولت پسندی، استھان، ظلم، غلامی اور منافقت کے خلاف بغاوت کا مرتكب ہوا ہوں اور استعماری نظام کا پروردہ پاکستانی حکمران طبقہ جس کی نمائندگی اس ملک کی نوکر شاہی اور فوجی آمریت انجام دے رہی ہے اگر" اسے سازش،" قرار دے تو مجھے یہ الزام درست تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں"۔

مقبول بٹ شہید کبھی بھی کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں مصلحت کے شکار نہ رہے۔ وہ قطعی طور پر اور اٹل چنان کی طرح خود مختار کشمیر کے حامی تھے۔ جب کہ 1970ء کے ایام میں پاکستان میں نظریہ الحق پاکستان کے سوا اور کوئی نظریہ رکھنے والے کو "غدار" اور "ایجنت" کہا جاتا تھا۔ اور اسی الحق پاکستان کے نعرے کی وجہ سے قیوم خان نے 1969ء میں پوری پاکستانی اور کشمیری قوم کو "بیوقوف" بنا لیا۔ اور المجاہد نامی کاغذی تنظیم کے لیے کروڑوں روپیہ چندہ جمع کر کے کھا گئے لیکن بٹ

صاحب خود مختار کشمیر کو ہندوستان پاکستان اور کشمیر کے کردوں عوام کی بہتری کے لیے واحد حل سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان یا پاکستان کے عام آدمی مزدور، کسان کے دشمن نہ تھے اُن کا کہنا تھا کہ جنوبی ایشیاء میں پائیدار امن کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ملک ہندوستان اور پاکستان کشمیر سے دستبردار ہو جائیں۔

بٹ صاحب کشمیری عوام اور کشمیر کا دشمن بیرونی طاقتوں سے زیادہ اندر ونی غذہ اروں کو سمجھتے تھے۔ وہ کشمیریوں کے مسائل میں، غلامی میں بنتا کرنے کا ذمہ دار کشمیر کی دونوں طرف کی لیڈر شپ کو سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا جس قدر شیخ عبداللہ پر کشمیری قوم نے بھروسہ کیا کاش مجھ پر ایسا بھروسہ کرتے تو میں کشمیریوں کو دہلی میں اپنے اقتدار کے لیے گروہ رکھنے کے بجائے 5 سال کے اندر عزت اور آزادی سے ہمکنار کرتا۔ وہ اکثر تاریخی کردار سے کشمیر کی مکار لیڈر شپ کے بارے میں پچھر دیتے تھے۔ ہم قیوم خان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ کیوں کہ ہم وادی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں جب پوچھتے تو بٹ صاحب کہتے تھے کہ مجھے کسی سے بھی ذاتی دشمنی نہیں ہے لیکن قیوم خان اپنے آپ کو ”مجاہد اول“ کہہ کر ان شہیدوں کی توہین کرتے ہیں جنہوں نے کشمیر کی آزادی کے لیے گناہی کی موت قبول کی۔ آزاد کشمیر کے مخلص لوگوں کے مقدس جذبہ آزادی کا استھان کر کے ہمیشہ اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔ یہاں تک کہ اسلام کے مقدس نام اور نظام کو بھی نہیں بخشا اور کشمیر کی آزادی کے نام پر کروڑوں روپیہ الحاہد نامی تنظیم کے نام پر جمع کر کے ہضم کر گئے اور یہ تحریک آزادی کے لیے نقصان دہ ہے اور حقیقی جنگ آزادی لڑنے والے حریت پسندوں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ جب ہم نے بٹ صاحب کے منصوبے کے مطابق گنگانا می طیارہ انغواء کیا۔ تو قیوم خان اُس وقت آزاد کشمیر کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی غفار خان کو لا ہور بٹ صاحب کے پاس بیچ کر یہ پیش کی تھی کہ ”آپ گنگا طیارے کے کارنامے کو ”المجاہد“ تنظیم کے کھاتے میں ڈال دو تو میں 10 لاکھ روپیہ دوں گا اور الحاہد کا کمانڈر بناؤں گا“ حالانکہ اس کا وجود کاغذ کے سوا عملی طور پر کہیں بھی نہ تھا۔ بٹ صاحب غصے سے لال ہو گئے اور کہہ رہے تھے کہ ”یہ میں بکاؤ مال سمجھ کر خریدنے لکلا ہے۔ ہم تو ساری دنیا کی بادشاہی اپنے جذبہ حریت کے آگے حفیر سمجھتے ہیں“۔

اور آج جب امان اللہ خان اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے چند افراد نے قیوم خان کے ساتھ اتحاد کیا تو ان کے "شعر" پر ماتم کرنے کو جی کرتا ہے کیونکہ میں نے چند ماہ پہلے جب یہ اتحاد بناتھا اسے مفادات، ذاتی مفادات اور اقتدار کے لیے اتحاد قرار دیا تھا اور چند ماہ کے اندر ہی اس اتحاد سے آزاد مسلم کا نفرس اور کے۔ اپنے خورشید صاحب کی بربادی لیگ الگ ہو چکی ہے کیوں کہ یہ اتحاد ماضی کی طرح کشمیر کی آزادی کے نام پر ہوس پرست لیڈروں کا اتحاد ہے اور پھر امان اللہ خان یا اس اتحاد کے حامی کس زبان سے اب مقبول بٹ شہید کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ جب کہ امان اللہ خان اُسی عقیق خان (قیوم خان کے بیٹے) کی بغل میں نیو یارک کی یاترا کر کے آئے، جس عقیق خان نے مقبول بٹ کے بارے میں مظفر آباد میں کہا تھا۔ "مقبول بٹ کی ماں کو لے آؤ ہم بے شمار مقبول بٹ پیدا کریں گے" کیوں کہ N.S.F کے سٹوڈنٹ نے آزاد کشمیر کے درود یا پر نظرے لکھے تھے کہ "کشمیر کی ماو! کشمیر کو قیوم خان جیسے نہیں بلکہ مقبول بٹ جیسے عظیم بیٹے دو" اور پھر مسلم کا نفرس اور قیوم خان کے ماضی کا 42 سالہ سیاسی کردار سامنے رکھ کر تجزیہ کریں انہوں نے تحریک آزادی کو ہمیشہ نقصان پہنچایا اور کشمیر کی آزادی کا نام استعمال کر کے آزاد کشمیر میں اقتدار حاصل کیا۔ ان کو کشمیر کی آزادی سے کبھی بھی عملی طور پر دلچسپی نہ رہی بلکہ صرف اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح مقبول بٹ کی جدوجہدان کی سوچ، ان کے جذبوں اُن کی قربانیوں کی توہین کی ہے اور جب شہید ہونے کے بعد ساری قوم اور دنیا مقبول بٹ کو عظیم شہید قرار دیتے تھے تو قیوم خان نے بٹ صاحب کی کردار کشی کی۔ آج مقبول بٹ شہید کی روح بے چین ہو گی۔ آخر میں بٹ صاحب کے ہی تاریخی جملوں پر ختم کرتا ہوں کہ

"میرے ساتھ صرف اُس وقت انصاف ہو گا یہ انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہو گا"

محج پر عائد کیا جانے والا ہندوستانی قابض حکام کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہو گا کہ میں نے

پاکستانی ایجنت بن کر مقبوضہ کشمیر میں حکومت کا تختہ اللہ کی تکمیل کے لیے وہاں قتل و غارت

گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور پاکستانی نوکر شاہی کا یہ الزام بھی بے بنیاد ثابت ہو گا کہ

میں نے ہندوستانی ایجنت بن کر ہائی جیکنگ جیسا حریت پسندانہ آپریشن کرایا۔"

اے میرے محبوب تاائد! آج تیرے یہ الفاظ کس قدر سچائی بن کر کشمیر کی فضاوں میں گھونج

رہے ہیں اور آج تو ابدی نیند سویا ہوا ہے تیرا مقبرہ ظاہری طور پر کہیں نہیں ہے مگر تاریخ فیصلہ دے چکی

(145)

ہے اور تیرا مقبرہ کشیر کے ہر فرد اور آزادی چاہنے والے ہر انسان کے دل میں بن گیا ہے اور تو! جنگ آزادی لڑنے والے حریت پسندوں کے لیے مینار نور بن کر رہبی کر رہا ہے۔ تو زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ مقبول بٹ زندہ باد۔

(ہفت روزہ قائد 7 تا 14 فروری 1990)



یادوں کی مہکتی کلیاں

ڈاکٹر فاروق حیدر (راولپنڈی)

مقبول بٹ سری نگر جیل سے فرار ہو کر آئے تھے اور بلیک فورٹ مظفر آباد میں زیر حرast تھے۔ محاذ رائے شماری نے ان کی رہائی کے لیے تحریک شروع کی ہوئی تھی۔ 18 مارچ 1969 کو ایوب خان نے راولپنڈی کے مقام پر ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائی تھی جو پاکستان کے سیاسی و انتظامی حالات کے تناظر میں تھی۔ محاذ کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ اس موقع پر کانفرنس حال کے باہر مظاہر کیا جائے اور مقبول بٹ کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے زبردست مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجے میں دو روز بعد یعنی 20 مارچ 1969 کو انہیں رہا کر دیا گیا۔ ان کو اسی روز راولپنڈی لا یا گیا۔ ریکس ہوٹل راولپنڈی میں محاذ رائے شماری کا دفتر تھا۔ پارٹی قائدین اور کارکنوں نے ان کا زبردست استقبال کیا۔ اسی موقع پر میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہاں میر عبدالقیوم صاحب نے میرا ان سے تعارف کروایا۔ وہ جب 1966 میں کشمیر گئے تھے اس وقت میں انہیں محاذ میں شامل نہیں ہوا تھا۔

میرا بٹ صاحب سے زبانی تعارف 1967 میں ہوا تھا۔ میر عبدالقیوم صاحب مجرماں اللہ صاحب کو راولپنڈی میرے پاس لائے۔ انہوں نے مجھے بٹ صاحب کے مشن اور ان کی گرفتاری کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں۔ بٹ صاحب اور مجرماں اللہ 1966 میں اکٹھے بھارتی مقبوضہ کشمیر گئے تھے۔ گوریلہ سرگرمیوں کے دوران بٹ صاحب تو گرفتار ہو گئے اور نگزیب شہید ہو گیا۔ مجرماں اللہ گرفتاری سے بچ گئے اور پاکستان واپس آگئے۔

میر عبدالقیوم صاحب نے مجھے مجرماں اللہ سے متعارف کرواتے ہوئے تاکید کی کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں اسلحہ کی سپلائی اور ریونگ کیمپ قائم کرنے کے سلسلے میں میجر صاحب سے تعاون کروں۔ چنانچہ میں اسی روز سے ان سرگرمیوں کا حصہ بن گیا۔ عطیات، سامان اور رقم جمع کرتا رہا اور

بیہر امان اللہ کو دیتا رہا۔ ہم نے تھوڑا عرصہ کام کیا لیکن بٹ صاحب کے فرار ہو کر آنے سے قبل ہی مجاز کی ہلی کمان، جی ایم لوں، میر عبدالقیوم، امان اللہ اور صدیق بابا وغیرہ کے میجر امان اللہ سے کچھ اختلافات ہو گئے اور وہ مجاز سے علیحدہ ہو گئے۔

بٹ صاحب سے پہلی ملاقات کے وقت میری عمر 32 برس تھی اور میں راولپنڈی صدر میں بھیت پر ایسیویٹ ڈاکٹر پریکٹس کرتا تھا۔ اس کلینک کو میں اب تک چلا رہا ہوں۔ بٹ صاحب یہاں سے فارغ ہو کر گھر والوں سے ملاقات کرنے پشاور چلے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ میں سید عاجل سے آ رہا ہوں واپس آ کر دوبارہ کام شروع کریں گے۔

وہ اپریل میں واپس آگئے۔ میں پشاور روڈ پر رہ رہا تھا۔ وہاں ہم نے اپنا آپریشن ہیڈ کوارٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ وہیں سے ہم کشمیر میں ہونے والی تمام کارروائیوں کو کنشول کرتے۔ اس دوران ہم نے جو بڑے بڑے آپریشن بھارتی مقبوضہ کشمیر میں کئے ان میں ستواری چھاؤنی جموں میں راج رائلز کی بارک میں دھماکے کئے۔ ان کے ڈپو ہیڈ کوارٹر پر بھی دھماکہ کیا۔ انڈیا نے سمجھا کہ سکھو جیوں نے یہ دھماکے کئے ہیں۔

ہم نے سیالکوٹ میں بھی مرکز قائم کیا۔ پاکستانی اخبارات نے ہماری ان کارروائیوں کو کورٹ پر دیتے ہوئے شہ سرخیاں لگائیں۔ لیکن حکومت نے یہ اخبارات مارکیٹ میں جانے سے روک دیئے۔ انڈیا کو این ایل ایف کی کارروائیوں سے آگاہی ہو گئی تھی۔ اس نے پاکستان سے احتجاج کیا کہ ان لوگوں کو روکا جائے۔ چنانچہ پاکستان حکومت نے ہمیں نوٹس بھیجے۔ جن کا عنوان تھا "private efforts for the enemies should be stop, Crush and arrest them"

سپیشل انسپکٹر جنس برائج والوں نے یہ نوٹس جاری کئے تھے۔ جب بٹ صاحب نے گوریلہ سرگرمیوں کا دوبارہ آغاز کیا تو وہ تربیت دینے سے لے کر سامان لانے، لے جانے تک سب کام خود کرتے تھے۔ شروع میں وہ پشاور سے اسلحہ بھی خود لاتے تھے۔ وہ فروٹ کی ٹوکریاں لاتے جن میں اسلوچ رکھا ہوتا تھا۔ عام بس یا ویگن پر سفر کرتے تھے۔ ایک دفعہ اسلحہ لے کر آئے تو بتانے لگے کہ آج میں پلا گیا تھا۔ پوچھا وہ کیسے تو بتانے لگے کہ راستے میں سامان چیک کرنے والوں نے گاڑی روک کر

بیگر امان اللہ کو دیتا رہا۔ ہم نے تھوڑا عرصہ کام کیا لیکن بٹ صاحب کے فرار ہو کر آنے سے قبل ہی مجاز کی ہائی کمان، جی ایم لوں، میر عبدالقیوم، امان اللہ اور صدیق بابا وغیرہ کے می مجر امان اللہ سے کچھ اختلافات ہو گئے اور وہ مجاز سے علیحدہ ہو گئے۔

بٹ صاحب سے پہلی ملاقات کے وقت میری عمر 32 برس تھی اور میں راولپنڈی صدر میں بھیث پرائیویٹ ڈاکٹر پریس کرتا تھا۔ اس کلینک کو میں اب تک چلا رہا ہوں۔ بٹ صاحب یہاں سے فارغ ہو کر گھر والوں سے ملاقات کرنے پشاور چلے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ میں سید حجاجیل سے آ رہوں واپس آ کر دوبارہ کام شروع کریں گے۔

وہ اپریل میں واپس آگئے۔ میں پشاور روڈ پر رہ رہا تھا۔ وہاں ہم نے اپنا آپریشن ہیڈ کوارٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ وہیں سے ہم کشمیر میں ہونے والی تمام کارروائیوں کو کنٹرول کرتے۔ اس دوران ہم نے جو بڑے بڑے آپریشن بھارتی مقبوضہ کشمیر میں کئے ان میں ستواری چھاؤنی جموں میں راج رائفلز کی بارک میں دھماکے کئے۔ ان کے ڈپ ہیڈ کوارٹر پر بھی دھماکہ کیا۔ انڈیا نے سمجھا کہ سکھ فوجیوں نے یہ دھماکے کئے ہیں۔

ہم نے سیالکوٹ میں بھی مرکز قائم کیا۔ پاکستانی اخبارات نے ہماری ان کارروائیوں کو کورنچ دیتے ہوئے شہ سرخیاں لگائیں۔ لیکن حکومت نے یہ اخبارات مار کیٹ میں جانے سے روک دیئے۔ انڈیا کو این ایف کی کارروائیوں سے آنکھی ہو گئی تھی۔ اس نے پاکستان سے احتجاج کیا کہ ان لوگوں کو روکا جائے۔ چنانچہ پاکستان حکومت نے ہمیں نوٹس بھیجے۔ جن کا عنوان تھا

"private efforts for the enemies should be stop, Crush and arrest them"

پیش اثنیلی جنس برائج والوں نے یہ نوٹس جاری کئے تھے۔ جب بٹ صاحب نے گوریلہ مرگر میوں کا دوبارہ آغاز کیا تو وہ تربیت دینے سے لے کر سامان لانے، لے جانے تک سب کام خود کرتے تھے۔ شروع میں وہ پشاور سے اسلحہ بھی خود لاتے تھے۔ وہ فروٹ کی ٹوکریاں لاتے جن میں الٹو رکھا ہوتا تھا۔ عام بس یا ویکن پر سفر کرتے تھے۔ ایک دفعہ اسلحہ لے کر آئے تو بتانے لگے کہ آج میں پلا گیا تھا۔ پوچھا وہ کیسے تو بتانے لگے کہ راستے میں سامان چیک کرنے والوں نے گاڑی روک کر

چینگ شروع کر دی۔ مجھ سے پوچھا تمہارا سامان کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اوپر ہے چیک کرو۔ لیکن انہوں نے میرا سامان چیک کئے بغیر چھوڑ دیا۔

کشیر کی آزادی کے لیے وہ گوریلہ جنگ کو ایک موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا پلان تھا کہ گوریلہ جنگ کے ذریعے ہندوستانی فوج کو مقبوضہ کشیر میں ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ وہ معاشی اور فوجی اعتبار سے کمزور ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں وہ کشیر کے مستقبل کے لیے مذکرات پر آمادہ ہو گا۔ اگر مذکرات میں لیٹ ولل یا ٹال مٹول کرے یا بے نتیجہ مذکرات میں الجھانا چاہے تو اس فورس کو اس وقت تک میدان میں رکھا جائے۔ اگر وہ سنجیدہ کوشش نہ کرے تو گوریلہ دستوں کو دوبارہ متحرک کر دیا جائے۔ اگر پھر بھی وہ "میں نہ مانوں" کی پالیسی پر گامزن رہے تو ان گوریلہ دستوں کو ایک لبریشن آرمی کی شکل دیتے ہوئے ہندوستان کے خلاف با قاعدہ گوریلہ جنگ لڑی جائے اور ہندوستانی فوج کے قبضے سے کشیر کو آزاد کر دانے کے لیے پوری قوت استعمال کی جائے۔

بٹ صاحب صحیح معنوں میں ایک گوریلہ لیڈر تھے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ دیباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی
بٹ صاحب کی زندگی کو جتنا میں جانتا ہوں 1967 سے مجھے یہی نظر آیا کہ وہ کوئی ڈرائیگ
روم کی سیاست کے لیڈرنہ تھے بلکہ فیلڈ میں لڑنے والے ایک حقیقی مجاہد تھے۔ انہوں نے اس راستے میں
نہایت خندہ پیشانی سے مشکلات کو برداشت کیا۔

انھیں روائی قسم کی سیاست سے عدم دلچسپی تھی۔ اس کے باوجود ان میں سیاسی بصیرت بدرجہ
اتم موجود تھی۔ سیاسی نظریات و افکار کے ساتھ ساتھ انھیں ہتھیاروں کے بارے میں بھی ٹھیک ٹھاک علم
تھا۔ وہ جسمانی اعتبار سے نہایت مضبوط تھے۔ یہ بات انہوں نے پہاڑوں میں کئی کنی روز پیدل چل کر
ثابت کر دی۔

جدید نظریات اور گوریلہ تحریکوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو پچی گویرا اور ماڈرے نگ کو

بہت پسند کرتے تھے۔ جب ہم نے گنگا ملیارے کے انہوں کے بعد دوبارہ کشمیر میں کارروائیاں شروع کرنے کا پروگرام بنایا تو وہ طریقے زیر بحث آئے۔ ایک چیز گویر اکا طریقہ یعنی خود اندر جا کر کارروائی کرنے کا طریقہ اور دوسرا میلز بنا کر براہ راست گوریلہ کارروائیاں کرنا۔ بٹ صاحب نے خود اندر جانے اور کارروائیاں کرنے کا طریقہ اختیار کیا اور یہی ان کا پسندیدہ راست تھا۔

کشمیر کی آزادی اور خوشحالی کا تصور ان کے دل و دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ حقیقت وہ ایک آزاد اور خوشحال، خود مختار، صاف سترہ، انسانی حقوق اور مساوات پر مبنی معاشرہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مثالی ریاست کا تصور رکھتے تھے۔ وہ اس تصور کو عملی جامعہ پہنانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جس طرح بیادی انسانی حقوق اور انسانی اقدار کی پامالی ہو رہی ہے، ہم ان معاشروں کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ ہمیں ان سے ہٹ کر اپنی تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کی روشنی میں ایک مثالی فلاجی ریاست قائم کرنا ہے۔ جو اس خطے میں واقعی ایک صاف سترہ مثالی ریاست ہو۔

آزاد کشمیر کی گندی سیاست سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جو دلچسپی تھی وہ صرف اس نقطہ نظر سے تھی کہ AJK کی سیاست کشمیر کی سیاست پر اثر انداز ہوتی تھی۔ انہوں نے جو ایکشن لڑا وہ بھی بیزاری اور دل شکنی کی حالت میں لڑا کیونکہ جماعت کی قیادت نے زبردستی ان پر یہ فیصلہ ٹھونسا۔ آزاد کشمیر کے عوام کے سائل کو وہ تمام کشمیری عوام کے سائل کے تناظر میں دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے آزادی اور خود مختاری ایک ایسی دو ایسے جس سے تمام بیماریوں کا حل کیا جاسکتا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ کشمیر کے ایک خود مختار ریاست ہونے کی صورت میں ہی ہمارے وسائل ہارے اپنے اختیار میں ہوں گے۔ بصورت دیگر تو پاکستان اور ہندوستان ہمارے وسائل لوٹتے رہیں گے۔ ہم اپنے بے پناہ قدرتی وسائل کو استعمال میں لا کر اپنے سائل کا حل نکالیں گے۔ لیکن اگر وسائل اسلام آباد یا دہلی اور ان کے کئے پتلی آلہ کاروں کے اختیار میں ہونگے تو پھر کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں ہو سکتا۔ بٹ صاحب کو کشمیری قیادت سے مغلہ ضرور تھا لیکن عوام سے کوئی مغلہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمزوری عوام میں نہیں ہوتی بلکہ قیادت میں ہوتی ہے۔ جو عوام کی قوت و طاقت کو ابھار کر میدان عمل میں

نہیں لاسکتی۔ ان کا نظریہ تھا کہ عوام میں ہمیشہ بے پناہ قوت موجود ہوتی ہے
روائی کشمیری لیڈروں سے انہیں شکوہ اس بات کا تھا کہ انہوں نے کشمیر کے اجتماعی قوی
مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دی ہوئی ہے اور وہ انہی ذاتی مفادات کے تحفظ اور بقا کے لیے پوری
قوم کے مفادات کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔ وہ کشمیر کو متحدا اور آزاد نہیں ہونے دیتے۔ مجاز رائے شماری
کے کچھ اپنے ساتھی بھی بٹ صاحب کی گوریلہ جنگ کے فلسفے کو نہیں سمجھتے تھے اور وہ اپنے دلائل دیتے
تھے پر امن حل کے لیے۔ ایسے ساتھی رکاوٹیں بھی کھڑی کرتے رہتے تھے۔

میں مقبول بٹ شہید کو اپنا استاد مانتا ہوں۔ میں نے سیاست ان سے سیکھی۔ ابتداء میں
ہتھیاروں کا استعمال ان سے سیکھا۔ وہ اپنے کارکنوں اور ساتھیوں کی تربیت اپنی قربت اور کردار سے
کرتے تھے۔ وہ نمود و نمائش کے قائل نہ تھے۔ جماعتی یا تحریکی مفادات میں کبھی کبھار ایسا کرنا پڑتا لیکن وہ
ذاتی طور پر نمود و نمائش سے ماوراء تھے۔

معاشری وسائل ان کی ایک بڑی مجبوری تھے۔ میر عبدالقیوم اور جی ایم لوں جیسے وفا شعرا اس
مجبوری کا حل نکالتے رہتے۔ وہ انسانی تکریم کے قائل تھے اور ہر انسان کے اچھے پہلو کو دیکھنے کے عادی
تھے۔ ان کے نزدیک دوستی کا معیار اور تصور صرف تحریکی دوستی تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی دوست،
ساتھی نہ تھا۔

انھیں جھوٹ، منافقت اور دوغلے پن سے نفرت تھی۔ چغل خوری کو وہ بڑی عادت سمجھتے
تھے۔ فیلڈ میں جو لوگ ذمہ داری اٹھا کر کام نہ کرتے یا غلط اطلاعات ان تک پہنچاتے ان سے وہ سخت
نفرت کرتے تھے۔ سیالکوٹ میں ہمیں جموں آپریشن کے بارے میں ایک شخص نے غلط اطلاع دی
۔ اس نے اندر کارروائی نہیں کی تھی لیکن بٹ صاحب کو اطلاع دی کہ کارروائی کر دی ہے۔ اس دن کے
بعد بٹ صاحب نے اس سے کبھی بات نہ کی۔

نمذبی اعتبار سے وہ رجعت پسند نہیں تھے۔ ان کا مذببی مطالعہ بہت اچھا تھا۔ وہ ہر آدمی سے
سے سیدھے اور صاف طریقے سے ملتے تھے۔ دل میں کسی قسم کی لگی لپٹی نہ رکھتے تھے۔ ان میں مصنوعی
پن نہیں تھا۔ صفائی کو بہت پسند کرتے تھے۔ بچوں سے بڑا شفقت بھرا رو یہ رکھتے تھے۔ ان کے پاس

بیٹھے اور بچوں کی طرح ان سے ملتے۔ کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں صفائی کو پسند کرتے تھے۔
کھانے میں انھیں چاول اور سرخ لوہیا کی دال بہت پسند تھی۔

بٹ صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پیچیدہ منسلکے کو بڑے آسان اور سادہ طریقے سے ڈیل کر لیتے تھے۔ اس کا حل بڑے آسان انداز میں نکال لیتے تھے۔

ان کی طبعت میں ایک ٹھہر اور مردانہ وجہت تھی جو چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔ ان کا قدر 5.8 نٹ تھا۔ جسم مضبوط اور پھر تیلا تھا۔ رنگ سفید گلابی تھا۔ گھنے اور سیدھے بال تھے۔ ماتھے پر ٹل تھا۔
موچیں بھاری تھیں جن کے آگے کٹ گلی ہوتی تھی۔

بٹ صاحب کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کا سحر تھا اور دبدبہ تھا۔ اس بارے میں دو لمحپ
واقعات لاحظہ فرمائیں۔

1975 کی بات ہے میری والدہ سی ایم ایچ راول پنڈی میں زیر علاج تھیں۔ میں اور بٹ صاحب ان کی خیریت دریافت کرنے جا رہے تھے۔ انھوں نے پینٹ کوٹ اور کالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔
ہم جی ایچ کیوں کی سائیڈ سے گزر رہے تھے۔ راستے میں سپاہی انھیں دیکھتے تو سیلوٹ کرتے۔ بٹ صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا "میں واحد ایسا عسکری ہوں جسے پاکستانی فوجی بھی سیلوٹ کرتے ہیں
اور ہندوستانی سپاہی بھی"۔

بٹ صاحب کے گائیڈ غفارشی نے بتایا کہ 1976 میں جب انہوں نے بارڈر لائن عبور کی تو بھارتی مقبوضہ علاقے میں ایک ہوٹل پر چائے پینے کے لیے بیٹھے۔ پولیس کا ایک سپاہی مشکوک نظر وہ سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بٹ صاحب کو اشارہ کیا کہ یہ آدمی ہمارے لیے خطرہ ہو سکتا ہے۔
بٹ صاحب نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ انھوں نے خصوص آرمی آفیسر کے لباس میں اسے اپنے پاس بلا یا اور بوث اتار کر اسے دیتے ہوئے کہا جاؤ یہ جلدی سے پالش کروالا ہو۔ وہ سپاہی آگے بڑھا اور جو تے اٹھا کر پالش کروالا یا۔ بٹ صاحب نے مجھے کہا "یہ
و پالش کے پیسے نج گئے ہیں یا آپ رکھ لیں"۔

بٹ صاحب کئی دفعہ رات کو دیر سے سوتے تو پھر دیر سے اٹھتے تھے۔ وہ ولیز کے گیریٹ

پیتے تھے۔ موسیقی سے انہیں لگاؤ تھا۔ انقلابی نغمے یا گانے زیادہ پسند کرتے تھے۔ ہم نے کبھی ان کو کسی آدمی کوڈا نہیں ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ مخلص اور ایماندار ساتھیوں کی تعریف کرتے تھے۔ وہ پشاور جاتے تو میں انہیں ندرو لانے کی فرماش کرتا تو وہ میرے لئے ندرو لے کر آتے۔ انہوں نے کبھی اس بات کا برا نہیں منایا۔

1976 میں بھارتی مقبوضہ کشمیر جاتے وقت میری رہائش گاہ سے ہی رخصت ہوئے۔ میرے مکان کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ ان کے دونوں ساتھی ریاض ڈار اور عبدالحمید بٹ ان کے ساتھ تھے۔ سیزہیوں سے اتر کر گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ بڑی گرمیوں سے مجھے ملے۔ ان کے ملنے کے انداز سے یوں لگا کہ جیسے شاید دوبارہ ملنا نصیب نہ ہو۔ وہ اس کا اظہار پہلے بھی کر چکے تھے۔ اس وقت کشمیری قوم کو مقبول بٹ کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید اس سے پہلے نہ تھی۔ بٹ صاحب سیاسی بصیرت اور عسکریت کا مجموعہ تھے۔

بالآخر 11 فروری 1984 کو شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہو کر سرزینِ کشمیر کا یہ مرد خدا میاب و کامران نہیں۔

(ملاقات 7 اکتوبر 1994 راولپنڈی)



شہید محمد مقبول بٹ سے ملاقات.....

چند یادداشتیں

اکرام اللہ خان جسواں

شہید محمد مقبول بٹ سے راقم کی پہلی ملاقات پشاور میں ہوئی۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب جموں کشمیر مجاز رائے شماری وجود میں نہ آئی تھی۔ جناب بٹ صاحب پشاور کے روز نامہ ”انجام“ میں ادارتی فرائض انعام دے رہے تھے اور مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید نے ”آزاد کشمیر کو تسلیم کرو“ کے نصب اعین کے تحت جموں کشمیر لبریشن لیگ کے نام سے اپنی جماعت تشكیل دے رکھی تھی۔ راقم اس نے نفرہ کا اصولی طور مخالف تھا اور اس کو قابل عمل نہ بھتنا تھا اور شہید محمد مقبول بٹ بھی اس کے مخالف تھے۔ یہ ملاقات دو دن تک جاری رہی اور مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں کے علاوہ کشمیر میں گوریلا جنگ کے متعلق بٹ صاحب نے مجھے مطمئن کرنے کی سرتوش کوشش کی۔ تاہم میں ان کے موقف سے قطعی طور مطمئن نہ ہو سکا اور یہ بحث کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ اگرچہ راقم رضا کارانہ طور بٹ صاحب سے ملنے گیا تھا لیکن بٹ صاحب کی مجھ سے دلچسپی شاید محض اس لیے تھی کہ میں نے انہیں آرمی میں ملازمت کی تھی لیکن بٹ صاحب نے مجھے اس قسم کا کوئی تاثر نہ دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ امان اللہ گلگتی نے میجر امان اللہ کی قیادت میں ایک گوریلا مشن مقبوضہ ہندوستانی کشمیر روانہ کر دیا جس میں بٹ صاحب شامل تھے۔ بعد میں یہ میجر امان اللہ گلگتی کا جہاز کے اغواء کے سلسلہ میں بٹ صاحب کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کیا اور بٹ صاحب کے کردار کو مشکوک ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ میجر امان اللہ کے انعام کے متعلق آگے ذکر کیا جائے گا۔

پشاور کی ملاقات کے بعد بٹ صاحب کو دوبارہ سیالکوٹ میں جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے پہلے کونشن کے موقعہ پر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان دنوں میں اخبار ”تعیر“ کا نامہ نگار تھا اور اسی حیثیت

سے اجلاس میں شریک ہوا تھا۔ سیالکوٹ کے مسلم کانفرسیوں نے سیالکوٹ شہر میں محاذ کے کارکنان کے خلاف بے حد اشتعال پھیلائ کھا تھا۔ تاہم رقم کو اور محمد مقبول بٹ کو جماعت کا عہدیدار منتخب کیا گیا۔ یہ وہ تاریخی اجلاس تھا جس کے منتخب عہدیداروں نے سیالکوٹ کے بارڈر پرسز میں جموں کی مٹی ہاتھ میں آٹھا کر حلف آٹھا یا تھا اور امان اللہ گلکتی کو جزل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ یہ شخص انگلینڈ جانے تک محاذ کا عہدیدار رہا اس طرح جماعتی آئین کے مطابق اس کا پہلے سے تیارہ شدہ ونگ اپنے داماغی تحفظات کے ساتھ اس میں شامل ہو گیا۔ مجلس عالمہ کے سیاسی ذہن رکھنے والوں نے سیاسی جماعت میں عسکری گروپ کی شمولیت پر بھر پور اعتراض کیا لیکن ونگ کے وقت یہ معاملہ الٹ جایا کرتا رہا۔ لہذا یہ جھگڑا چلتا رہا اور لبریشن فرنٹ بھی اپنی جگہ قائم رکھا گیا۔ جماعت کے صدر جناب عبدالحالق انصاری اگرچہ دلائل دیتے وقت بھگت سنگھ کی مثال دیتے تھے اور بتلاتے تھے کہ اگرچہ بھگت سنگھ کا انگریز کا ممبر نہ تھا لیکن جب اس کو دوسرائے نئی گاڑی کے نیچے بم رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تو اس کا مقدمہ کا انگریز نے لڑا۔ دوسری طرف دوٹ ڈالتے وقت محاذ رائے شماری کے عسکری ونگ کو ساتھ رکھنے کے بھی حمایتی تھے۔ اس طرح ہمارے عظیم ساتھی مرحوم غلام نبی گلکار، رقم اور محمد سعید شاہ ناز کی بھی صدر جماعت کا ہارت اور کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ کشمیری بے شک مارے جائیں۔ پاکستان کی سالمیت کو نقصان نہ پہنچا اور لوگ ہمیں بزرگوں میں شامل نہ کریں۔ ویسے بھی حکومت پاکستان ہماری جماعت سے زبانی ہمدردی کے جذبہ کا مظاہرہ کرتی تھی جس کو انگریزی میں *Lip sympathy* کہا جاتا ہے۔

نوکرشاہی ہمارے خلاف تھی اور یہ معاملہ آخری دم تک سدھرنہ سکا۔ جماعت ایک بھران اور انتشار کا شکار ہو گئی اور چند ایک نے محاذ رائے شماری سے عیحدگی اختیار کر لی۔ تاہم عیحدہ ہونے والوں کی تعداد آٹھ میں نمک کی مقدار سے بھی کم تھی۔ یہاں تک کہ ایک صبح اخبارات میں محمد مقبول بٹ کی گرفتاری اور اُن کے ایک ساتھی مسٹر ارنگزیب کی شہادت کی خبر شائع ہوئی۔ محمد مقبول بٹ کے دیگر ساتھی ہندوستانی مقبولہ کشمیر سے بھاگ کر آزاد کشمیر پہنچ گئے جن میں میجر امان اللہ بھی شامل تھا۔ اور ان کو یہاں گرفتار کر لیا گیا۔ آزاد کشمیر کے نوجوانوں میں اس کا گھبرا اڑ ہوا۔ جموں کشمیر محاذ رائے شماری نے اس واقعہ کی ملے جذبات کے ساتھ حمایت کی تاہم اس واقعہ میں عسکری ونگ کے چند لوگ انفرادی

طور ان کے صلاح کا رتھے، دوسری طرف یہ عجوب صورت حال تھی۔ جس سے محاذ کی مجلس عاملہ دو چار تھیں عسکری و نگ جماعت کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔

محمد مقبول بٹ اور ان کے دیگر ساتھیوں کے خلاف ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کی عدالت میں مقدمہ چلا۔ بٹ صاحب کا ایک ساتھی اور نگ زیب شہید ہو گیا تھا لیکن اس کے متعلق کسی جگہ کوئی ذکر نہ ہوا۔ ہاں بٹ صاحب کو مقبوضہ کشمیر کی عدالت نے سزاۓ موت سنادی ان کے دو دیگر ساتھیوں کو بھی سزاۓ گئی اور مقدمہ کا یہ باب ختم ہو گیا۔ چنانچہ محاذ کے چند اکابرین نے میجر امان اللہ سے بٹ صاحب کی رہائی کی تجویز پر اندر غور کرنا شروع کر دیا۔ میجر امان اللہ سے راقم تحریک آزادی کشمیر سے پہلے کا واقف تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران اس کا چال چلن اچھا نہ تھا اس لیے میں اُس سے قصداً ملاقات کا آرزو مند نہ تھا لیکن ایک دن سر راہ پشاور میں اُس سے ملاقات ہو گئی اور اُس نے مجھے اپنے گھر ملاقات کی دعوت دی۔ چنانچہ میجر امان اللہ سے تقریباً دس، بارہ گھنٹے ملاقات ہوئی۔ میجر امان اللہ نے مجھے بٹ صاحب کے خلاف کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اس کی باتوں میں کوئی صداقت نہ تھی اور میں متاثر نہ ہو سکا۔ پھر اس نے اپنی بیوی (بعد میں مطلقہ) یعنی امان اللہ خان کی بہن کے متعلق کچھ بتیں بتا کیں تو میرا دل بھر گیا۔ میں حیران تھا کہ کس بنیاد پر امان اللہ گلکتی نے ہمارے ایک مغلص دوست کو اس شخص کے حوالہ کر دیا۔ میں میجر امان اللہ کے گوریلا فلسفہ سے قطعی متاثر نہ ہوا بہر حال میں اس کی زبان درازیوں کی تائید نہ کر سکا۔ پھر میں میجر امان اللہ سے اس وقت قصد املا جب وہ ہندوستانی جہاز گنگا کیس میں استغاشہ کا گواہ بن آیا لیکن میری ملاقات سے پہلے اُس نے سودا کر لیا تھا۔ امان اللہ گلکتی کی حمایت جماعت کے کچھ لوگ کر رہے تھے اس لیے میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔

محمد مقبول بٹ کا جیل سے فرار :

موت کی سزا پائے چند ماہ گزرے ہوں گے کہ محمد مقبول بٹ اپنے دوسرا تھیوں سمیت جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان کے زیر انتظام علاقہ آزاد کشمیر آگئے۔ ان تینوں کو پاکستان سیکورٹی والوں نے گرفتار کر لیا۔ ان دونوں پاکستان میں محمد ایوب خان صدر پاکستان کے زوال کے دن تھے اور وہ ملک کے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ گول میز کا نفرنس میں مشغول تھے۔ جوں کشمیر محاذ

رائے شماری نے محمد مقبول بٹ کی پاکستان میں گرفتاری پر احتجاجی جلسے اور جلوس نکالے جس کے نتیجے میں دم توڑتی ہوئی ایوب خانی حکومت نے ان کو غیر مشرف طور پر رہا کر دیا۔

محمد مقبول بٹ جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے منتخب صدر :

محمد مقبول بٹ کے اچانک اور دلیرانہ جیل سے فرار نے پاکستان اور آزاد کشمیر کے ہر حلقوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے صدر جناب عبدالخالق انصاری نے اس خوشی میں جماعت کا کونشن بلا لیا اور اس ایکشن سے قبل جماعت کی مجلس عاملہ میں محمد مقبول بٹ کا نام صدارت کے لیے پیش کر دیا۔ راقم نے مجلس عاملہ کے اجلاس میں اس تجویز کی پرواز و مخالفت کی لیکن جزل کو نسل نے ان کو بھاری اکثریت نے کامیاب کر دیا۔ چنانچہ جناب محمد مقبول بٹ کو گوریلا تنظیم کی سربراہی کے علاوہ جماعت کی صدارت بھی تفویض کر دی گئی۔

محمد مقبول بٹ کی صدارت کی مخالفت کی وجوہات :

ا یہ کہ جماعت کے صدر کو صرف قوم و ملک کے مفادات کے خلاف کام کرنے پر تبدیل کیا جانا چاہیے۔ پھر یہ کہ پاکستان و ہندوستان میں متعدد سیاسی پارٹیاں ہیں جن کا صدر ہمیشہ ایک ہی فرد واحد ہوتا ہے۔

ب یہ کہ جموں کشمیر مجاز رائے شماری کی صدارت کے لیے مسٹر عبدالخالق انصاری سے زیادہ موزوں اور Presentable شخص ہمارے پاس نہیں ہے۔

ج یہ کہ محمد مقبول بٹ نے مجاز کو اطلاع دئے بغیر جنگ بندی لائی کو عبر کیا اور جماعتی آئین کی خلاف درزی کی ہے۔

د یہ کہ مسئلہ کشمیر میں کشمیریوں کے وکیل "پاکستان" کی نوکر شاہی نے ہر بار مسئلہ کشمیر کو اپنے اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے اور وہ کشمیر کے مسئلہ کو ایک کاشیبل کے ذریعہ فتح کرنے کی کوشش میں مشغول ہے۔ وہ محمد مقبول بٹ کی گوریلا کارروائی کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔ میں خود دل سے اس چار، پانچ رکنی کارروائی کو ریاست کی آزادی کے لیے کافی نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ میرے خیال میں جماعت کو مشکل ترین حالات سے دو چار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ گنگا کے ان غواہ کیس میں یہ بات ثابت ہو گئی

جب ہمارا کیل خود ہمارے خلاف مستغیث کی صورت میں سامنے آگیا۔

میرا عقیدہ تھا کہ ہمارے وکیل کی پالیسی کے پیش نظر مقبول بٹ کی دو یا چار رکنی گوریلا کا رواں ہندوستان کو کشمیر سے نہ نکال سکتی تھی بلکہ جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے سیاسی اور عسکری بازو کو مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ اس کے باوجود مجاز کے کچھ دوستوں نے محمد مقبول بٹ کے ہندوستانی جیل سے فرار کے بعد اپنی گوریلہ سوچ سے کام لئے بغیر ہندوستانی جہاز کے انغواء کا منصوبہ بنالیا اور ہندوستان کی انسیلی جنس نے اس واقعہ کو اس طرح سبوتاڑ کیا کہ مجاز کے بے گناہ لوگ اور خود محمد مقبول بٹ عظیم تشدد اور ظلم کا نشانہ بن گئے۔ یہ سب کچھ حکومت پاکستان کے ہاتھوں اس کی نظروں کے سامنے ہوا اور ریاست کی آزادی کے خواب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کشمیر کی جنگ بندی لائیں، لائیں آف کنڑول بن گئی اور ریاست جموں کشمیر کا یہ تخفہ جزل محمد ضیاء الحق کے اقتدار کو درست میں ملا۔

محمد مقبول بٹ ایک انقلابی فرد :

محمد مقبول بٹ بے شک ایک انقلابی اور ولی اللہ صفت کا انسان تھا۔ اُس نے اپنے بیوی، بچوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے وطن کی آزادی کی راہ میں قربانی دے کر شہادت کا رتبہ حاصل کر لیا بلکہ اُس نے اپنی مادر وطن کے غاصب اور بدترین دشمن سے اپنی قبر کی جگہ چھین لی۔ اُس نے فرد واحد کی حیثیت سے ایک غاصب طاقت کی پھانسی کا پھنداں قبول کیا لیکن یہ سزاد ہے اس بات کو فراموش کر گئے کہ یہ مسئلہ ایک کروڑ کشمیری عوام کے لیے تاقیامت ایک چیلنج ہے۔ محمد مقبول بٹ نے ریاست جموں کشمیر کی آزادی کا آغاز جان کی قربانی سے کر دیا۔ انجام کافیصلہ اب اللہ تعالیٰ کے عادل اور مضبوط ہاتھ میں ہے۔ محمد مقبول بٹ کو تختہ دار پر لٹکانے کا فیصلہ اُس حکومت نے انقلابی جذبہ کے تحت کیا جو دنیا میں جہوری ہونے کا پروپیگنڈا کرتے نہیں تھکتی۔ مقبول بٹ ایک بے لگ گوریلا اور کرکر تھا۔ بین الاقوای قانون کے تحت ایسے شخص کو پھانسی نہیں دی جاسکتی پھر جب کہ اُس نے بھارتی سفارت کار کے انغواء کے کسی کو مشورہ تک نہ دیا تھا۔ نیز محمد مقبول بٹ کے نام نہاد دوست اور گوریلہ کار کردار کے ماہر ہونے کے دعویدار جو محمد مقبول بٹ کی شہادت پر اس کے مزار کے مجاور بننے کے آرزومند تھے، اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ گویا شہید محمد مقبول بٹ نے اُن سے منہ موڑ لیا۔

خط و کتابت :

محمد مقبول بٹ سے ہندوستانی تھاڑ جبل میں میری ان سے خط و کتابت رہی ہے۔ ان کی خط و کتابت مضمون کی طوالت کا باعث بن سکتی ہے تاہم میں اپنے خطوط اس زاویہ نگاہ سے لکھتا تھا کہ ہندوستانی غاصب ان سے بدلنے نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے ایک خط میں لکھا کہ کیوں نہ ہم کشیری ریاست جموں کشیر کا فیصلہ مشرقی اور مغربی جمنی کی طرز پر کریں۔

محمد مقبول بٹ نے کسی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جوان مردانہ طور جواب دیا۔ ”میں آپ کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا کیوں کہ ہمارا ایسا اقدام وطن سے غداری کے مترادف ہو گا“ محمد مقبول بٹ جیسا بیدار مغز، محب الوطن، نذر اور بہادر انسان شاید ہی سر زمین کشیر میں صد یوں تک پیدا ہو۔ ڈاکٹر محمد اقبال کشیری نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے

ہزاروں سال زگس اپنی بے نوری پر روتی ہے

بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب وہ آخری بار اپنی ہم پر روانہ ہوئے تو میں نے ان سے چند دن قبل طویل ملاقات کی کہ معلوم کر سکوں کہ پشار سے راولپنڈی آنے کے باوجودہ وہ جماعت کی مجلس عاملہ کی مری میں بلاائی گئی مینگ میں کیوں شریک نہ ہوئے حالانکہ مجھے ان کے اس آخری سفر کا کوئی علم نہ تھا۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے دوسرا تھیوں کے ہمراہ مقبوضہ ہندوستانی کشیر میں گرفتار ہو گئے ہیں اور یہ کہ وہاں کا کوئی مار گئے بینک مینگر مار دیا گیا ہے۔ تاہم جموں کشیر حاذراۓ شماری نے ان کے اس کردار کو اپنے مخصوص انداز میں اپنالیا اور واپسی پر انکو اُری کا فیصلہ کیا گیا نیز ان کی رہائی کے لیے سیاسی جدوجہد جاری رکھی۔

محمد مقبول بٹ کی شخصیت :

محمد مقبول بٹ کی شخصیت ایک فلاسفی ہونے کے علاوہ مذہبی اور سیاسی بھی تھی۔ سیاست میں حاضر جواب تھے۔ جب وہ شہید ہوئے تو میری عمر 66 سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کی شہادت سے مجھے اس بات کا پتا چلا کہ میں عرصہ سے بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ چنانچہ ان کی شہادت کی خبر نے میرے جسم میں رعشہ پیدا کر دیا اور ہسپتال میں ڈاکٹروں نے میرا بلڈ پریشر 180/200 پا یا جواب بھی قائم ہے

اور میں زندگی کو گھسیٹے جا رہا ہوں، خدا جانے کب تک !!

1958ء میں جب میں ضلع جھنگ میں نظر بند تھا۔ میرے والد کا کشمیر میں انتقال ہو گیا۔ مجھے اپنے والد کی وفات کا اس قدر صدمہ نہیں ہوا۔ محمد مقبول بٹ کا اندازِ گفتگو اور اندازِ تحریر بہت پیارا تھا وہ مجھے ”جوال جی“ کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک بچی مگر سیاسی گفتگو کے دوران میں نے عرض کیا ”بٹ صاحب جب ہم تحریک آزادی کشمیر میں شامل ہوئے تو جوان تھے۔ اب حکومت پاکستان اور اس کا پریس بھی ہمارے وطن کی آزادی میں ہماری مدد کرنے سے چکچاتے ہیں، کیا ان حالات میں ہم اپنی زندگی میں ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد خود مختار ریاست دیکھ سکیں گے“۔ آبدیدہ ہو گئے اور کہا ”جوال جی آپ ضرور ریاست جموں کشمیر کو آزاد خود مختار دیکھیں گے“۔

ایک موقعہ پر جب جماعت کے میر پور میں ایکشن ہو رہے تھے۔ میں کسی عہدہ کا آرز و مند نہ تھا اس لیے جماعت کے آئین کے مطابق اجلاس سے تصدیق غیر حاضر ہو گیا اور جا کر سو گیا۔ رات بارہ بجے جب اجلاس ختم ہوا تو خود میرے کمرے میں آ کر مجھے اسٹینٹ سیکرٹری جنرل منتخب ہونے کی مبارک باد دی۔ کہا ”جوال جی! ہم نے آپ کو جماعت کا عہد دیدار بنادیا ہے۔“ میں نے عرض کی کہ آئین کے مطابق غیر حاضر آدمی کا نام پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جواب دیا ”یہ قانون آپ پر لا گو نہیں ہو سکتا۔“

ایک بار میں نے جماعت کے ممبران کو چندہ کے متعلق سخت فتحم کا خط لکھ دیا۔ کراچی کے چند جذباتی دوستوں نے بذریعہ ٹیلیفون بٹ صاحب (صدر جماعت) سے سخت احتجاج کیا۔ ابھی بٹ صاحب ٹیلیفون سن ہی رہے تھے کہ میں اچانک آگیا۔ کراچی والوں کی شکایت سننے کے بعد مجھے کہا کہ ”آپ کے کسی سخت خط کی شکایت کراچی والے کر رہے تھے۔“ میں وضاحت ہی کر رہا تھا کہ بٹ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ ان سرمایہ داروں کی اچھی طرح خبر لیں یہ کیوں چندہ نہیں دیتے؟“

ایک بار منظفر آباد کے ایک جلسے میں تقریر کے دوران جو شیلے انداز میں کہا کہ اس ملک میں بہت سے لوگ ہندوستان کے ایجنسٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تقریر

فتم ہوئی تو پریس والوں نے بٹ صاحب کو گھیر لیا اور ہندوستانی ایجنسیوں کے نام دریافت کرنے چاہے۔ ہم خود گھبرا گئے لیکن بٹ صاحب نے فوراً جواب دیا۔

All persons working for American Interests In Pakistan are Indian agents

مظفر آباد میں ایک پریس کانفرنس کے دوران آزاد کشمیر کی اقتصادی بدحالی کا دردناک انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ”پاکستان اشیاء کی برآمد سے زرمیادله حاصل کرتا ہے۔ جب کہ آزاد کشمیر والے انسانوں کے جسموں کی برآمد سے زرمیادله حاصل کرتے ہیں“۔ اس ریمارک سے بہت سے لوگ اشکبار ہو گئے۔

جب ہندوستان کا گنگا جہاز اغواء ہوا تو رقم راولپنڈی ہی رہا کیوں کہ میزے فرشتوں کو بھی اس کا کوئی علم نہ تھا۔ میں نے ہائی جیکروں کی راولپنڈی آمد کے لیے ایک استقبالیہ کمیٹی بنائی۔ میں خود اس کا چیئر مین تھا۔ جب ہائی جیکر زراولپنڈی پہنچ تو میں نے مضبوط حفاظتی انتظامات کیے کیوں کہ عوام کا ایک طوفان اُڑا یا تھا۔ چنانچہ پریس والوں نے ہاشم سے ملاقات کی آرزو کی۔ میں نے بٹ صاحب کو آگاہ کیا۔ انہوں نے جلد ہاشم کو میرے کمرہ میں موجود پریس والوں کے پاس بھیج دیا۔ ہاشم مجھے دیکھ کر سخت خوفزدہ ہو گیا اور پریس والوں سے بات کیے بغیر واپس جا کر بٹ صاحب سے کہنے لگا کہ وہاں تو انشیلی جنس کا آدمی ہے۔ چنانچہ بٹ صاحب فوراً آئے۔ ہاشم کی سرزنش کی اور کہا ”بیوقوف یہ تو ہماری جماعت کے جسوال جی ہیں“۔ پھر بھی ہاشم کو واپس آنے کی توفیق نہ ہوئی۔ ہاشم چونکہ بے حد خود سر تھا، مجلس عاملہ کے چند اصحاب نے اس کی بٹ صاحب سے پے در پے شکایات کیں۔ بٹ صاحب نے ایک بار ہنستے ہنستے کہا :

”گنجائشی کچھ بھی نہ کرے تو اس کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے۔ اس گنجائشی نے تو جہاز لایا ہے۔“

گنجائشی کشmiri نے جہاز تو لا یا تھا لیکن اس نے بٹ صاحب کے آنے سے پہلے ہی سودا بازی کر کے جہاز کی سواریوں کو فروخت کر دیا تھا۔ باقی معاملہ محض ہاشم کا ذرا رامہ ہی تھا جس کو جموں کشmiri مخاذ رائے شماری کا گوریلا ونگ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہر حال مقبول بٹ کی متبرک روح سے معدالت کے ساتھ

پڑھ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محدود گوریا کارروائی غاصب طاقتوں کو سرگاؤ نہیں کر سکتی۔ گوریا کارروائی فوجی تصادم پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے ملک فتح نہیں ہوتے۔ غالباً محمد مقبول بٹ کا مقصد مقبوضہ ہندوستانی کشمیر کے عوام میں گوریلہ اور سیاسی مددہ بدھ پیدا کرنا ہی تھا۔ وہ مقبوضہ کشمیر سے گوریا جنگ کے آغاز کا متممی تھا۔ میری نظر میں یہ طریقہ انتہائی غلط کارکردگی تھی کیوں کہ اول و آخر جنگ آزادی کی ذمہ داری مقبوضہ پاکستانی ”آزاد کشمیر“ پر عائد ہوتی ہے جہاں تحریک آزادی کا بیس یکمپ بنایا گیا تھا۔

محمد مقبول بٹ کی یادداشتؤں کا ایک واقعہ ہے جب اس کو آزاد کشمیر کی نام نہاد، بے اختیار اور اقتدار کے گرد گھونمنے والی آزاد کشمیر اسمبلی کے ایکشن لڑنے کے لیے بیک وقت پشاور اور راولپنڈی کی دو نشستوں سے نمائندہ نامزد کیا گیا اور بد قسمتی سے مجھے اس کا ایکشن ایجنسٹ مقرر کیا گیا۔ چنانچہ محمد مقبول بٹ کو بڑی طرح شکست ہوئی۔ پشار سے اس لیے کہ وہاں ان کا مقدمہ مقابل عبدالحمید خان تھا۔ محمد مقبول جیسے حساس انسان پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ میں نے بحیثیت جائیٹ سیکرٹری محاڈ کی تقریبادس برانچوں کو توڑ دیا۔ میرے اس غیر آئینی اقدام کی تحقیقات کے لیے مجلس عاملہ فوراً راولپنڈی میں جمع ہو گئی۔ میں نے اپنے مختصر جواب میں کہا ”چونکہ ان حلقہ جات سے ہمارا نامزدہ کرده امیدوار ہار گیا ہے یہ اس کا عمل تھا کیوں کہ میں مشرقی پاکستان کا نیازی بنانا نہیں چاہتا۔ میری نظر میں ہاری ہوئی فوج کو کسی بیرک میں بھی رکھنا خلاف اصول ہے بہر حال جناب صدر جماعت عبدالخالق انصاری نے اس عمل کا رد عمل میرے ہی ذمہ ڈال دیا اور وہ اپنی آنکھوں کا اپریشن کروانے لندن روائے ہو گئے۔ جماعت کے چند لوگ جو محمد مقبول بٹ کی ایکشن مہم میں مالی امداد کرتے تھے بٹ صاحب کے خلاف پروپیگنڈا میں مشغول ہو گئے ایک دن بٹ صاحب نے بڑے باعتماد اور دردناک لمحے میں کہا :

”جسواں جی! اب آئندہ ہم ان سرمایہ داروں کے پیسے سے ایکشن نہیں لڑیں گے۔“

غالباً محمد مقبول بٹ کا دل بھر گیا تھا۔ سوئٹر، بوئٹ محمد چ مقبول بٹ جب گنگا کی تقیش کے لیے راولپنڈی کی عدالت میں لا یا گیا تو اس نے ایک خستہ حال فقیروں والا چولا پہن رکھا تھا۔ گنگا اغوا کیس میں رقم بھی ایک سال جیل میں رہا لیکن کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی یہی حال محمد مقبول بٹ اور دیگر

احباب کا تھا۔ چنانچہ غلام احمد بٹ نے ان کو اپنا سوت پیش کیا۔ محمد مقبول بٹ نے یہ سوت لینے سے اس طرح انکار کیا کہ حاضرین کے دل بھر گئے۔ اکثر احباب کے بے اختیار آنسو نکل آئے دراصل مقبول بٹ ہی کشمیر کی آزادی کا شیر تھا باقی سب حیر پھیر تھا۔

ڈاکٹر فاروق ولد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جب راولپنڈی سے پونچھ کے دورہ پر روانہ ہوا تو میں ان کے ساتھ تھا۔ میں نے پونچھ کے ایک مقام پر مقبوضہ کشمیر کی لیڈر شپ خصوصاً شیخ محمد عبداللہ پر تنقید کی تو ڈاکٹر فاروق کے فرشتے اڑ گئے۔ تاہم محمد مقبول بٹ نے مجھے صرف اتنا کہا "جسواں جی آپ کی تقریر نے ہماری بریفنگ کو تھہ و بالا کر دیا ہے لیکن کوئی بات نہیں" میں نے عرض کیا کہ اگر فاروق صاحب تقریر کا جواب دینے سے قاصر ہیں تو میں خود ہی جوابی تقریر کر دوں گا۔ ڈاکٹر فاروق سے پوچھ لیں اس پر محمد مقبول بٹ نے زور دار تہقہ لگایا۔ چنانچہ راولکوٹ کے مقام پر میرے ایک عظیم ساتھی لفٹینٹ غازی اللہ دہتہ (مرحوم) نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو جہاد کے نشان کے طور ایک بندوق پیش کی جو فاروق عبداللہ اپنے ساتھ مقبوضہ کشمیر لے گئے اور اس کے مفہوم کو ہمیشہ کے لیے بھول گئے۔

جس طرح یہ بات درست ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان لائے آف کنٹرول سے اپنی فوجیں نکال لے تو ہندوستان کی فوج ایک منٹ میں آزاد کشمیر میں داخل ہو جائے گی۔ یہی بات ہندوستان کی فوجوں کے نکل جانے سے واقع ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کی مدد و گوریلا جنگ کی حمایت بھی کرے اور اگر واقعی گوریلا جنگ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر سے بھی، کسی وقت اور قیامت کی پہلی یا دوسری تاریخ کو شروع بھی ہو جائے تو کیا یہ گوریلا کارروائی پاکستان یا پھر اس مقصد کے لیے ہندوستان کے لیے قابل قبول ہو گی؟۔ کون بے وقوف ہو گا جو ہندوستان کی طرف سے جنگ کے دباو کو پاکستان کے قبضے میں سمجھے گا۔ کون بے وقوف ایسی یلغار کو جس کارخ پاکستان کی سرحدوں کی طرف آرہا ہو موافق یا بھلانی سے تعبیر کرے گا۔ ریاست جموں کشمیر کی آزادی کا خواب تب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے جب پورا کشمیر ایرانی انقلاب کا سماں پیدا کرے۔

پاکستانی حکمرانوں کو ذرہ بھر عقل ہوتی تو کوہاں آزاد پتن اور میر پور کی حفاظت کا انتظام کر کے

محض جموں شہر اور اس سے آگے دس میل کا علاقہ قبضہ کر لیتی تو آج ان کی فوجی پوزیشن مختلف اور بہتر ہوتی۔ آج ہمارا بارڈرستواری سے بیس میل آگے ہوتا تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہوتا کہ ہم موجودہ آزاد کشمیر کے چار ہزار مرلے میل پر قابض ہونے کے باعث ہاری ہوئی پوزیشن میں ہیں اور پاکستان و آزاد کشمیر کی فوج بارڈر پر وہی کردار ادا کر رہی ہے جو ہندوستانی فوجوں کا ہے اور ہم یہاں آزاد کشمیر کے نام کی کالونی میں الحاہد اور گوریلا فلسفہ کے راستے مظفر آباد بنام الحق پاکستان اور دوسری طرف الحق ہندوستان کے نام پر سری نگر کی کرسی کے حصول کے بھکاری بن گئے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ اب چالیس سال سے بندرا اور دو بیلوں کا واقعہ بن گیا ہے۔

بندر نے بیلوں کے ساتھ جو انصاف کیا تھا اس کی وکالت کی فیس یہ تھی کہ بندروکیل نے بیٹھی بقا یاروٹی بھی اپنی فیس کے طور کھائی تھی۔ مظفر آباد، آزاد پتن اور دینے سے کشمیر کے لیے جنگ، ایک فوجی غلطی اور بھیانک سازش کی آئینہ دار تھی جس نے کم از کم پاکستان کی مزید فوجی کارروائی کو قطعاً خارج کر دیا تھا۔ اب لوگ صدر پاکستان جزیل ضیاء کو ہندوستان سے جنگ نہ کرنے کے معابدہ کے لیے مورود الزام مٹھرائے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ الجھا ہوا معاملہ ضیاء کو درٹے میں ملا ہے اس کو شروع سے اس نجح پر استوار کیا گیا کہ ضیاء جیسا شریف انسان اس معاملہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا نہ وہ پرانی کارروائی کو کا العدم قرار دینے کی پوزیشن میں ہے نیز ان حالات میں مسئلہ کشمیر کی قسم کی گوریلا جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر جزیل ضیاء اس بات کی کوشش کرے کہ مہاجرین کشمیر کو اپنے وطن واپس جانے کا انتظام کر دے تو پاکستانیوں کے لیے جنت کا ایک دروازہ کھل سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو نہ ہی سلامتی کو نسل میں اٹھایا جاسکتا ہے نہ ہی اس کا پر امن حل نظر آتا ہے۔ میری نظر میں مسئلہ کشمیر ابتدائی سیاسی اور فوجی غلطیوں کا انبار ہے جس کی اصلاح بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ موجودہ نسل کو اس کا خمیازہ بھگتنا اور قبر میں جانا ہوگا۔ اس کے لیے کشمیری نسل کو خاموشی سے تیری عالمی جنگ کا انتظار کرنا ہوگا۔ اور اس کے جغرافیہ میں ریاست جموں کشمیر کی بنیادیں تلاش کرنی ہوں گی۔ تا ہم موجودہ غلط کارقوم کو جنگ کے زندگی گزارنے کا راز مضر ہے۔

محمد مقبول بٹ نے شہادت سے قبل اپنے وکیل سے یہ کہہ کر کہ حکومت ہندوستان برلنگم کے کسی واقعہ کو بہانہ بنا کر میری زندگی ختم کرنے پر مغل گئی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا، گویا بھارتی سفارت کار کے قتل سے لائقی کا اظہار کر دیا اور اس طرح بھارت کی طرز جمہوریت اور عدالت انصاف کے دعوؤں کا پول کھول کر رکھ دیا۔ اس خون ناحق کا انجام ٹھیک آٹھ ماہ انیس دن بعد ہندوستانی وزیر اعظم کے برہنہ قتل کی صورت میں ظہور پذیر ہوا اور ہندوستان ایک انقلاب اور قتل و غارت کی دلیل پر نگاہو گیا۔ برطانیہ میں تاریخی تصادم ہوا۔ میجر امان اللہ ایک جنگل میں مر اور تین دن تک اس کی لاش کیڑے کھاتے رہے۔ امان اللہ گلکتی آج کل انگلینڈ کی جیل میں ہے۔

محمد مقبول بٹ کو 84-2-11 کے دن تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ جب کہ اندر را گاندھی کو 10-84 کو اپنے ہی محافظوں نے گولیوں کی باڑمار کر خاک و خون میں لٹ پت کر دیا۔ اس طرف 4-4-79 کو پاکستان کے وزیر اعظم کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ تمام واقعات ایسے معمولی نہ تھے جس پر ستاروں نے کوئی حرکت نہ کی ہوا۔ اس کا حساب کوئی مستند مخجم ہی نکال سکتا ہے تاہم ان تمام بنگامی واقعات کا فیصلہ آئندہ کے مؤرخ پر ہی چھوڑ دینا بہتر ہو گا۔ اس وقت حقائق کا معلوم کرنا بے حد مشکل ہے کیوں کہ موجودہ صورتحال خود ساختہ اور فرضی بن گئی ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں خود بہت سے خود ساختہ مجاہد، غازی اور شہید پیدا ہو گئے ہیں۔ جن کی تحقیق آئندہ کا تاریخ دان ہی کر سکے گا بشرطیکہ اس کو ایک آزاد اور خود مختار ماحول میسر ہو۔ تاہم محمد مقبول بٹ کا خون ناحق ضرور رنگ لا کر رہے گا۔ لیکن مجھے برطانیہ میں سزا اپانے والے کشمیریوں کے معاملات کا سخت دکھ ہے جن کو ناکردار گناہ کی سزا محض ان کے اقبالی بیان پر دی گئی ہے۔

محمد مقبول بٹ جیسے بے لوث اور درویش کا خون ناحق ضرور برآمد ہو گا۔ انشاء اللہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے مقبول بٹ کے خطوط کے اقتباسات پیش کرنے میں اتنی طویل بحث میں آپ کا وقت لے لیا ہے۔ میری ناقص رائے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اب بلا تاہل ان کا اندرج کرتا ہوں :

محمد مقبول بٹ کے تھاڑ جیل سے خطوط کے اقتباسات حصہ ذیل ہیں۔ خطوط کافی طویل ہیں۔

2 مئی 1980ء کے خط کے مندرجات حسب ذیل ہیں :

”اگر آپ اسے شاعرانہ بات قرار نہ دیں تو یہ لکھنے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا محبت نامہ کنچھ قفس میں با دصبا کے کسی خوشنگوار جھونکے کی طرح مسروں کا ایک پیغام لا یا ہے۔ خوشنگوار یادوں کی ایک بارات ذہن کے پردے پر محور قصہ ہو انھی اور اس کے ساتھ ہی خلوص و محبت کے اس لازوال رشتے کی تازگی دو چند ہو گئی..... آپ کا خط ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی بار پڑھا اس لیے نہیں کہ یہ آپ کا خط تھا بلکہ اس لیے کہ شاید اس تصویر کو اچھی طرح دیکھ سکوں جو اس کے بین السطور پوشیدہ ہے۔ درد اور احساس کی شدت میں آپ بہت کچھ کہہ گئے اور اس سے اتفاق شاید عقل و خرد کے تقاضوں کو پورا کرے مگر عشق و جنون کی راہ پر چل پڑنے والوں کے لیے حالات و واقعات کو پر کھنے کے معیار ہی الگ واقع ہوئے ہیں۔ تمباوں کی بے باکی اپنی جگہ کہی مگر اسے زندگی کا محور قرار نہیں دیا جا سکتا۔“

27 فروری 1981ء کے ایک خط کے مندرجات :

”یہ دنیا بہر حال جہنم ہے“..... اس خیال سے اتفاق ممکن نہیں۔ اپنی بیت ترکیبی کے لحاظ سے یہ دنیا بھض چند عنصر طبعی کا ایک مجموعہ ہے۔ یقیناً اس دنیا میں ایسے وسائل کی کمی نہیں جو انسان کی فلاج اور معاشرت کی تزئین و آرائش کا باعث ہو سکتے ہیں..... اس کے باوجود یہ بھی بحق ہے کہ اس دنیا میں ایسے دور بھی آتے ہیں جب زندگی عذاب بن جاتی ہے اور انسانیت چلتی پھرتی لاشوں کا ایک غول ہو کر رہ جاتی ہے۔ مگر اس میں تصور کس کا ہے؟ جب انسان خود ہی مقدروں کی خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے اور پسندیدہ اصول و اخلاق کے علی الاعمع اپنی ہی جنس کو پابند سلاسل کرنے کی مuhan لے..... با ایس ہم یہ ایک اٹل حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ہر Thesis کا ایک Anti Thesis اور ہر Anti Climax کا ایک Climax بھی پیدا ہو جاتا ہے..... تاریخ عالم گواہ ہے کہ ظلم وعدوان کے کسی بھی دور کو اس کے علمبرداروں کی فراوانی وسائل کے باوجود ثابت حاصل نہیں ہو سکا۔ اس لیے کہ صنم کدہ جہاں نے ہر دور میں اپنے ابرا ہیم کو جلاش کیا ہے اور اسے پالیا۔ یہ ممکن نہیں کہ دہشت صلیب کے باعث انجل آگی کے اوراق کھلنے نہ پائیں اور انسانیت اس کی ضیاء پاشیوں سے ہمیشہ محروم رہے۔“.....

2 مئی 1980ء کے ایک خط کا اقتباس:

”ہاں میرے سر کے ہال سفید ضرور ہوتے جا رہے ہیں مگر اس کا کیا کروں کہ دل ابھی بسک جوان ہے اور اس میں مکین ارمان زندہ و تابندہ۔ رہا درویشانہ انداز تو یہ بس آپکا الہام ہی ہے۔ یہاں ان اوصاف کا دعویٰ ہی نہیں۔ حصول تو بہت دور کی چیز ہے۔ بزرگی اور درویشی تو صرف آپ کے لیے وقف ہے۔ البتہ ہم بھی اپنے وقت پر بوڑھے ہو جائیں گے۔ آپ بس دعا کیجئے کہ جسموں کے بڑھاپے کے ساتھ ہمارے ارمان بوڑھنے ہونے پائیں۔“ ۔۔۔۔۔

ہم ریاست جموں کشمیر کے غاصبوں اور مفاد پرستوں کی تباہی اور رسوائی کی دعا کرنے کے ساتھ اپنے عظیم دوست اور شہید محمد مقبول بٹ کی مغفرت کی دعا بھی کرتے ہیں

ہاں..... شہید محمد مقبول بٹ کی سیاسی لیڈر شپ میں یہ بات منفرد حیثیت کی حامل رہی ہے کہ ان کے ساتھ مصائب و آلام جھیلنے والوں میں جموں کشمیر اور پاکستان کے ہر گوشہ کے لوگ تھے جب کہ 1951ء کی سیاسی تحریک سے آج تک جموں والوں نے جموں کے لیڈر کا ساتھ دیا اور وادی والوں نے وادی کے لیڈر کا۔ پھر یہ کہ حکومت آزاد کشمیر و پاکستان کی پوری مشینری کی مخالفت اور جدوجہد کے باوجود گناہ اغوا کیس میں استغاثہ کو ایک گواہ نہ مل سکا جو بٹ صاحب کے خلاف ایک لفظ کی بھی گواہی دیتا۔ ڈاکٹر فاروق حیدر کی گواہی سکھائے ہوئے طوٹے کی مانند تھی اور وہ سلطانی گواہ بن گیا تھا۔ پاکستانی گواہ محمد اکرم، شاید وہ کسی پاکستانی پیشہ کمشنر کا لڑکا تھا اس کے بیان جب مجھے یاد آتے ہیں تو میں کئی دن ہستار ہتا ہوں۔ میں نے جسٹس یعقوب علی کو بھی خوب ہنسایا۔

جسٹس یعقوب علی خان واقعی صحیح مسلمان اور انصاف پسند جو تھا جس نے گناہ اغوا کیس کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ جسٹس یعقوب علی خان نے اپنے فیصلے میں ہی محمد مقبول بٹ کو عملی گوریلا اور کاظم کیا اور ان کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کے باقی ساتھیوں کو صوفے پر بیٹھنے والے مجاہد (Cusion Chaired Mujahids) قرار دیا۔ ان مجاہدین نے اب انگلینڈ میں این ایل۔ ایف کے دو دھڑے تیار کر لیے ہیں۔ گویا یہ انگلینڈ کے ڈبل

مہاجرین کشمیریوں کو انگلینڈ میں ٹریننگ دے کر مقبوضہ ہندوستانی کشمیر گوریلا جنگ کے لیے روانہ کریں گے اور شبائیہ روز انگلینڈ اور نیو یارک میں مقیم انڈیاں سفارت خانہ کو یاداشتیں پیش کریں گے اور اس طرح وہ کشمیر کو آزاد کرنے کی بجائے مسئلہ اجاتگر کریں گے یا پھر یہ کہ امان اللہ خان NLF اپنی گوریلا کارروائی کو بذریعہ مارک ٹیلی اجاتگر کرے گا۔

رقم گوریلا فلسفہ کا ماہر ہونے کا دعویدار تنوہیں لیکن سفارت خانوں کے دفتروں کے سامنے مظاہرے کرنا، سفارت کاروں کو ناحق قتل کرنا، کسی جگہ غیر ممالک میں جلوس نکالنا، ہندوستان یا پاکستان کے سفیروں اور حکمرانوں پر گندے انڈے پھینکنا، کسی حکمران کو اغوا کرنا گوریلا کارروائی کی صفت میں نہیں آتا، نہ ان کارروائیوں سے ہندوستان کے اسلحہ میں کیڑے پڑ سکتے ہیں۔ نہ ہی حکومتیں ایسے ہتھنڈوں سے قابض علاقوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ پھر الحاق ہندوستان اور الحاق پاکستان کے نظریہ نے ریاست جموں کشمیر کی آزادی کی نفعی کر دی ہے اور ریاست میں کسی قسم کی گڑبڑ پر دونوں ملکوں کی ذمہ داریاں یکساں ہو گئی ہیں۔ پاکستان کی پشت پر ایک طرف دریائے جہلم ہے دوسری طرف منگلا کی جھیل۔ یہ ایسی رکاوٹیں ہیں جن پر آزاد کشمیر میں معین آرمی کی لائن آف کیونی کیشن کا انصراف ہے۔

دونوں حکومتیں اگر مل بیٹھ کر اس بات پر غور کریں کہ کشمیر کی ڈیفسن لائن کے اخراجات کو ملک دو قوم کی فلاح کے لیے خرچ کرنے سے زیادہ فائدہ ہو گا تو ریاست کے قبضہ سے دستبردار ہو کر دونوں ملک ریاست سے دوستی کا معاہدہ کر لیں اور اس عذاب سے جان چھڑا لیں۔ علاقے تقسیم کرنے کی بجائے اپنے جائز مفادات کو تقسیم کر لیں اور کشمیریوں کے ساتھ بھائیوں والا سلوک کریں اور کشمیر کے تدریتی راستے کھول دیں اس عمل سے بہتوں کا بھلا ہو گا اور دنیا میں ہندوستان و پاکستان کی وحکاک بیٹھ جائے گی۔

(تحریر: 21-12-85)



میرا عظیم قائد..... محمد مقبول بٹ شہید

عبدالغفور قریشی ایڈ ووکر

چیز میں پلٹی بورڈ محاذرائے شماری

11 فروری کا دن قریب آ رہا ہے۔ میری نگاہیں قدرتی طور پر دہلی کی تھاڑ جیل کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ جہاں فرزد کشمیر، جموں کشمیر محاذرائے شماری کے سابق صدر اور اس کے عسکری بازوں پیش لبریشن فرنٹ کے سربراہ جناب مقبول احمد بٹ صاحب ابدی نیند سور ہے ہیں۔ مجاہد کشمیر، فوج کشمیر، غازی ملت، ترجمان کشمیر اور نہ جانے کتنے خطابات لوگوں نے خود ساختہ طور پر استعمال کیے ہیں لیکن ہبہ کشمیر کا منفرد اور قابلِ فخر اعزاز صرف اور صرف میرے قائد جناب مقبول احمد بٹ صاحب کے حصہ میں ہی آیا۔ زندگی میں کونسا الزام تھا جو اپنوں اور بیگانوں نے جان بوجھ کر مقبول احمد بٹ کی شخصیت کو داغدار کرنے کے لیے نہ لگایا ہو۔ یہ میرے قائد کی ہمت، استقامت، جرأت، صبر، ولیری اور بہادی ہی تھی کہ انہوں نے تمام زندگی یہ تیر و نشتر برداشت کیے۔ لیکن آخر کار 11 فروری 1984ء کو شہادت کے پاک خون سے ان تمام الزامات کو یکسر دھوڈا۔ بدترین دشمن بھی اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

غیرت، جمیت کے اس پیکر نے 18 فروری 1938ء کو بارہ مولہ مقبوضہ کشمیر کے گاؤں تریہ گام میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام غلام قادر بٹ تھا۔ 1954ء کو مقامی ہائی سکول سے میڑک کا امتحان پاس کیا۔ ٹھیک چار سال بعد 58ء میں آپ نے سینٹ جوزف کالج بارہ مولہ سے گریجویشن کی۔ مقبوضہ کشمیر کے حالات اور ریاست جموں و کشمیر کی غلامی نے جناب بٹ صاحب پر گھرے اثرات مرتب کیے اور اس طرح بالآخر آزادی کے عزم، جذبات لے کر بٹ صاحب اپنے شفیق چچا عبد العزیز بٹ کے ہمراہ مقبوضہ کشمیر سے بھرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ 1960ء میں آپ نے پشاور یونیورسٹی سے ماہر کی ڈگری حاصل کی اور اس طرح تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دور میں پورا

پاکستان ایوب خانی مارشل لاء کی زد میں تھا۔ نئے نظام بنیادی جمہوریت کا تجربہ فوجی حکومت کر رہی تھی۔ صادب نے بھی اس میں حصہ لیا اور مہاجرین کی سیٹ سے ممبر بنیادی جمہوریت منتخب ہوئے۔ انہوں نے پشاور سے شائع ہونے والے اخبار "انجام" میں ایڈینور میل بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1964ء میں وہ کشمیر اینڈی پنڈٹ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور 1965ء میں جب جموں کشمیر مجاز رائے شماری کا قیام عمل میں آیا اس کے پہلے کنوشن میں ان کو اس جماعت کا پہلو سیکریٹری منتخب کیا گیا اور مرکزی درکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ ان ہی ایام میں انہوں نے کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ 1966ء میں انہوں نے جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے عسکری بازو (جوں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ) کی بنیاد رکھی تاکہ ریاست جموں کشمیر میں ہندوستانی غاصبوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی جائے اور اسی سال وہ مقبوضہ ہندوستانی کشمیر چلے گئے تاکہ مسلح جدوجہد کو وہاں منظم کیا جائے۔ ستمبر 1966ء میں انڈین آرمی کے خلاف لڑتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ اس جدوجہد میں ان کا ایک ساتھی اور نگزیب شہید ہو گیا اور مقبول احمد بٹ صاحب اپنے دوسرا تھیوں کے ہمراہ گرفتار کر لیے گئے۔ نیز ایک پیش عدالت میں ان کے خلاف انڈین آرمز ایکٹ کی سیکشن 302، 120B، 397 کے تحت مقدمہ چلا یا گیا۔

اس عدالت نے مقبول احمد بٹ اور ان کے ایک ساتھی میر احمد کو سزاۓ موت سنادی اور دوسرے ساتھی جناب کالے خان کو عمر قید کی سزا سنادی۔ 1968ء میں جناب مقبول احمد بٹ، میر احمد اور ایک اور قیدی پیمن نے جیل کی دیوار میں سوراخ کیا اور جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستانی حکومت نے ان کے فرار پر ایسے شخص کو مبلغ دس ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا جو مقبول احمد بٹ کو زندہ پکڑ لائے یا اس کی مردہ نقش پیش کرے۔ تاہم جناب مقبول احمد بٹ برف سے الٹ پہاڑیوں پر پیدل سفر کر کے مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ یہاں ان کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی گئی اور بد نام زمانہ بیک فورٹ مظفر آباد میں تین ماہ تک قید رکھا گیا۔ بالآخر 8 مارچ 1969ء کو بے گناہ اور ایک فریڈم فائٹر قرار دے کر تفتیشی ٹیم نے بٹ صاحب اور ان کے دیگر ساتھیوں کو رہا کر دیا تھا۔ 1965ء میں مجاز رائے شماری کا قیام عمل میں لا یا گیا اور مجاز کا پہلا

کنونش سیالکوٹ میں منعقد ہوا جس میں سوچیت گڑھ بارڈر کے قیام پر وطن کی منی ہاتھوں میں لے کر اس بات کی قسم کھائی گئی کہ اے وطن کی منی تو گواہ ہے کہ تیری آزادی اور عظمت کے لیے ہم اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ہمارے خون کا آخری قطرہ تیری عظمت اور آزادی کے لیے صرف ہو گا۔ وطن کی منی سے یہ بہت بڑا عہد تھا جو ان عہدیداروں نے کیا تھا اور وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کی تعبیر جناب مقبول احمد بٹ صاحب نے تھا جیل میں پھانسی کے پھندے کو چوم کر اور فرسودگی، دولت پروری، استحصال، ظلم، غلامی اور منافقت کے خلاف اپنی جان دے کر پوری کر دی۔ شہادت کی موت ہمیشہ عظیم انسانوں کے حصہ میں آئی ہے اور یہ خدا کی ذین ہوتی ہے۔ اپنے بندوں میں سے اللہ تعالیٰ جس پر انعام فرماتے ہیں انھیں ہی اس دولت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

ایک ذی عقل علم آدمی سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ عزت کی زندگی یا عزت کی موت مرنا پسند کرتا ہے تو جواب یقیناً عزت کی موت کی صورت میں آئے گا۔ میرا عظیم قائد اگر زندہ رہا تو پوری آن بان اور شان سے اور اگر جان بھی دی تو بہادری، جرأت اور استقامت سے کہ آئندہ آنے والی نسلیں بھی کشمیر کے اس جیالے فرزند پر ناز کریں گی۔ میرے عظیم قائد تو اس دنیا سے چلا گیا ہے لیکن تجھے پھانسی دینے والے بھی چین کی نیند نہ سو سکے۔ اور عین آٹھ ماہ بعد اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں خون میں لٹ پت ہو گئے۔ مقبول احمد بٹ تو زندہ تھا تو ہندوستان کی حکومت لرزہ برانداختی لیکن تیری موت کے بعد بھی ہندوستانی حکومت تیرے جسدِ خاکی سے بھی خوف زدہ ہے تب ہی تو تھا جیل کی آہنی چار دیواری کے اندر تیرے جسدِ خاکی کو قید کر کے رکھا گیا ہے ورنہ آج تک تو قانون پہی تھا کہ مردہ جسم ورثاء کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ لیکن شاہزاد قدرت کشمیریوں کو تیرے اور ث نہ سمجھتی ہو، تیرے فلسفہ، تیرے نظریات اور تیری دی ہوئی راہ پر جو قوم نہ چل سکے وہ یقیناً تیری وارث نہیں ہو سکتی ہے۔ سال 1969ء میں کنونش منعقدہ مظفر آباد میں آپ کو محاذ رائے شماری کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ نے ایک سچے محب وطن کشمیری کی حیثیت بے کشمیر کی آزادی، خود مختاری سا لمیت اور اقتدار اعلیٰ کے لیے کام کیا لیکن اس وقت کے بدترین آمریکی خان کو بٹ صاحب اور محاذ کی سرگرمیاں پسند نہ آئیں اس عرصے میں پیش لبریشن فرنٹ نے جو کہ محاذ رائے شماری کا عسکری بازو تھا، گنجانا می جہاز انخواہ کر کے دنیا میں بالچل چادی

کر جوں کشمیر کا مسئلہ ابھی زندہ ہے۔ آمر کی سوچ کی قوتیں مفقود ہوتی ہیں اور وہ طاقت کے نشے میں ہر مسئلہ کو جبرا در ظلم سے حل کرنا چاہتا ہے چنانچہ بٹ صاحب کو انڈین ایجنسٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ مقبول احمد بٹ اور ان کے ساتھیوں کو جن میں عبدالحالق انصاری، جی۔ ایم۔ لوں، میر عبدالمنان، میر عبدالقيوم، صدیق بابا، غلام مصطفی علوی، یوسف زرگر، جی۔ ایم۔ ممتاز احمد ہاشمی، اکرم اللہ جوال، محمد سعید نازکی، فاروق حیدر، اشرف قریشی اور ہاشم قریشی سمیت سیکڑوں رہنماؤں اور کارکنوں کو پابند سلاسل کر دیا گیا اور بالآخر مقبول احمد بٹ، جی۔ ایم۔ لوں، میر عبدالمنان، میر قیوم، اشرف، ہاشم پر ایک خصوصی عدالت جو سپریم کے نجج جسٹس یعقوب علی اور سندھ ہائی کورٹ کے نجج جسٹس عبدالقدار پر مشتمل تھی مقدمہ چلا یا گیا۔ اور بالآخر تمام چھان بین کے بعد ان محب وطنوں کو بری قرار دے دیا گیا۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ جب بٹ صاحب ہندوستانی جیل میں نظر بند تھے اس وقت ان پر الزام تھا کہ وہ پاکستانی ایجنسٹ ہیں لیکن پاکستانی جیل میں تھے تو الزام تھا کہ وہ ہندوستانی ایجنسٹ ہیں لیکن وہ کسی بھی ملک کے ایجنسٹ نہ تھے بلکہ صرف اور صرف کشمیری قوم اور کشمیر کے ایجنسٹ تھے اور ان کے بدترین دشمنوں نے بھی جب انھیں ہندوستانی جیل میں پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا تو اپنی انگلیاں دانتوں میں دبا کیں کہ اب پاکستانی قوم محب وطن کشمیری عوام کو کیا جواب دیں۔ میرے قائد نے پھانسی کے پھندے پر جھول کر دنیا کی آزادی پسند اقوام کو باور کر دیا کہ آزادی پسند کسی کا ایجنسٹ نہیں ہو سکتا نہ میں ہندوستان کا ایجنسٹ ہوں اور نہ پاکستان کا۔ کیا کوئی ملک اپنے ہی کسی ایجنسٹ کو پھانسی دے سکتا ہے۔ گناہ کیلئے کیس بنا، ختم ہوا۔ مضمون کی طوالت کے باعث اس میں نہیں جانا چاہتا۔ اس میں بھی بٹ ہائی جیکنگ کیس بنا، ختم ہوا۔ آخر کار جسٹس یعقوب علی خان کو کہنا پڑا کہ مقبول ایک عملی گوریلا صاحب اور ان کے ساتھی سرخ رو ہوئے آخر کار جسٹس یعقوب علی خان کو کہنا پڑا کہ متعلق اسی کا اظہار تھا کہ ہے اور ان کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا جب کہ کشمیر کے دیگر لیڈروں کے متعلق اسی کا اظہار تھا کہ وہ Cusion chair مجاہد ہیں۔ شمن بھی ان کے نظریات سے اختلافات تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے اخلاص اور آزادی کی تڑپ پر حرف گیری یا انگشت نمائی نہیں کر سکتے ہیں۔ بالآخر بٹ صاحب کو اس مقدمہ سے دیگر ساتھیوں (اسوائے ایک کے) سمیت بری کر دیا گیا۔ بعد میں اس ایک کو بھی فیصل آباد جیل سے پریم کورٹ کے حکم پر رہا کر دیا گیا۔ اس طرح ایک گھری سازش تو ختم ہو گئی لیکن مجاز رائے

(172)

شماری کے مقاصد، مسلح جدو جہد اور تحریک آزادی کشمیر کو بہت پچھے دھکیل دیا گیا۔ اس سازش کے کردار کچھ تو نمایاں ہو گئے ہیں اور باقی رہنے والوں کے چہرے سے تاریخ نقاب الٹ کر رہے ہیں۔ آخر کار دس مئی 1976ء کا وہ منحوس دن بھی آگیا جب بٹ صاحب باوجود یہ کہ محاذ رائے شماری کی مجلس عالمہ نے بٹ صاحب کو ہدایت کی تھی کہ وہ دوبارہ مقبوضہ کشمیر نہ جائیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جدو جہد آزادی کے لیے گوریلا کارروائیوں کو منظم کرنے کے لیے دوبارہ مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے اور اس طرح مہاترے کے قتل کے انتقام کی صورت میں اس عظیم حریت پسند مقبول احمد بٹ کی پھانسی کی اطلاع کشمیریوں کو ملی تو یوں محسوس ہوا کہ پوری ریاست جموں و کشمیر پھانسی پر لٹک گئی ہے۔ مقبول احمد بٹ ایک لافانی انسان تھا۔ اس نے آزادی اور مسلح جدو جہد کے جو وعدے کیے تھے وہ پورے کر دکھائے۔ پوری ریاست جموں و کشمیر آہوں اور سکیوں سے دوچار تھی۔ لیکن اُس کے باوجود کچھ نہاد اور بازاری شہرت رکھنے والے لیڈر بوكھلائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ شورش ملک نے نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے درست ہی تو کہا تھا کہ میری زندگی کو مختصر کرنے والے بے شک طویل عمر پانے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن یہ ان کا بڑا مغالطہ ہے۔ مان لیا کہ آج تیرے سوگ میں 157 آزاد حکمران میں سے کسی کا پرچم سرگونوں نہیں لیکن دنیا کے تین ارب انسانوں کے سر تیرے احترام میں خم ہیں۔ میرے دوست، میرے رہبر، تم نے ہمیں اللہ کے حوالے کیا ہم نے تمہیں دل میں اتار لیا۔ تو ہر روز ہی ہمارے دل کے افق پر سورج کی طرح طلوع ہوتا ہے۔

(ہفت روزہ قائد 7 تا 14 فروری 1987)



وہ محس... جو سوال بن گیا

نیکم لون (گوجرانوالہ)

آج 11 فروری 1984ء ہے۔ یہ دن ہر سال آتا ہے اور قیامت تک آتا رہے گا۔ اس دن کے ساتھ کئی لوگوں کی یادیں وابستہ ہوں گی۔ گزشتہ گیارہ سال سے کشمیری اس دن کو ایک خاص نسبت سے یاد کرتے ہیں کیوں کہ اس دن کشمیر کا بطلِ حریت بھارتی سامراج کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور جس کے ہر قطرہِ خون نے آج کئی مقبول بث پیدا کر دئے ہیں۔ جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھارت کی چھلاکھ فوج کے خلاف نبرد آزمائیں۔

11 فروری نے مجھے مقبول بث کی پاکستان کی جیلوں میں قید اور گنگا غواہ کیس کے مقدمہ کی یاد دلادی ہے۔ مقدمہ لاہور کی ایک خصوصی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ پاکستان کے نامور وکلاء ایم انور، اعجاز حسین بٹالوی، عابد حسن منشو، ڈی ایم اعوان اور ڈاکٹر عبدالباسط ملزموں کی صفائی کے لیے عدالت میں موجود تھے۔ قبل اس کے کہ میں 11 فروری کی نسبت سے شہید مقبول بث کے متعلق کچھ عرض کروں ڈاکٹر باسط جو وکلاء صفائی کی ٹیم میں سب سے کم عمر تھے انہوں نے عدالت کے نوٹس میں ایک اہم نقطہ پیش کرتے ہوئے عدالت سے استفسار کیا کہ حکومت کی طرف سے استغاثہ نے ملزموں مقبول بث شہید، جی ایم لون مرحوم، میر عبدالقیوم مرحوم، میر عبدالمنان، محمد اشرف قریشی اور محمد ہاشم قریشی پر دیگر الزامات کے علاوہ ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ ملزم دشمن (بھارت) کے ایجنت ہیں۔

پہلے یہوضاحت ہونی چاہیے کہ گنگا غواہ کے وقت بھارت کی پاکستان کے ساتھ دوستی یا دشمنی۔ باسط معزز عدالت سے کہہ رہے تھے کہ اگر بھارت پاکستان کا دشمن ہے جس طرح کہ ملزموں پر لگائی گئی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے تو دنیا یہ کہے گی کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو معاہدے تو دوستی کے کرتا ہے لیکن دل میں دشمنی رکھتا ہے کیوں کہ صدر پاکستان نے بھارت سے دوستی کا معاہدہ کر رکھا ہے اور اس

دفعہ کے نفاذ سے پاکستان کے صدر کے دستخطوں کی وقت فتح ہو جائے گی اور اگر حکومت کا جواب یہ ہے کہ معاهدہ کی رو سے پاکستان اور بھارت دوست ہیں تو ملزموں پر اس دفعہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ذاکر باسط کی اس دلیل نے گزگا کیس کی چولیں ہلا دیں۔ لیکن چونکہ مارشل لائی نوکر شاہی کا مقصد ہی تحریک آزادی کشمیر کو کچلانا تھا اس لیے مقدمہ چلتا رہا۔ دوران مقدمہ مقبول بٹ کے سرینگر جیل سے فرار کا ذکر بھی ہوا۔ عدالت کو بتایا گیا کہ سری گنجیل کا زنا نخانہ جس میں مقبول بٹ محبوس تھے وہ مظفر آباد جیل سے ماتا جلتا ہے۔ عدالت کے معزز جوں نے مظفر آباد جیل دیکھنے کا عندیہ ظاہر کیا اور اس مقصد کے لیے عدالت چند روز کے لیے مری منتقل ہو گئی اور ملزموں کو بھی مری روانہ کر دیا گیا۔ آج کی اس تحریر کا مقصد اس سفر کی روئیداد بیان کرنا ہے جو لا ہور سے مری تک طے ہوا۔

نج صاحبان اور وکلاء مری منتقل ہو گئے، ملزموں کو خصوصی انتظام کے تحت مری بھیجا گیا۔ ملزم جیل کی گاڑی میں بند تھے، ان کے دوست اور لو احتین اپنی کاروں میں ان کے ہم سفر تھے۔ راولپنڈی گزرنے کے بعد گارڈ کے انچارج کو قید ملزموں سے خصوصی ہمدردی ہو گئی اور اس نے انھیں پرائیویٹ کار میں منتقل کر دیا اور خود بھی پرائیویٹ کار میں آبیٹھا۔ سرکاری گاڑی میں اب صرف مقبول بٹ، ہاشم اور اشرف رہ گئے جن کے ساتھ چند سپاہی تھے۔ ہماری کار سرکاری گاڑی کے ساتھ تھی۔ جب مری کا فاصلہ صرف دس میل رہ گیا تو ہم خواجہ غلام نبی لون کی کار میں تیزی سے مری پہنچ گئے تاکہ ساتھیوں کی رہائش کا انتظام کسی ہوٹل میں کر سکیں۔ ہمارا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ تک ملزم پہنچ جائیں گے۔ مگر..... ہم نے ایک گھنٹہ تک انتظار کیا جیل سے بھی پہنچ کیا مگر باقی لوگ مری نہ پہنچے۔ ہمیں فکر ہوئی ہم مری سے واپس پنڈی کی طرف چل دیئے تو مری سے چند میل دور پنڈی کے راستہ پر سرکاری گاڑی کو بہت گہرائی میں برلب سڑک کھڑے پایا ایک دو کار میں بھی پاس کھڑی تھیں جن میں گارڈ انچارج اور باقی ملزم تھے۔ سرکاری گاڑی سڑک کے کنارے اس طرح کھڑی تھی جیسے نیچے گہرائی میں لڑھکتے ہوئے کسی نیبی طاقت نے اسے روک رکھا ہواں کے نیچے گرنے میں کوئی شک نہیں تھا۔ مگر وہ رکی ہوئی تھی۔

مقبول بٹ کی پیشانی پر زخم تھے اس سے خون رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب یہ سارا قالہ

مری کی طرف روای دواں تھا تو مری کی طرف سے ایک بڑی سی کار آتی نظر آئی کا رڈ رائیور نے پہلے یہ پڑھ دیا کہ اس نے اپنی کار اپنی سائیڈ کی طرف کر لی ہے لیکن جیسے ہی سرکاری گاڑی قریب آئی تو کار سڑک کے درمیان آگئی۔ سرکاری گاڑی کے ڈرائیور کو مجبوراً اپنی گاڑی کچھ زیادہ ہی باعث ہاتھ کرنا پڑی جس طرف گھری کھائی تھی۔ سرکاری گاڑی کے ڈرائیور نے بریک لگائی اچانک رکنے کی وجہ سے گاڑی میں بیٹھے مقبول بٹ کا سرگاڑی کی بادی سے نکلا کر زخمی ہو گیا۔ اگر ڈرائیور چند سینڈ کی بھی دیر کرتا تو سرکاری گاڑی ہزاروں فٹ گھرے گڑھے میں گر کر چکنا چور ہو چکی ہوتی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گارڈ انچاج پر ایسی یہ کار میں کیوں شفت ہوا؟ سرکاری گاڑی جس میں نامی گرامی ملزم مقبول بٹ، ہاشم قریشی اور اشرف قریشی دو تین ساہیوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا؟ پھر جب سامنے سے آنے والی کار نے جان بوجھ کر سرکاری گاڑی کے لیے راستہ تنگ کر دیا اور موت کے منہ میں دھکیلتی ہوئی گزر گئی تو اس کا پیچھا کیوں نہ کیا گیا اور جب چند افراد نے کار والوں کو پکڑ کر مقدمہ بھی درج کر دیا تو پھر وہ مقدمہ ختم کیے ہو گیا۔

یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ کاش دردمند! اس پر غور کی زحمت گوارا کریں۔

(روزنامہ خبریں 11 فروری 1995)

شہید محمد مقبول بٹ کے رفقے سفر

اعظم انقلابی

کشمیر میں مغل حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ہی کشمیر کے مقامی مسلم حکمرانوں کے دور کا خاتمہ ہوا۔ یوں تو کشمیریوں نے اپنے قومی شخص کے تحفظ کے لیے ہر دور میں جدوجہد کی، لیکن شمس خان ملد یال، سبز علی اور علی خان جیسے سرفرازوں کی فہرست مختصر ہی ہے۔ بطلِ حریت شہید محمد مقبول بٹ صاحب سرفرازوں کی اس صفت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حریت چمن اور آزادی کشمیر کے یہ داعی پورے شعور اور وجدانی جذبات کے ساتھ مقتل کی طرف چلے۔ آزادی کے ان پروانوں نے اپنی پرواز ہر قیمت پر جاری رکھی۔ شہید مقبول بٹ کشمیر کی موجودہ جدوجہد کی پہچان ہیں شہید مقبول نے کشمیر کے اسلامی اور قومی شخص کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی اور بالآخر راہِ جہاد ہی میں شہید ہوئے۔ 1947ء کے پرآشوب دور میں جب بر صغیر کی تقسیم ہوئی تو کشمیر بھارت اور پاکستان کے درمیان متنازعہ بنادیا گیا۔ پہلے بھی یہ کشمیر کا تقدیرتی حسن ہی تھا، جو غیروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا اور اب بھی کشمیر کا یہی حسن اس کی تباہی کا باعث بنا ہوا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ کشمیر کے ارد گرد بڑے ممالک کی موجودگی کی وجہ سے کشمیر کی اہمیت اور بڑھ چکی ہے۔ لیکن کشمیر کی بربادی کا اصل سبب اُس کا حسن و جمال ہے۔ اگر آج کشمیر کے چشمے اور دریا خشک ہو جائیں اور مرغزار جل کر راکھ بن جائیں تو بھارت اور پاکستان دوسرے دن کشمیر کی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کریں گے۔ تاریخ میں جو یہ دو قومی نظریہ کے تحت بر صغیر کی تقسیم اور کشمیر کی تقسیم کی اس سکیم سے تعلق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ثانوی اہمیت کی سیاسی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کشمیر اور وہ کمیں کے لیے سیر و تفریح کی جگہ ہے اور سیاح حضرات اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کے لیے کبھی ہمارے حق خود ارادیت کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی ہمارے تحفظ کی بحث شروع کرتے ہیں، گردو پیش کی بڑی قوموں کی حریصانہ نظروں نے کشمیر کی مشکلات میں اضافہ

کیا ہے۔ کاش کشمیری قوم اپنے چون کے حص پر خود فریفہت ہو کر خود ہی اس کی محافظ بن جاتی۔

غیرت کشمیر شہید مقبول بٹ کشمیر کی خودداری کی علامت ہیں، مقبول بٹ صاحب چونکہ وادی کشمیر میں پیدا ہوئے تھے اور وادی ہی کے مرغزاروں اور آبشاروں کے درمیان تربیت پائی تھی۔ اس لیے وہ وادی کشمیر کی اہمیت کا وجود انی ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی تھی کہ بھارت اور پاکستان کشمیر کے بارے میں حساس کیوں ہیں۔ انہوں نے بڑی ہمت، جرأت اور اعتقاد سے اعلان کیا کہ کشمیر کشمیریوں کا ہے۔ کشمیر کا ”ہتو“ دہقان، ہی کشمیر کا حکمران ہو سکتا ہے، مغلوں، انگانوں، سکھوں، پاکستانیوں اور بھارتیوں کے ظالم اور جابر ہاتھ کشمیر سے دور رہیں۔ انہوں نے انتہائی برادرانہ اور مشفقاتانہ لب و لبجے میں پاکستان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ حضرات فی الحال کشمیر کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، ہم اپنی قومی امنگوں اور انفرادیت کے ساتھ ملت اسلامیہ کا حصہ بن جانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ہم آقاوں کی تبدیلی کو اپنی تو ہیں سمجھتے ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کے سرمایہ دارانہ مغربی نظام کی وجہ سے الحاق پاکستان کا اندرہ اور بھی بے رونق بن گیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد توقع اور امید تھی کہ بچے کچھے پاکستان کے ارباب حل و عقد یہاں عدلی فاروقی قائم کریں گے۔ لیکن اسلام کا عادلانہ نظام یہاں نافذ ہوانہیں۔ ہاں سیاستدان اپنی گروہی سیاست میں رنگ بھرنے کے لیے کشمیر فتح کرنے کی باتیں کرتے رہے۔ اسی طرح پاکستان کے باطل نظام کی موجودگی کی وجہ سے مسئلہ کشمیر اور الجھ گیا، بہر حال شہید مقبول بٹ صاحب نے کشمیر کی قومی پہچان کی تحریک کا آغاز 1965ء میں کیا 1966ء میں شہید مقبول بٹ صاحب پہلی بار اور نگزیب اور محبر امان اللہ کے ہمراہ وادی کشمیر میں داخل ہوئے۔ مقبول صاحب نے فروری 1984ء تک راہ وفا میں کن کن مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا اس تفصیل کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم شہید مقبول کے سفر اور رفتاء سفر کو موضوع بنانے کے لیے ایک آزادی کے خط و خال سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اختصار کے ساتھ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کریں گے۔ مستقبل کا مورخ اس موضوع پر پوری کتاب لکھنے کی تحریک پائے گا۔

ہیکر عزم ولیقین محمد مقبول بٹ تریہ گام میں پیدا ہوا، دیہاتی ماحدول میں دینی تربیت پاتے

پاتے جو ان ہوئے اور بارہ مولہ سینٹ جوزف کالج سے لی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ محاذ رائے ٹھاری تحریک کے طالب علم رہنمای کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وادی کشمیر میں بھارتی تسلط کے خلاف مؤثر جدوجہد شروع کرنے کے لیے کسی محفوظ مقام کو اپنی جدوجہد کا بیس کیا پڑے۔ چنانچہ 1958ء میں وادی کشمیر کو خیر باد کہا اور آزاد کشمیر میں وارد ہوئے۔ آگے بڑھے اور پشاور کو اپنی تربیت کا مرکز بنادیا۔ وہاں یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کیا۔ اور ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے روز نامہ "انجام" کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ یہ سب کچھ مصروفیت کا بہانہ تھا۔ ان کی اصل تحریک کچھ اور تھی۔ سیماں کیفیت کا حامل یہ غیور کشمیری نوجوان اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لیے فکر و تدبیر کرتا رہا، کافی غور و خوض کے بعد فکر و نظر کا یہی جواب تھا کہ مقبول کو اپنے وطن کی عزت اور آزادی کے لیے خود جنگ و شکوه کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ کراچی میں چند ہم خیال دوستوں کی محفل منعقد ہوئی۔ محفل میں مقبول بٹ صاحب تھے، امان اللہ خان صاحب اور لوں صاحب بھی تھے، مقبول بٹ صاحب نے سفر عزیمت کی تیاری کی، قافلہ سخت جان میں مقبول بٹ صاحب کے علاوہ اور نگریب اور محبہ امان اللہ تھے۔ یہ قافلہ 1966ء میں وادی کشمیر میں داخل ہوا مقبول بٹ صاحب کشمیری نوجوانوں کو رموزِ خودی سکھاتے رہے، یہاں تک کہ بھارتی فوجوں نے ان کے گوریلا مسکن کو گھیرے میں لیا۔ اور نگریب نے جوش جوانی میں مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ مقبول بٹ صاحب گرفتار ہوئے، ان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ شروع ہوا۔ ہندوچ جنگ نیل کوٹھ گنجو نے سزاۓ موت کا فیصلہ ٹھایا، مقبول بٹ صاحب سری نگر جیل سے فرار ہونے کا پلان تیار کیا۔ دواڑھائی ماہ کی مسلسل محنت کے بعد نیل کی دیوار میں سرگنگ بنا لی۔ میر احمد نے اس کام میں اہم روლ ادا کیا۔ جیل سے رخصت ہوئے، میر احمد اور چوہدری یسین صاحب رفقاء سفر تھے، مقبول بٹ صاحب اور ان کے ساتھی پورے سولہ دن تک وادی کے میدانوں، جنگلوں اور برف پوش پہاڑوں میں سے گزرتے رہے اور بالآخر آزاد کشمیر میں وارد ہوئے، یہاں پاکستان کے تفتیشی مرکز میں دو مہینے گزارے، اور دوستوں کی "دوستی" کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ تشدید کا سلسلہ ادھر بھی جاری رہا۔ پھر بھی دوست دوست ٹھہرے۔

رہائی کے فوراً بعد مقبول بٹ صاحب تحریک ہوئے۔ نومبر 1969ء میں محاذ رائے ٹھاری

کے کونشن میں مجاز کے صدر مقرر ہوئے۔ میں اس کونشن میں موجود تھا اور اسی کونشن میں مقبول بٹ کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی۔ مجاز رائے شماری کے دیگر بزرگوں سے بھی ملا۔ ان میں غلام مصطفیٰ علوی صاحب، ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب، عبدالخالق انصاری صاحب اور رشید حضرت صاحب بھی شامل ہیں۔ 71ء کی جنگ نے پاکستان کا ذہنی توازن ہی درہم برہم کیا۔ پاکستان کے غلط کار، بدکار سیاست دانوں کو جو سزا اپنی غذہ اری کے لیے ملنی چاہیے تھی وہ مقبول بٹ صاحب اور اس کے تین سو فقاۃ تحریک کو ملی۔ شاہی قلعہ لاہور میں مقبول بٹ صاحب اور ان کے دوست بیشوں ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب تشدید کا نشانہ بنے۔ عبدالخالق انصاری صاحب اور علوی صاحب جیسے بزرگ بھی اس ظلم و تشدد کا نشانہ بنے۔ بہر حال تین سال کی نظر بندی کے بعد پاکستان کی اعلیٰ عدالت نے ان سب کو بری کر دیا۔ اشرف قریشی صاحب بھی رہا ہوئے۔ البتہ ہاشم قریشی صاحب کو خفت مٹانے کے لیے کچھ وقت کے لیے نظر بند رکھا گیا۔ بالآخر وہ بھی باعزت طور پر رہا ہوئے۔

1974ء میں میر پور مجاز رائے شماری کے کونشن میں مقبول بٹ صاحب نے بھی عہدوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آج سے میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے کشمیر کی آزادی کے لیے کام کروں گا۔ مقبول بٹ صاحب ساتھیوں کی تلاش میں تھے جو نئے صبراً زماں سفر میں رفاقت کا حق ادا کرنے کے اہل ہوتے، عبدالحمید بٹ صاحب اور ریاض ڈار صاحب دونوں نوجوان سامنے آئے، ایک کی عمر 24 سال تھی اور دوسرے کی 17 سال دونوں بہادر اور سخت جان تھے، مقبول بٹ صاحب میں 1976ء میں شملہ ایکارڈ اور اندر راہ عبداللہ ایکارڈ کے خلاف عملی احتجاج کرنے کے لیے دادی کشمیر میں داخل ہوئے۔ مشیت ایزدی کے تحت کچھ غیر معمولی واقعات کا سامنا ہوا لگیت میں تینوں مجاہدین ایک مرکر کے میں گرفتار ہوئے۔ مقبول بٹ صاحب کو کچھ وقت کے بعد وہ بھی تھاڑ جیل منتقل کیا گیا، جہاں انہوں نے پورے آٹھ سال گزارے عبدالحمید بٹ صاحب اور ریاض ڈار صاحب جموں کشمیر کی جیلوں اور انڈر گیشن سنٹرلوں کی زینت بنے رہے۔ ان دونوں مجاہدوں کو سخت اذیت پہنچائی گئی لیکن دونوں مجاہدوں نے صبر و ثبات سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بالآخر جموں کشمیر کی جیلوں اور اذیت فانلوں میں بارہ سال گزارنے کے بعد اپریل 1988ء میں واپس آزاد کشمیر میں وارد ہوئے۔ دونوں

مجاہد کچھ وقت تک لبریشن فرنٹ میں کام کرتے رہے۔ بالآخر دونوں مجاہد کشمیر فریڈم موسومنٹ کے لیے وقف ہوئے۔ عبدالحمید بٹ صاحب کا فقر و استغناہ قابلِ رشک ہے۔ گرجدار مگر پر سوز آواز میں بات کرنے والا یہ مجاہد شہید مقبول بٹ کے مشن کی تکمیل کے لیے آج بھی مستعد ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی ایک تکلف ہے۔ فی الحقیقت جنگ آزادی کشمیر کے مصروف مجاہد ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ عبدالحمید بٹ صاحب شہید مقبول بٹ صاحب کے حقیقی جانشین کارول ادا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ یہ کام جتنا کٹھن ہے اتنا ہی صبر آزمائیں، اللہ تعالیٰ ان کی تائید و حمایت فرمائے۔ شہید مقبول بٹ صاحب کے مشن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنا معیار ہے تو اس وقت رفقائے مقبول بٹ کی فہرست لمبی ہے۔ ان میں مجاہد سید عبدالحمید دیوانی صاحب بھی شامل ہیں۔ شبیر احمد شاہ صاحب بھی شامل ہیں، بشیر بٹ صاحب بھی شامل ہیں اور اشرف صحرائی صاحب بھی شامل ہیں۔ اور جناب سید علی گیلانی صاحب بھی شامل ہیں۔ یسین ملک صاحب اور عبدالحمید شیخ صاحب تو اس فہرست میں پہلے ہی شامل ہیں۔ اس وقت میدانِ جنگ میں جو مجاہدین سرگرم عمل ہیں ان میں ہلال بیگ صاحب، یسین بٹ صاحب، احسن ڈار صاحب، مقبول الہی صاحب، جاوید میر صاحب، غازی شفاعت اللہ صاحب، گلزار پہلوان صاحب، مشتاق زرگر صاحب، بابر بدرا صاحب، شکیل بخشی صاحب، شیخ عبد العزیز صاحب جیسے مجاہدین کے نام سرفہرست ہیں۔

شہید مقبول بٹ صاحب کشمیر کی عبقری سیاسی شخصیت (Political Genius) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتے ان کے رفقاء سفر اس کا ادراک دس سال کے بعد کرنے کے اہل ہوتے، فروری 1984ء میں مقبول بٹ صاحب کو تھاڑ جیل میں شہید کیا گیا۔ کشمیر کے ایسے کتنے ہی اسلام پسند دوست ہیں۔ جو اس واقعہ کو ایک مجنوں کے غیر حقیقت پسندانہ جنوں کا منطقی انجام قرار دیتے رہے، احقر کتنے ہی دوستوں سے اپیل کرتا رہا کہ مقبول بٹ کو شہید مقبول بٹ کے الفاظ سے یاد کریں۔ وقت نے کروٹ بدلتی، مقبول کے شیدائیوں نے ہتھیار اٹھائے، ہر فرزند کشمیر مقبول بٹ بنا، آج ہر جگہ مقبول کو شہید مقبول کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، شہید مقبول بٹ کے رفقاء دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سبھی مرید ان مقبول اپنی قومی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے باہمی اتحاد

و اشتراک کے جذبہ کے تحت ہمہ گیر تحریک شخص کشمیر کی مہم کا آغاز کریں تو وہ دن دو نہیں، جب گرد و پیش کے سیاسی سیاح کشمیر کو اپنے حال پر چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔ اگر گرد و پیش کی ہمسایہ قوموں نے اپنی حریصانہ نگاہوں کا علاج نہ کیا تو انھیں اپنی تباہی کے مناظر کا مشاہدہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کشمیر کا حسن و جمال ہمارے ہمسایہ ممالک کی تباہی کا باعث بنے، بہر حال اس بات کا فیصلہ کرنا ان کا کام ہے کہ ہوس ملک گیری میں ملکوں کی تباہی کا بندوبست کرتے ہیں یا یہ کہ وسعت فکر و نظر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیر کی انفرادیت اور قومی شخص کے تحفظ کو یقینی بنانا لازمی سمجھتے ہیں۔ اللہ کرے کہ ہمارے دوستوں اور دشمنوں دونوں کو وقت کی نزاکت کا احساس ہو جائے۔

(بحوالہ ہفت روزہ قائد مظفر آباد)

(20 فروری 1992ء 28ء)

محمد مقبول احمد بٹ کی شہادت اور ہسم

ڈاکٹر غلام قادر وانی (بانڈی پورہ کشمیر)

یہ میرے بچپن کا قصہ ہے اور میرا بچپن میرے ہم عصر دوستوں، ساتھیوں اور کشمیریوں کی ایک جوان نسل کے ساتھ ایک سی محرومیوں اور اضطراب کے سایلوں میں پروان چڑھا۔ ہمارے مذہل سکول کے دن تھے۔ چھٹی دھائی اپنے دوسرے حصے سے گزر رہی تھی، ان دنوں ایک طرف روس کا طویلی بول رہا تھا۔ دوسری طرف امریکہ کی طاقت کا لرزہ طاری تھا۔ جبکہ چین میں ماوزے تگ اور چوایں لائی کی قوم نے گراں خوابی کو خیر باد کہہ کر ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کا عزم کیا تھا۔ عرب ابھی تیل کی دولت کے ذریعے اتنے متعدن اور متمول نہیں ہوئے تھے۔ مصر میں جمال عبدالناصر نے اخوان المسلمين کے اسلام پسند قائدین کو پابند سلاسل کیا تھا۔ ان میں سے عبدالقادر عودہ اور سید قطب شہید جیسے عظیم مسلمان راہنماء زادے موت کے ذریعے عرب قومیت کو لکارنے اور اسلام کی نشأۃ ثانیة کا خواب دیکھنے کے جرم میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ مجاہدین کے کشمیر میں داخلے کے بعد نوجوان نسل اور بچوں میں ایک پراسرار ناقابل بیان مہم جوئی کی تمنا بھی پروان چڑھ رہی تھیں۔ شیخ محمد عبد اللہ اپنے رفقاء سمیت پابند سلاسل تھے۔ محاذ رائے شماری کی تحریک جاری تھی۔ ”یہ ملک ہمارا ہے اس کا فیصلہ ہم کریں گے، رائے شماری فوراً کراو، جس کشمیر کو خون سے سینچا، وہ کشمیر ہمارا ہے۔“ کے نعروں سے کشمیر کے بیباں و خیابان گونج رہے تھے۔ ہم اسکول کے طلباء اس صورتِ حال کے خاموش مشاہدین تھے۔

انہی دنوں بانڈی پورہ کے قصبے اور دیہات میں ایک چسپاں اشتہار میں لکھا گیا تھا کہ سترل جیل سری گر سے تین ”خطرناک“ قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ فرار ہونے والے قیدیوں میں ایک کاتام محمد یسین تھا جو ”برنہ دوب“ کے رہنے والے تھے اور ان میں ایک مانوس سانام محمد مقبول بٹ تھا جو تری گام

کے تھے۔ ان دنوں تری گام کا موضع بھی ضلع بارہ مولہ میں شامل تھا۔ بہت بعد میں کپواڑہ ایک ضلع بن گیا اور تری گام کپواڑہ ضلع کے حصہ کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس اشتہار کے شائع ہونے کے بعد وادی سہیل کے دور دراز علاقوں میں محمد مقبول بٹ کے بارے میں مختلف کہانیاں سننے میں آئیں کہ کس طرح انہوں نے جیل کے باہر زنانہ خانے کے حصے سے سرگنگ کھود کر شدید برف باری اور سردی کے تباہ میں اپنے فرار کو ممکن بنایا اور سری نگر سوناواری، سوپور، ہندوارہ سے ہوتے ہوئے واپس آزاد کشمیر پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے محمد مقبول بٹ ایک انسانوی شخصیت بن گئے وہ عرصہ دراز سے سری نگر جیل میں محبوس تھے اور نادی بل بارہ مولہ کے آس پاس امر چند نامی سرکاری پولیس مخبر کے قتل کے الزام میں نجیل کوئنچو پر مشتمل ایک عدالت نے ان کو سزاۓ موت کا حکم سنایا تھا۔ محمد مقبول بٹ واپس آزاد کشمیر پہنچ گئے۔ ادھر وادی میں نوجوانوں کے اندر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف جدو جہد کرنے اور کسی طرح کی مسلح بغاوت اور شورش برپا کرنے کی آرزو انگڑائی لینے لگی اور جتنے بھی باصلاحیت طالب علم نوجوان اور حریت پسند لوگ وطنِ عزیز کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانے سے بیقرار و مضطرب تھے انہوں نے ایک دوسرے سے مل کر وطنِ عزیز کے اختلاص کے لیے تدبیروں پر غور کرنا شروع کیا۔

”ریڈ یو کشمیر“ کے بعد ”الفتح“ نے جنم لیا۔ نوجوانوں کے جذبات میں عشق کی گرمی اور جدو جہد کے جذبے نے آگ لگادی۔ الفتح کے سارے منصوبے طشت از بام ہونے کے بعد عسکریت کے حوالے سے کسی نئی کوشش اور جدو جہد کے کسی نئے طریقے پر سوچنے کے لیے ہمت ہی جواب دے گئی۔ ان دنوں نوجوانوں کی بحث و تمحیص کا یہی موضوع ہوتا تھا کہ کس طرح جدو جہد کو شروع کیا جائے نوجوانوں کے سامنے ان دنوں ایک مسئلہ یہ تھا کہ ریاست میں کوئی سیاسی قیادت ایسی نہ تھی جو جدو جہد آزادی کو ٹھووس بنیادوں پر شروع کرے۔ رائے شماری کی تحریک کو ختم کرنے کے بعد رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بھارت کے آئین کا حلف لے کر آئیلی کے انتخابات میں حصہ لینے والے نوجوانوں کو مہماں نہیں کر سکتے تھے۔ شیخ عبداللہ نے مجاز رائے شماری کو توڑا لالا اس سے قبل وہی تحریک پوری قوم کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔ ان کے موقف تبدیل کرنے کے بعد اور قوم کی ناؤ کو منزل مراد پر پہنچانے سے قبل ہی انہوں نے اپنے چاہنے والوں کو پیچ راہ کے چھوڑ دیا۔ ان کے بعد کوئی تبادل

قیادت بھی سامنے نہ آئی جو تحریک آزادی کو ایک ہمہ گیر قومی تحریک کے طور پر آگے لے جاسکتی تھی۔ انہی دنوں نوجوانوں نے 1975ء کے ایکارڈ کے خلاف جگہ مظاہرے کیے۔ غلام محمد بلاسوبور میں گرفتار ہوئے اور بشیر الدین فاروقی ذہی۔ ایس۔ پی کے ہاتھوں ان کی پٹائی ہوئی۔ انٹرو گیش سنتر میں ان کی حالت خراب ہو گئی اور سنترل جیل سری گنگر میں وہ داعیِ اجل کولبیک کہہ گئے۔ انہی دنوں شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کو بھی ایم جسی کے دائرہ اختیار میں لا یا۔ اندر اگاندھی نے ملک بھر میں ایم جسی نافذ کی۔ شیخ محمد عبداللہ کا گنگر میں کی مدد سے وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے اور اس دور میں تقریر و تحریر پر بڑی سخت قسم کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس کے باوجود کشمیریوں نے حقِ خود ارادت کے لیے جدوجہد کی تحریک کو جاری رکھنے کے لیے قربانیاں پیش کیں۔ اور سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ اور نوجوان ریاست کے تمام زندان خانوں میں قید و بند کی صعوبتیں گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ایم جسی کے ایام میں حریت پسندوں نے اندر عبداللہ ایکارڈ کے خلاف ایم جسی کے خلاف اور مولانا آزاد کالج کے نام تبدیل کرنے کے خلاف تحریکیں چلا گئیں۔ محمد مصدق، عادل محمد، فاروق رحمانی، محمد اعظم انقلابی، محمد رفیق وانی، ایس جمید، محمد اسلام وانی، شبیر احمد شاہ، بشیر احمد گوہر، قاسم سجاد، غلام حسن انقلابی، محمد سلیم بیگ، فضل الحق قریشی، بشیر احمد بٹ، شیخ غلام حسن، عبدالوحید کرمانی، بشیر احمد لوون، عبدالرازاق سوبوری، غلام محمد خان، فاروق صدیقی، شمار احمد پنڈت، شبیر احمد جالب، اور دیگر سیکڑوں نوجوانوں نے کھلی عام بھارتی استبداد کو چیلنج کیا اور تحریک آزادی وطن کے لیے اپنی جوانیوں کو قید و بند کے رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔ انہی ایام میں مرحوم سید عبدالجمید دیوانی نے بھارت کے طیارے کو اغوا کیا اور یہی ایام تھے جب شہید کشمیر مقبول بٹ دوبارہ دار کشمیر ہوئے اور لنگیٹ ہندو اڑہ کے مقام پر جموں کشمیر بینک کی مقامی شاخ کے نیجر کے ساتھ گھنٹم گھنٹا ہونے کے بعد گرفتار ہوئے۔ پیر غلام حسن شاہ ان دنوں کشمیر پولیس کے چیف تھے اور سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ کشمیر کی پوری انتظامیہ متحرک ہو گئی۔ ایک بار پھر سیکڑوں افراد گرفتار کیے گئے۔ سو پور، نو پورہ، نیدوارہ، گند براٹھ، سیلو، زینہ گیر، براٹھ کلان سے کافی تعداد میں شہید مقبول بٹ کے ساتھی گرفتار کیے گئے۔ اب کی بار محمد مقبول بٹ کی گرفتاری ریڈ یو اور اخبارات پر چند دنوں کے لیے چھائی رہی۔ اور ان کو تھاڑ جیل نہیں دہلی منتقل کیا گیا۔ اندر عبداللہ ایکارڈ کے بعد جب بظاہر تحریک آزادی کشمیر کا

سودا ہوا تھاریا ست میں کشمیری طباء کی تحریک گورنمنٹ کالج سوپر کے طباء کا مسلسل احتجاج، غلام محمد بلہ کی شہادت، ریاست پر ایم جنسی کانفاؤنڈ مقبول بٹ کی گرفتاری، سید عبدالحمید دیوانی کے جہاز کا اغوا، پچھا ایسے واقعات پیس آئے جنہوں نے کشمیر میں تحریک آزادی کو تیز تر کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ شیخ جبل الاسلام کی قیادت میں اسلامی جمیعت طباء جموں کشمیر نے بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کرنے کا اعلان کیا تو ایک بار پھر کشمیری سیاست کے مجدد ریاض میں موج پیدا ہوئی۔ کشمیر کے اندر میں الاقوامی کھیل کا انعقاد ہو یا اسلامی کانفرنس کا انعقاد، کشمیری نوجوانوں نے ہر موقع پر تمام ترجیبات کے ساتھ بین الاقوامی برادری تک کشمیر کی تنازعہ حیثیت کا مسئلہ پہنچانے کی کوشش کی، گرفتاریاں دیں جنہیں لے لہرائے، جلنے کیے، جلوس نکالے اور رد عمل کا اظہار کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا معاملہ ہو یا جزل ضیاء الحق کا ہوائی حادثہ یا او جڑی کیمپ کا واقعہ، ہر موقع پر کشمیری عوام نے رد عمل کے طور پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ کشمیری نوجوانوں کی خواہش تھی کہ کسی طرح بھارت ان کا غصب شدہ حق ان کو دے دے اور پاکستان اور ہندوستان کے ارباب اختیار کشمیریوں کو اپنی مرضی سے اپنا مستقبل سنوارنے کا موقع دیں۔ شہید مقبول بٹ کی دوبارہ گرفتاری کے بعد وہ کشمیری نوجوانوں کی توجہ کا مرکز رہے۔ اسلامی جمیعت طباء، مجاز آزادی، پیپلز لیگ، کالج یونیورسٹی اور نوجوانوں کے چھوٹے مٹے گروہ مل کر شہید مقبول بٹ کی سزاۓ موت پر نظر ثانی کرنے کے لیے احتجاجی مظاہرے کرتے رہے اور یوں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ سوپر، بارہ مولہ، اسلام آباد، کپوارڈا وغیرہ جیسے مقامات پر نوجوانوں اور طباء کے چھوٹے بڑے اجتماعات نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ بعد میں سپریم کورٹ اور بھارتی صدر کے نام یادداشتیں کا سلسلہ شروع ہوا تا کہ ان سے شہید مقبول بٹ کی سزاۓ موت پر نظر ثانی کرنے کو کہا جائے۔ اس کے رد عمل میں حکومت وقت نے ان جلوس اور اجتماعات میں شمولیت کرنے والے ارکان اور افراد کو مقدمات میں پھنسا دیا اور ان کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، راقم السطور اور پیپلز لیگ کے چیزیں مخد فاروق رحمانی پر اس قسم کا ایک مقدمہ تقریباً پانچ سال سیشن نج بارہ مولہ کی عدالت میں زیر سماعت رہا۔ شہید مقبول بٹ کی تھاڑی جیل میں نظر بندی کشمیری نوجوانوں کے لیے بجائے خود ایک تحریک بنی۔ میرے دہلی میں پانچ سالہ قیام کے دوران مجھے دوبار گرفتار کیا گیا اور یہ گرفتاری بھی شہید

مقبول بٹ کے حوالے سے تھی۔ چنانچہ دہلی میں مقیم کشمیری نوجوان اکثر زیر عتاب آتے رہے اور اس طرح تحریک آزادی کشمیر کے لیے ایک فضا تیار ہو گئی۔ 1983ء کے آخر میں فاروق عبد اللہ جب کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے۔ کشمیر کے طول و عرض میں وسیع پیانے پر گرفتار یاں عمل میں لا کی گئیں۔ اور ان گرفتاریوں کے پس منظر سے کوئی واقف نہ تھا۔ سری گنگر کی سٹرل جیل نظر بندوں سے بھری پڑی تھی۔ جنوری 1984ء میں نظر بندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ فروری 1984ء کی 11 تاریخ کو محمد مقبول بٹ تہاڑ جیل میں شہید کر دیئے گئے۔ تب جا کر لوگوں کو اپنی نظر بندی کی وجوہات معلوم ہو گئیں۔ فاروق عبد اللہ نے بلیک وارنٹ پر دستخط کیے۔ اس کے بعد وادی کے قصبه و دیہات میں ان لوگوں کو گرفتار کیا گیا جن سے کسی رِ عمل کا خطرہ تھا۔ فیصلہ سنانے والے بچ نیل کٹ گنجوکی رہائش گاہ، واقع کرن گئے سری گنگر پر سرکار نے مسلح محافظہ تعینات کیے۔ بٹ صاحب کو پھانسی کے بعد جیل کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ ان کی لاش اس لیے ان کے ورثاء کے حوالے نہ کی گئی کہ کشمیر میں اس سے انقلاب برپا ہو جاتا۔ پوری قوم اس مظلوم شہید کے استقبال کے لیے امنڈ پڑتی اور یہ تحریک کوئی نیا رُخ اختیار کر سکتی تھی۔ 11 فروری 1984ء جب شہید محمد مقبول بٹ کو انتہائی بے دردی کے ساتھ تنخواہ دار پر لٹکانے کے بعد تہاڑ جیل کے احاطے میں دفن کیا گیا تو کشمیر میں محمد مقبول بٹ کو جانے والے اور اس کے سبھی پرستار کشمیر کی مختلف جیلوں میں بند پڑے تھے۔ حکومت وقت نے اس سے پہلے ہی منصوبہ بندی کر رکھی تھی اور اس روز شہر و دیہات میں انتظامیہ نے خفظی انتظامات کیے تھے۔ آزاد کشمیر میں 12 فروری کو شدید مظاہرے ہوئے اور مقبوضہ کشمیر میں بھی 12 فروری کو حریت پسندوں نے اس ظالمانہ اقدام کے خلاف بھر پور اظہار احتجاج کیا۔ اس کے بعد فاروق عبد اللہ کی حکومت کی مہلت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بہنوںی غلام محمد شاہ نے فاروق عبد اللہ کے سابق آقائے ولی نعمت کے ساتھ مل کر اس کو وزارت اعلیٰ کے عہدے سے محروم کر دیا اور خود اس پر براجمان ہو گیا۔ 1985ء میں یارانِ قفس رہا ہوئے تو 11 فروری 1985ء کو مقبول بٹ کی شہادت کا دن پورے جوش و خروش اور عزّم و ہمت اور اعلان آزادی کے نعروں کی گونج میں منایا گیا۔ تمام وادی میں تاریخی ہڑتال رہی، مجاز آزادی، پیپلز لیگ، اسلامی جمیعت طلباء، اسلامی سنو ڈنیس لیگ نے اجتماعی مظاہروں اور ہڑتال کی کال دی۔ مظاہرے ہوئے گرفتار یاں پیش کی

تھیں۔ اور تب سے آج تک یہ دن ہماری تحریک آزادی کا سرعنوان ہے۔ مقبول بٹ کی شہادت کے دو سال بعد مسلم متحده مجاز کے پرچم تلے ریاست کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تنظیموں کے اتحاد نے راجیو فاروق گھوڑے کے خلاف ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا اور موجودہ عسکری جدوجہد میں کمکھ نمایاں لوگ بھی اس انتخاب میں مسلم متحده مجاز کے امیدوار تھے۔ انتخابات میں وسیع پیانا پر دھاند لیاں ہوئیں اور آئینیں ہند کا حلف اٹھانے والی جماعتیں بھی بہر حال مجبور ہو گئیں۔ انہوں نے بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف احتجاج کے طور پر تمام تر انتخابات کا بایکاٹ کیا اور اس کے بعد مسلسل جدوجہد کا آغاز ہوا۔ مسلم متحده مجاز کے پرچم تلے کامیاب ہونے والے چار ممبر ایں اسمبلی میں سے تین ارکان نے تقریباً دو سال کے بعد اسمبلی رکنیت سے استعفی دے دیا اور نوجوانوں کی طرف سے چلائی جانے کے بعد عسکری تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ ریاست میں سیاست کا محور بدل گیا۔ پارٹی عہدوں میں پریم کمانڈر، چیف کمانڈر، ائمیلی جنس چیف اور بیس کمانڈر جیسی اصطلاحات وجود میں آگئیں اور لوگ جسے جلوسوں کے بجائے کریک ڈاؤنوں، ائرو گیشنس سنشر، کراس فائرنگ، بارودی سرنگوں کے دھماکے، کلاشنکوف ایمبش (AMBUSH) کر انگ، ہائیڈ آوت اور کیمپو فلامج کی اصطلاحوں سے واقف ہو گئے اور پوری قوم عسکری سوچ اور اپروچ کی حامل ہو گئی۔

محمد مقبول بٹ کی شہادت نے کشمیری قوم کی سوچ کے زاویے اور عمل کے محور کو بدل دیا اور بڑی دیر کے بعد کشمیر کے خواص و عوام کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مقبول بٹ کا راستہ ہی آزادی کا راستہ ہے۔ محمد مقبول بٹ کا الیہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو اپنی سوچ سے ہم آہنگ نہ کر سکے یہ ان کا قصور نہ تھا بلکہ وہ اپنے وقت اور زمانے سے دس سال آگے پیدا ہوئے تھے۔ محمد مقبول بٹ کو اپنے وقت میں ڈبل ایجنسٹ کہا گیا اور ان کے خلاف "اہل حکم" ایک طرف برسر دربار کڑکتے رہے تو دوسری طرف کئی "شیخ" بھی مرگو شہر منبر گر جتے رہے لیکن انہوں نے راہ و فا میں اپنا نقد جان پیش کرنے کے بعد نا صھین اور نا قدیم کے لیے ابدی پچھتاوے کی آگ سلاگائی جس میں وہ جلتے رہے حتیٰ کہ خود اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس تحریک کا حصہ بن گئے۔

بعد مرنے کے مری قبر پر آیا وہ میر

یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

تھا ز جیل میں محمد مقبول بٹ نے پھانسی کے پھندے کو چوم کر کشیمری قوم کو یہ پیغام دیا کہ جب تک وہ آزادی کے لیے جان، مال، عزت و آبرو قربان کرنے کا وظیرہ اختیار نہ کر لیں تب تک بھارت کو آزادی کے لیے کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ راز بہت دیر کے بعد ہی سہی کشیمری قوم کے نوجوانوں نے پالیا۔ انہوں نے مقتل کارخ کیا۔ اشفاق مجید شہید، عبدالحمید شیخ شہید، عبدالماجد ڈار، ناصر الاسلام اور ان جیسے سیکڑوں نوجوانوں نے جام شہادت نوش کیا اور غلامی کی زندگی پر آزادی کی موت کو ترجیح دی۔ انہوں نے عزم استقلال اور بہادری کے ساتھ شہادت گاہ الافت میں قدم رکھا اور یہ ثابت کردیا کہ آزادی کے لیے لڑنے والی قوموں کے لیے اپنے جوانوں کے سروں کی فصل کٹوانا کوئی مہنگا سودا نہیں ہوتا۔ قوم کے بوڑھوں، نوجوانوں اور پکوں نے بھی یہ ثابت کیا جن لوگوں نے محمد مقبول بٹ کو تھا ز جیل میں پھانسی کا پھندہ اپہنا کر حریت کی شمع کو بجھانا چاہا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی تھی اور ان پر واضح ہو گیا کہ اب وہ آزادی کے لیے کفن بردار نوجوانوں کی ایک پوری فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے مجبور ہیں اور یہ کہ محمد مقبول بٹ کا اندازاب ہر کشیمری نوجوان کے لیے مشعل راہ ہے۔

محمد مقبول بٹ کی شہادت کے وقت کشیمریوں کے قریب ترین ہمسایہ اور مسلکہ کشیمر کے ایک فریق پاکستان نے اپنے لوگوں سے مہر سکوت نہ توڑا۔ اس وقت سے آج تک ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخلاقی اور سفارتی مدد کی رث لگانے سے آگے کی نوبت نہ آئی۔ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ کشیمر ہماری شہرگ بھی کشیمر کمیٹی کے چیئر مین نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نے حقے کا کش لگانے کے بعد کہا کہ کشیمریوں کو ہم آزاد نہیں دیکھ سکتے بلکہ اسلام آباد سے انتہا ناگ تک پہ ہمارا حصہ ہے۔ بنظر بھٹو نے اس پر یہ اضافہ کر دیا کہ مکران سے لے کر اسلام آباد و انتہا ناگ تک کشیمر ہمارا ہے۔ کشیمر جل رہا ہے، لٹ رہا ہے اور وہاں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ لیکن شہرگ والوں کی فوج تماشائی بھی ہوئی ہے۔ خود آزاد کشیمر کے لوگ اس جہاد میں شامل نہیں ہیں۔ کشیمر میں ایک طرف کشیمریوں کا خون بہہ رہا ہے تو دوسری طرف مدراس اور دہلی کے بھارتی سپاہی کا دھڑن تختہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں وزارتیوں کی

بذریانٹ ہے۔ آزاد کشمیر ایک پچاروں لینڈ بن چکا ہے جہاں 22 وزراء کی فوج ظفر موج آیک وزیر اعظم اور صدر محترم اڑھائی اضلاع کی سلطنت کے ظلِ الہی اور سلطانِ معظم بنے بیٹھے ہیں۔ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کو ایک دوسرے کے جھگڑے سے فرصت نہیں ہے۔ جنیوا اور نیو یارک کی سفارتی ناکامیوں کے داغِ دھونے کے لیے اوآئی سی کی قرارداد کو ”فتح عظیم“ سے تعبیر کیا گیا اور اس ایک ہنگامے پر تمام گھر کی رونقِ موقوف ہے۔ بزعغم خویش اس کے بعد پاکستان نے کشمیر کو فتح کیا ہے حالانکہ پرانالہ وہیں کا وہیں ہے۔ بھارتی استبداد اور خون مسلم کی ارزانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ جب مقبول بٹ نے کہا تھا کہ ہمیں نہ پاکستان آزادی دلسا کتا ہے اور نہ بھارت، ہمیں خود ہی جدوجہد آزادی کو تیزتر کرنے کے لیے قربانیاں پیش کرنا ہوں گی تو صحیح کہا تھا اور جب انھوں نے کہا تھا کہ دنیا اس مسئلے کو پاکستان اور بھارت کا سرحدی تنازعہ سمجھ کر ہماری مدد سے کترار ہی ہے تو صحیح کہا تھا۔ آج صورت حال یہی ہے کہ مسئلہ کشمیر جب دو قوموں کے درمیان بلکہ دو ملکوں کے درمیان ایک سرحدی تنازعہ قرار پایا تو حقِ خود ارادیت پر منی بر انصاف جدوجہد آزادی کشمیر کے خلاف اندر وہی اور بیرونی سازشوں نے جنم لیا۔ تحریک آزادی ایک شورش اور بغاوت میں تبدیل کی گئی جس کی قیادت خود کشمیریوں کے ہاتھوں میں نہ رہی اور عالمی سطح پر اس کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی جس کی یہ مستحق تھی۔ چنانچہ اقوامِ عالم کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کشمیر بھارت کا حصہ بنتا ہے یا پاکستان کا اور ان کو کسی ملک کی سرحدوں میں اضافہ یا کمی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ کشمیریوں کے ذہن سے یہ غلط فہمی دور ہو گئی کہ انہیں پہلی گولی چلانی ہوگی اور اس کے بعد آزاد کشمیر اور پاکستان کے مجاہدین اور ان کی افواج بھارت کے خلاف صفت آراؤں گی حتیٰ کہ عالمِ اسلام کی اتحادی فوجیں ان کے شانہ بثانہ بھارت کے خلاف اعلانِ جنگ کریں گی۔

اس کے بجائے کشمیر میں ایک PROXY 2 جنگ کا آغاز کر کے کشمیری نسل کے خاتمے کے منصوبے پر عمل ہو رہا ہے۔ بیرونی دنیا کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ یہ کشمیریوں کی آزادی کی جنگ ہے لیکن حریت پسندوں کے گروہ درگروہ ترتیب دیتے گئے اور ان کو الحاق اور آزادی کے نام پر لڑایا گیا اور حق خود ارادیت کی من مانی تفسیر کی گئی اور پھر اس من پسند تاویل اور تفسیر کو منانے کے لیے طاقت اور اسلحہ کا بلا دریغ اور بلا جواز استعمال ہوا۔

محمد مقبول بٹ کے ساتھ اختلاف کرنے والے آج اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ بھارت ایک غاصب، پاکستان ایک تماشائی اور آزاد کشمیر ایک مجبور اور بے بس خطہ ہے جو اپنی مرضی سے نہ اس جنگ میں شامل ہو سکتا ہے اور نہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے۔

کرسی اقتدار نے حکمرانوں کو آزاد کشمیر میں جن مجبوریوں کے ساتھ جھکڑا ہے اس کے تفاضلے کے طور پر وہ بے بس ہیں اور لال قلعہ میں مقید انگریزوں کے وظیفے پر زندہ رہنے والے بہادرہ شاہ نظر اور شاہ عالم جیسے "طلال الہی" ہیں۔ بلا سیاسی خیرات پر پلنے والے فکرِ حریت اور قوم کی آزادی کی کس طرح بات کر سکتے ہیں؟

شہید محمد مقبول بٹ نے ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے قربانی کی رسم کی ابتداء کی۔ انھیں معلوم تھا کہ جان کی قربانی دیئے بغیر اس عظیم مقصد کے حصول کی جدوجہد کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ چنانچہ انھوں نے قربانی کا آغاز اپنی ذات سے کیا۔ بچوں اور اہل و عیال سے جدا ہی، وطن عزیز سے بھرت، قید و بند کی سختیاں اور بے خانماں کے زخم اور آخر میں اپنی متاع حیات اس راہ میں قربان کر دی۔

اے عشق تیری آن پر ہم سادہ دلوں نے
سرمایہ صد لعل و گہر ہار دیا ہے
ہونٹوں کی ہنسی ، دل کا سکون ، روح کی مسکان
جب کچھ نہ رہا پاس تو سر ہار دیا ہے

قطع نظر اس کے کہا ترے کیس اور مقبول بٹ کی شہادت کے ڈانڈے کہاں ملتے ہیں یہ بات صحیح ثابت ہوئی ہے کہ اگر محمد مقبول بٹ چاہتے تو لامم لائٹ اور گلیمیر کے ذریعے اپنی ذات کو شہرت کے ذریعے لوگوں پر سوار کرتے۔ پریس اور بیانات کے ذریعے شہرت حاصل کرتے اور پھر دوسروں کی لاشوں کے پشتے لگا کر خود اپنی لیڈر شپ کا محل تغیری کرتے۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر خود اس سے ہاتھ سینکتے جیسا کہ ان کے بعد ہوا اور ابھی تک ہو رہا ہے کہ کشمیری نوجوانوں کے مقدس خون پر سیاست کرنے والے آج عالمی سطح پر اس تحریک کے ترجمان بنے پیشے ہیں اور اس مقدس ہبہ کی تجارت کر

رہے ہیں۔ کشمیریوں کے دشمنوں اور محمد مقبول بٹ کے قاتلوں کے ساتھ ان کے راہِ رسم ہیں۔ زبان پر 84 ہزار مرلے میل کے کشمیر کا تذکرہ تو ہے مگر کشمیر کے حصے بخزے کرنے والی کسی سازش کے خلاف بکشائی نہیں کرتے۔ محمد مقبول بٹ کو بھارت میں ملک دشمن تصور کیا گیا اور ملک کی سلامتی کے خلاف ان کے بغایہ اقدامات اور خیالات اس حد تک ناقابل برداشت قرار پائے کہ بھارتی سامراج نے ان کی زندگی کا چراغِ گل کر کے ہی سکون کا سانس لیا۔ کشمیری قوم کے مغلص نوجوانوں کے لیے مقبول بٹ ایک ہیرد تھے۔ لیکن مجموعی طور پر قوم نے ان کی پہچان نہ کی، قدر نہ کی اور ان کی آواز کے ساتھ آواز نہ ملائی۔ آزاد کشمیر کے حکمران طبقہ اور مراعات یافتہ لوگوں کے لیے مقبول بٹ کا پیغام ناقابل عمل تھا۔ وہ سہولیات سے ہاتھ دھونا چاہتے تھے اور نہ ہی عافیت کوشی کو خیر باد کہنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے مجاہد کی آذان سکون و سکوت میں خلل ڈالنے کے متراff تھی۔ انھیں اس وقت ہوش آیا جب مقبول کی شہادت کے بعد آزاد کشمیر کے جوانوں نے مظاہرے کیے اور آزاد کشمیر اور پاکستان کے روئیے پر احتجاج کیا۔ مقبول کے کچھ جہاں دیدہ بزرگ اور حکمت و مصلحت کے علم بردار اُن کے طریق کار سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کے طرزِ عمل کو ایک رومانوی مہم جوئی کا نام دے کر اسے ناقابل التفات قرار دیتے تھے۔ حالانکہ بعد میں انھوں نے یہی طریقہ کاراپنایا اور ٹھیک اسی طرح اس آگ میں چھلانگ لگائی۔ لیکن محمد مقبول بٹ خودی، خودداری، خود بینی اور وقار و آزادی کی جو "طرح" ایجاد کر گئے اس سے اپنی مصلحتوں اور اندیشہ ہائے دور و دراز اور مادہ پرستی کی وجہ سے محروم رہے۔ خود مقبول بٹ کے اپنے قافلے کا بھی یہی حال ہوا کہ وہ مقبول بٹ کی زندگی سے درسِ عمل نہ سیکھ سکے اور انھیں ان کے اس طریق پر نظر نہ رہی کہ

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ پیغ غربی میں نام پیدا کر

کچھ کشمیری دانشوروں اور سیاستکاروں کا یہ فرمانا تھا کہ محمد مقبول بٹ کا طریقہ کاراپس لے چکی
نہ تھا کہ انھوں نے ہیک وقت پاک و ہند کے اداروں کو اپنے خلاف کر لیا حالانکہ بعد میں ہم نے اپنی
آفھوں سے دیکھا کہ کشمیری عوام نے اپنی بے مثال اور لازوال قربانیوں کا ریکارڈ قائم کیا لیکن پھر بھی

وہ قابل اعتماد نہیں ظہرے۔ حال ہی میں جب جوں کشمیر بریشن فرنٹ کے صدر محمد یاسین ملک دل کا دور پڑنے کے بعد جیل سے باہر آئے تو پاکستانی اخبارات نے ان کو "غدار" لکھا۔ روز نامہ جنگ میں ہارون رشید نے تحریر کیا کہ یاسین ملک کو کیوں رہا کیا گیا اور انہوں نے یہ کیوں کہا کہ کشمیری عوام خودا پنی تقدیر کا فیصلہ کریں گے۔ اس تحریر کے خلاف راولپنڈی اور مظفر آباد میں کشمیری حریت پسندوں نے بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے اور روز نامہ جنگ راولپنڈی کے سامنے بھی ایک بڑا مظاہرہ ہوا۔ محمد یاسین ملک کا اگر قصور یہ تھا کہ وہ ایک آزاد خود مختار کشمیر کی بات کرتے تھے اس لیے وہ قابل گردن زنی قرار پائے تو شیر احمد شاہ کا کیا قصور تھا؟ جو نہیں شیر احمد شاہ صاحب جیل سے باہر آئے تو انہوں نے آزادی کا نزدیکی اور جب انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ کشمیر نہ کسی کی ہبہ رگ ہے اور نہ ہی انٹ انگ بلکہ کشمیری حق خود ارادیت کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس حق کو حاصل کرنے کے بعد ہی وہ یہ فیصلہ کر پائیں گے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اپنے ایک دوسرے انٹرویو میں موصوف نے کہا کہ کشمیری عوام بھیڑ بکریاں نہیں ہیں کہ انھیں بھارت یا پاکستان اپنی اپنی طرف ہانکھیں۔ یہی بات یاسین ملک نے کہی تھی کہ کشمیر ان کی محبت ہے اور وہ اپنی محبت کو دہلی یا اسلام آباد کے بازاروں میں نیلام نہیں کر سکتے۔ محمد یاسین ملک کے خلاف غداری کا فتویٰ دینے کے بعد پاکستان کے اخبارات و رسائل میں کشمیری قوم کے ان نمائندوں کی مذمت میں مضمون نگار نجم الحسن عارف نے یہاں تک لکھ دیا کہ یاسین ملک اور شیر احمد شاہ دونوں عمر اور تعلیم کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ یعنی بقول کالم نگار کے نو عمر اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ نوائے وقت، جنگ، پاکستان، جسارت، ہفتہ روزہ تکمیر، کشمیر اور دوسرے ماہناموں اور جریدوں میں مسلسل ہزہ سرائی کی گئی۔ پہلے اکیلے محمد یاسین ملک کی رہائی کو ایک سازش قرار دیا گیا۔ بعد میں جب سید علی شاہ گیلانی اور عبدالغنی لون رہا ہوئے تو کہا گیا کہ یہ رہائیاں عالمی دباؤ اور پاکستان کی سفارتی کوششوں کی بناء پر ہوئی ہیں۔ پھر یہ کہا جا رہا تھا کہ شیر احمد شاہ کشمیری قوم کے اصل اور حقیقی نمائندے ہیں۔ اس لیے بھارت ان کو رہائیں کر رہا ہے۔ بعد میں ان کی رہائی عمل میں آئی ان کا شاندار اور تاریخی استقبال ہوا اور انہوں نے جو تاریخی تقریر کی اور کشمیری قوم کے اس عزم کو دھرا یا کہ ہم

کسی بیدرنی دباؤ کے بغیر اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو اخبارات نے، دانشوروں نے، فوجی ماہرین نے ہنگامہ برپا کیا کہ شبیر احمد شاہ کس کی بولی بول رہے ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کشمیر کا مسئلہ کشمیری عوام کی آزادانہ مرضی کے ساتھ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مسئلہ نہیں تو پھر مسئلہ کشمیر کیا ہے؟ اور اگر یہ صرف کچھ علاقوں کو بھارت سے چھین کر پاکستان میں شامل کرنے کا مسئلہ ہے تو پھر کشمیری قوم کس جرم اور قصور کی سزا کاٹ رہی ہے۔ پاکستانی فوج اُٹھئے اور اس خطے کو اپنے ساتھ ملا کر 1971ء کا داغ دھونے کی سعادت حاصل کرے۔ ممکن ہے کہ اسے لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ گھر ہمارے خاکستر ہوں قید و بند سے ہم گزریں، والدین اور بچے ہمارے شہید ہوں، ماں میں بہنیں اور بیٹیاں ہماری عزت و آبرو سے محروم ہوں اور بھارت اور پاکستان کے بیوروکریٹ اور سفیر شملہ، تاشقندہ، بلی یا اسلام آباد میں بیٹھ کر ہماری قسمت کے فیصلے ہماری غیر موجودگی اور غیر حاضری میں کس طرح ہو سکتے ہیں۔

کپڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

اور اگر محمد یا سین ملک اور شبیر احمد شاہ یہی کہتے ہیں کہ کسی تیری قوم یا فرد کا اس کی غیر حاضری میں کوئی دو فریق مل کر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تو وہ صحیح کہتے ہیں اور پوری قوم کی ترجیح کرتے ہیں۔ اگر بھارت اس قوم کو خریدنے سکتا تو سہولیات و امداد کے عوض یہ قوم کس طرح اپنی جدوجہد آزادی سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ شبیر احمد شاہ اور محمد یا سین ملک کے بعد ہفت روزہ "ٹکبیر" میں سید عارف بہار نے بھارت کی جیلوں میں ایک دہائی کے قریب نظر بندی کا عرصہ گزارنے والے محمد اعظم انقلابی صاحب اور غلام قادر وانی کے بارے میں لکھا کہ ان پر "دہلی" کا اثر ہے اور ان کو مشورہ دیا کہ انھیں محمد یا سین ملک سمیت عبدالغفار لون کو ارہنمائی قبول کرنی چاہیے۔ اس سے قبل سید عارف کے پیرو مرشد جناب الیف الدین ترابی صاحب نے اپنی ضخیم کتاب "تحریک آزادی کشمیر منزل و منزل" میں عبدالغفار لون صاحب کے خلاف جو کچھ تحریر کیا تھا وہ بھی تاریخ میں ریکارڈ ہو چکا ہے۔ کاسابلانکا میں پہلی بار مقبوضہ کشمیر کے دو رہنماء مولوی محمد عباس انصاری اور میر واعظ محمد عمر فاروق نے کشمیری عوام کی نمائندگی کی یہاں میر داعظ

نے پاکستان ٹیلیویژن اور اے پی پی کو الگ الگ دینے گئے انڑدیوں میں واضح کیا کہ کشمیری عوام مسئلہ کشمیر کے بنیادی اور اولین فریق ہیں۔ بھارت اور پاکستان اس مسئلے کو آپس میں دو طرفہ مذاکرات سے حل نہیں کر سکتے ہیں اور ایک سہ فریقی کانفرنس ہی کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دے سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جنگ بندی لائیں کے دونوں طرف رہنے والے کشمیریوں کا مشترکہ اجلاس بھی منعقد ہوا چاہیے۔

چنانچہ پاکستان سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ ”دی نیوز“ میں میر واعظ کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا۔ ان کے منصوبے کو امریکی پلان قرار دیا گیا اور بار بار اس بات کا تذکرہ کیا جاتا رہا کہ وہ کشمیریوں کی آزادانہ مرضی کی بات کیوں کرتے ہیں؟ میر واعظ کے بارے میں یہاں تک کہا گیا کہ اس نو عمری میں اس قسم کے تیور رکھنے والے اور اس قسم کی خطرناک باتیں کرنے والے نوجوان کے آئندہ عزائم کیا ہوں گے۔ ”ڈاکٹر غلام نبی“ کے ساتھ امریکی روابط، اور ”میر واعظ ایک سازش کا شکار“ ہونے کے افسانے بنائے گئے۔ ”غلام نبی“ اور میر واعظ کی ملاقات“ پر حاشیہ آرائیاں ہوئیں اور زیب داستان کے لیے ”دی نیوز“ کے کالم نگاروں اور نوامہ نگاروں نے دور کی کوڑیاں لائیں ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور روزنامہ ”نوائے وقت“ میں نواب زادہ نصراللہ خان کی پریس بریفنگ کے حوالے سے ارشاد احمد عارف نے جوتاڑہ کالم 25 دسمبر 1994ء کو تحریر کیا اس میں اپنی پرانی باتوں کا اعادہ کیا گیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

”حریت کانفرنس کے کئی رہنماؤں کی طرح میر واعظ عمر فاروق بھی تھرڈ آپشن کو نہ صرف یہ کہ مسترد نہیں کرتے بلکہ 1947ء سے پہلے کشمیر کی پوزیشن بحال کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جو شخص بھی بھارتی استبداد کے خلاف برسر پیکار ہے وہ ہمارے سمیت ہر پاکستانی کے لیے قابل احترام ہے اور اس کی خدمات کا احترام کرنا چاہیے مگر..... مسئلہ کشمیر سے ہماری دلچسپی اسلام آباد اور پاکستان کے حوالے سے ہے۔ اگر دادی کشمیر کی آزادی کا مطلب جموں، آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان پر مشتمل ایک الگ ریاست کا قیام ہے جس کے نتیجے میں ہماری سرحدیں جی ٹی روڈ اور ماںہرہ تک سمت آئیں گی تو کسی پاکستانی کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ میر واعظ عمر فاروق واقعی ذہین اور

باصلاحیت نوجوان ہیں اگر انہوں نے اکیس سال کی بالی عمر یا میں نوابزادہ اور عبدالقیوم جیسے منجھے ہوئے جہاں دیدہ سیاستدانوں کو بھی متاثر کیا ہے تو ان کی ذہانت میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے۔ مگر وہ شیخ عبداللہ سے زیادہ ذہین نہیں ہوں گے جو کشمیر کی آزادی حیثیت کے چکر میں مرتبے دم تک بھارتی غلامی سے نجات حاصل نہ کر سکے۔“

اس کے بعد کالم نگار نے لکھا ہے کہ ”چونکہ شبیر احمد شاہ اور سید علی گیلانی کا نفرس میں شریک نہ ہو سکے اس لیے یہ بات محل نظر آتی ہے کہ میر واعظ کس طرح شریک ہوئے؟“ حالانکہ خود سید علی گیلانی نے ان کی شرکت کو کشمیری عوام کی فتح قرار دیا۔ اس طرح محمد یاسین ملک کی رہائی اور پھر شبیر احمد شاہ کے حق میں استقبالی جلسوں کے انعقاد پر انگشت نمائی کر کے ان کو مشکوک اور مقنائزہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ اگر کل کلاں کو سید علی گیلانی اور شبیر احمد شاہ کسی بین الاقوامی فورم میں گئے اور بھارت نے ان کو اجازت دی تو وہ دونوں بھی ناقابل اعتبار تھے ہیں اور پھر اگر انہوں نے وہی باتیں کیں جو حریت کا نفرس کا مشترکہ موقوف ہے تو ان کو غدار لکھا جائے گا۔ اب اس مقام پر ہم مقبول بٹ شہید کے اس موقوف کی تائید کرنے پر مجبور بھی ہیں اور فخر بھی محسوس کر رہے ہیں جو انہوں نے چھٹی دہائی کے آخری دنوں اور ساتویں دہائی کے ابتداء میں واضح طور پر اختیار کیا تھا۔ آج تھیک 25 سال گزرنے کے بعد بھی ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں کہ مسئلہ کشمیر دراصل کشمیریوں کا اپنا مسئلہ ہے۔ بھارت اور پاکستان کا سرحدی تنازع نہیں اور کشمیری خون بھائے بغیر اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے جس سے ان کو آزادی حاصل ہو اور کوئی طاقت ان کو آزادی نہیں دل سکتی۔ شہید مقبول بٹ کی پالیسی سے اختلاف کرنے والے اور ان کے طریق کا روغیر حکیمانہ قرار دینے والے دانا بھی غور کریں کہ اب آئینہ ایام ان کے سامنے ہے اور خود اس پر بھی وہی الزامات اور تہمتیں عائد ہو رہی ہیں جن کے تیر مقبول بٹ شہید پر چلائے جا چکے ہیں۔ سب سے زیادہ ذمہ داری مقبول بٹ شہید کے سیاسی اور نظریاتی وارثوں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ تحریک آزادی کشمیر کو کاروبار نہ بنائیں۔ شہیدوں کے لہو کا سودا نہ کریں اور کسی کے آله کارنہ بنیں اور ان کے افکار و خیالات کو سخن نہ کریں اور محض اپنی صدارتوں کے لیے کشمیری قوم کے مستقبل کو تاریک نہ بنائیں۔ آج بھیت مجموعی ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو اداروں اور ملکوں کے چکر سے نکال کر اسے پوری

میراث نامہ میر احمد

(196)

•—————●————•
قوم کا مسئلہ بنائیں اور خود اپنے ذریعے اور اپنی آزاد نہ رائے سے پیش کریں۔ تب جا کر ہم 11 فروری
کے دن کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

(کشمیر نامہ برطانیہ کیم فروری 28 فروری 1995)





مقبول بٹ شہید.....یاد میں اور باتیں

میر آزاد بصیر (بن خراں میر پور)

ایک ادنیٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے راقم کو جناب مقبول بٹ شہید کے ساتھ آزادی کشمیر کے صول کے لیے اکثر و بیشتر بات چیت کا موقعہ میسر آتا رہا۔ اور راقم کو یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے جیا لے حریت پسند کے ساتھ زندگی کا مختصر سا عرصہ گزارا ہے۔ اس لیے ذیل میں دیئے گئے مضمون میں جناب بٹ صاحب کی مختلف اجتماعات کے موقعہ پر کی گئی تقریروں کے چند اقتباسات پر قلم کرنے کی جاریت کر رہا ہوں۔ جنہیں پڑھ کر کشمیری عوام حریت پسند محمد مقبول بٹ شہید کے اُس کردار کا خود اندازہ کر لیں گے۔ جو کہ انہوں نے اپنے مکحوم طلن کی آزادی و خود مختاری کے لیے بھارتی جیل (سنٹرل جیل) کی کال کوٹھڑی میں آٹھ برس پابند سلاسل رہنے کے بعد اپنی جان کا نذر رانہ پیش کر کے ادا کیا۔

دسمبر 1963ء میں درگاہ حضرت بل سری نگر سے موئے مبارک کی چوری کے واقعہ نے کشمیر کی پوری وادی میں ایک آگ بھڑکا دی۔ درگاہ حضرت بل کو کشمیر میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وادی کے مسلمان ہر جمعہ کو نماز پڑھنے اور نماز کے بعد موئے مبارک کا دیدار کرنے کے لیے جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو لوگوں کی تعداد ڈھائی تین لاکھ سے کسی بھی صورت کم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی حکومت پریشان تھی اور اس مرکز کو ختم کرنے کی اُسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد ایک گھناؤنی سازش تیار کی گئی اور اس طرح ایک بر قافی رات کو جب حضرت بل درگاہ کے متولی آرام فرما رہے تھے۔ موئے مبارک چوری کر لیا گیا۔ انھیں خیال تھا کہ مسلمان معمولی سے احتجاج کے بعد خاموش ہو جائیں گے اور جس موئے مبارک کی وجہ سے وہ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں جب وہی نہ رہا تو لوگ یہاں آنا بند کر دیں گے اور اس طرح حضرت بل کی مرکزی حیثیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔ مگر وہ سراسر ٹلٹلی پر تھے۔ مسلمان ہر چیز برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن اپنے مذہب میں مداخلت کی

صورت میں برواد است نہیں کر سکتا۔ صبح جب پتہ چلا کہ موئے مبارک چوری ہو گیا ہے۔ تو یہ خبر پوری وادی میں آنا فانا پھیل گئی۔ جس سے لوگوں میں ایک یہ جانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اور پوری قوم گھروں سے باہر نکل آئی اور زبردست احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حکومت کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس خبر سے جنگ بندی لائیں کے اس طرف بننے والے کشمیری بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ریاست جموں کشمیر میں بننے والے کشمیری مسلمانوں کے زبردست احتجاج کے نتیجہ میں موئے مبارک اپنی اصل جگہ پر واپس آگیا۔ لیکن اس کے باوجود کشمیری مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ جب تک شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جو حضرت بل او قاف کمیٹی کے صدر اور کشوڈین بھی رہ پکے تھے اسے دیکھ کر اصل موئے مبارک ہونے کا اعلان نہ کریں۔ احتجاج کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا۔ کشمیریوں نے اس کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ جب تک شیر کشمیر کو رہا نہیں کیا جاتا اُس وقت تک موئے مبارک کو سچا تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

چنانچہ بھارت کے وزیر اعظم نہر و کشمیر کی اس علگین صورت حال کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے فوراً شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کو رہا کر دیا جائے۔ شیخ صاحب نے رہا ہوتے ہی پورے کشمیر کا دورہ کیا اور بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہر و کو یہ احساس دلایا کہ بھارت، پاکستان اور کشمیریوں کی بہتری اسی میں ہے کہ مسئلہ کشمیر فوراً حل کیا جائے۔ ادھر پنڈت نہر و بھی بھانپ پکے تھے کہ کشمیریوں کو طاقت کے زور سے غلام نہیں رکھا جاسکتا۔ چنانچہ نہر و نے شیخ صاحب کو دہلی بلا کر مذاکرات کیے اور انہیں پاکستان جا کر صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے بھی بات چیت کرنے کی اجازت دے دی۔ شیر کشمیر پاکستان آئے تو مرزا افضل بیگ جو اُن کے دورے میں شامل تھے، نے صدر پاکستان سے ملاقات کی اور مذاکرات ہوئے فیصلہ یہ ہوا کہ دہلی میں پاک، بھارت سربراہوں اور کشمیری لیڈروں پر مشتمل ایک سہ فریقی کانفرنس بائی جائے۔ لیکن اس کانفرنس کے انعقاد سے قبل پنڈت نہر و کا انتقال ہو گیا۔ جس سے شیخ عبداللہ کو بے حد صدمہ پہنچا کیوں کہ نہر و کے بعد انہیں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آ رہا تھا۔ جو نہر و کی طرح عوام سے ہر بات منوانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ شیخ صاحب کو ملنے کے لیے کراچی سے امان اللہ، لاہور سے

عبدالمنان، میرپور سے عبدالخالق انصاری، صوفی محمد زمان اور میر عبدالرشید راولپنڈی پہنچے۔ میر عبدالمنان اور میر عبدالرشید نے شیخ صاحب سے ملاقات بھی کی۔ لیکن انصاری صاحب ملاقات نہ کر سکے کیوں کہ انھیں راولپنڈی پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد شیخ صاحب پاکستان کا دورہ مکمل کیے بغیر دہلی واپس چلے گئے۔

آزاد کشمیر و پاکستان میں چھوٹی چھوٹی سیاسی پارٹیاں جو آزادی کشمیر کے لیے اپنے اپنے پلیٹ فارم سے کام کر رہی تھیں۔ مثلاً میرپور میں عوامی کانفرنس، اینڈی پنڈش کشمیر مومنٹ جو پشاور میں کام کر رہی تھی۔ کراچی میں محاذ رائے شماری کے نام سے ایک تنظیم تھی۔ اس کے علاوہ انجمن نوجوانان کشمیر، کسان مزدور کانفرنس اور پیپلز پارٹی کانفرنس وغیرہ ان تمام پارٹیوں نے سری نگر میں موعے مبارک کی چوری کے واقعہ اور شیر کشمیر کے دورہ پاکستان کے بعد کے واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک ایسی جماعت کی ضرورت کو محسوس کیا جو مسئلہ کشمیر کو اس کے صحیح روپ میں پیش کرنے اور کشمیریوں پر کسی بیرونی فیصلے کو ٹھونے جانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کر سکے۔

چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لیے 14 پریل 1965ء کو سیالکوٹ کے مقام پر جموں و کشمیر محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کے نام سے باقاعدہ ایک سیاسی جماعت کا قیام عمل میں لا یا گیا۔ عہدیداران میں عبدالخالق انصاری صدر، غلام محمد لوں سینتر نائب صدر، امان اللہ خان جزل سیکرٹری، مجید احمد جائینٹ سیکرٹری، محمد مقبول بٹ شہید پبلیٹی سیکرٹری، جی۔ ایم۔ لوں فا نشنل سیکرٹری اور میر عبدالقیوم خازن منتخب ہوئے۔ یاد رہے کہ آزاد کشمیر و پاکستان میں محمد مقبول بٹ شہید کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس نئی جماعت (جموں کشمیر محاذ رائے شماری) میں شامل ہوئے۔ اس سے قبل وہ اینڈی پنڈش کشمیر مومنٹ کے ممبر تھے۔ جس کا تعلق مہاجرین جموں و کشمیر پشاور سے تھا۔ پریس سیکرٹری منتخب ہونے کے بعد انہوں نے اپنے عہدے کا حلف سیالکوٹ میں مقبوضہ کشمیر کی جموں سرحد پر خاکِ وطن ہاتھ میں لے کر یہ عہد کیا کہ وہ خطہ کشمیر کی آزادی کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دینے سے بھی دربغ نہیں کریں گے۔ 1966ء کے پہلے عشرہ میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری (برائے آزاد کشمیر و پاکستان) کے اندر تنظیم کو چار شعبوں میں تقسیم کر کے ایک گوریلا ونگ قائم کیا گیا۔ جس کا نام قومی محاذ آزادی رکھا۔

اس گوریا ونگ کو مندرجہ ذیل طریقہ سے فرائض سونپے گئے۔

۱..... اپریشل ونگ زیر سر پرستی مسجراً امان اللہ مرحوم

۲..... سیاسی و پلبینی ونگ زیر سر پرستی امان اللہ خان

۳..... فناں ونگ زیر سر پرستی میر عبد القیوم

۴..... کو آرڈینشن ونگ زیر سر پرستی محمد مقبول بٹ شہید

چنانچہ کو آرڈینشن کے انچارج کی حیثیت سے جناب مقبول بٹ شہید اپنے ساتھیوں سمیت

جون 1966ء میں ریاست جموں و کشمیر کو تقسیم کرنے والی مخصوص لائی کو عبور کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل

ہو گئے اور گوریلہ کارروائیاں شروع کر دیں اور اس طرح مقبوضہ کشمیر میں کئی اہم مقامات کو نقصان پہنچایا

اور بھارتی سامراج کے پھوٹوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ جس کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر کی حکومت بوکھلا گئی اور

یہ سونپنے پر مجبور ہوئی کہ ایسی کارروائیوں کے درپرده کیا مقاصد کا فرمایا ہے۔ ادھر مقبول بٹ شہید نے

کشمیری نوجوانوں کو گوریلہ ٹریننگ کی تربیت کا کام جاری رکھا۔ ستمبر 1966ء کے دوران ہی مقبوضہ کشمیر

میں بھارتی فوج کے ساتھ ان کا نکراو ہو گیا۔ اس طرح ان کا ایک ساتھی اور نگ زیب شہید ہو گیا جب

کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر سرحد عبور کرنے، ڈاکہ زنی، قتل اور پاکستانی ایجنت ہونے کے الزام میں

مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں جب وہ مرحلہ آیا جہاں عدالت ملزم سے سوال کرتی ہے کہ کیا تمھیں بھی

کچھ کہنا ہے تو حریت پسند مقبول بٹ شہید نے اپنے مخصوص انداز میں وہ چند الفاظ ادا کیے جن کی بازگشت

کشمیر کی تاریخ میں تاریامت ہوتی رہے گی۔

مقبول بٹ شہید نے عدالت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "مجھے اس عدالت سے صرف اتنا

ہی کہنا ہے کہ حکومت مجھ پر غلط قانون کے تحت مقدمہ چلا رہی ہے۔ بہر حال اس قانون کا عنوان بدل دیا

جائے تو میں استغاثہ کے لگائے ہوئے الزامات کو درست تسلیم کر لوں گا۔ میں اس قانون کے عنوان کو

خصوصی طور پر رد کرتا ہوں۔ مجھ پر بھارتی حکومت یہ الزام لگاتی ہے کہ میں دشمن کا ایجنت ہوں ایسا ہرگز

نہیں ہے میں کسی کا ایجنت نہیں ہوں۔ یہ ناممکن ہے کہ مقبول بٹ کسی کا ایجنت بن سکے۔ اس حکومت کو

چاہیے کہ مجھے اچھی طرح پہچان لے میں ہی تو دراصل اس کا دشمن ہوں۔ حقیقی اور ازالی دشمن۔ میں کشمیری

عوام کے لیے آزادی حاصل کرنے کے ارادے کا مظہر ہوں۔ پس میں اس عدالت کو مشورہ دیتا ہوں کہ مجھ پر مقدمہ چلانے کے لیے ایک نیا آرڈیننس جاری کیا جائے۔ جس کا عنوان ہو ”حقیقی دشمن کو سزا دینے کا آرڈیننس“ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس آرڈیننس کے تحت میں بخوبی اقرار کر لوں گا کہ میں بھارتی سامراج کا بدترین دشمن ہوں۔ بھارتی عدالت نے مقبول بٹ شہید کو پھانسی کی سزا سنائی مقبول بٹ شہید نے اسے ”شکریہ“ کہہ کر قبول کر لیا تاہم 1968ء میں وہ سنٹرل جیل سری نگر سے فرار ہو کر اور 16 روز پیدل سفر طے کر کے آزاد کشمیر میں داخل ہو گئے۔ ادھر مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے مقبول شہید کو زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے 10 ہزار کا انعام مقرر کر دیا تھا۔ لیکن مقبول بٹ کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ آزاد کشمیر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی انھیں پاکستانی فوج نے گرفتار کر کے بلیک فورٹ پہنچا دیا اور تحقیقات شروع کر دی۔ تاہم تحقیقات کے دوران مختلف اطراف سے اُن کی رہائی کے سلسلہ میں احتجاجی مظاہرے ہوئے اور قرارداد میں پاس کی گئیں۔ جس کے نتیجہ میں انھیں رہائی حاصل ہوئی۔ رہائی کے بعد مقبول بٹ شہید کا آزاد کشمیر و پاکستان میں مقیم کشمیریوں نے والہانہ استقبال کیا۔

نومبر 1969ء میں محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کے تیسرے سالانہ کونشن جو مظفر آباد میں منعقد ہوا میں مقبول بٹ شہید کو جموں و کشمیر محاذ رائے شماری کا مرکزی صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس تاریخی کونشن کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں جناب مقبول بٹ شہید نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”میری شہرت سے کچھ لوگوں کو خوف محسوس ہونے لگا ہے میں ان لوگوں پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مجھے صدارت اور وزارت نہیں چاہیے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہوا ہے کہ مجھے جماعت کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ حالانکہ میں اس سیاست کا قائل نہیں ہوں۔ میری سوچ ریاست کی مکمل آزادی ہے میں چاہتا ہوں کہ 84 ہزار مرلے میل پر پھیلی ہوئی یہ ریاست یہودی غاصبوں سے آزاد ہو اور یہاں کے بنے والے ایک ایسی خوبصورت اور مستحکم حکومت قائم کریں جسے غیر ہم سے چھین نہ سکے“۔ قائد حریت نے کہا کہ ”اس شہر میں جو کرسی صدارت ہے وہ چند لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ ایک آتا ہے دوسرا چلا جاتا ہے جب ان کی مرضی ہو تو یہاں کی کرسی پر بیٹھنے والے کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ میری جنگ ان خرابیوں کے خلاف ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ملک کی حکومت پوری قوم کی منتخب کردہ ہو۔ اتنا نے کا حق

صرف کشمیری عوام کو حاصل ہو۔ قائد حریت نے اُن لوگوں کو مناطب کرتے ہوئے کہا جوا خبرات میں بیان دے رہے تھے کہ محاذ کا مرکزی کونشن مظفر آباد میں نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ”وہ لوگ کان کھول کر سُن لیں کہ اب محاذ کا صدر مقبول بٹ منتخب ہوا ہے۔ مقبول بٹ ہر دو طریقوں سے بات کرنا جانتا ہے۔ اُسٹچ پر کھڑا ہو کر ہربات کا جواب دے سکتا ہوں۔ دوسرا طریقہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کوئا ہے وہ طریقہ وہی ہے جس کی بدولت میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرے اس طریقہ سے میرے وطن کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے بڑے بڑے برف پوش پہاڑ جنپیں میں عبور کر کے آیا ہوں اور دلائی کیمپ میں تحقیقات کے مرحلہ میں سرکاری پرزوں کے امتحانات پاس کیے ہیں۔ اگر کوئی سیاستدان میرا متحان لینا چاہے تو اس کے لیے میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ جناب مقبول شہید نے کہا کہ ”محاذ کی سابقہ سیاست اور موجودہ قیادت میں بہت فرق ہے۔ وہ سیاستدان تھے تقریروں اور قراردادوں پر یقین رکھتے تھے۔ میں ان باتوں پر ہرگز یقین نہیں رکھتا۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میرا ملک مسلح جدوجہد کے ذریعہ آزاد ہو گا۔ میں نے 1965ء میں مادرِ وطن کی سرحد کی مٹی ہاتھ میں لے کر وطن کی آزادی کی قسم کھائی تھی اور جہاد کا آغاز کیا تھا۔ اُس جدوجہد کے صلہ میں مجھے مقبوضہ کشمیر میں سزاۓ موت سنائی گئی۔ وہاں کی جیل سے فرار ہو کر جب میں یہاں پہنچا تو مجھے بلیک فورٹ میں پابندِ سلاسل کیا گیا۔ یہ سب باتیں میرے ساتھ وطن کے دونوں حصوں میں اس لیے روکھی جا رہی ہیں کہ میں نے وطن کی آزادی کے لیے ایک راستہ متعین کر لیا ہے۔ آزاد کشمیر کے موجودہ سیاستدانوں اور میرے درمیان یہ اختلاف ہے کہ وہ کھوکھلے نعروں اور نام نہاد ہتھنڈوں سے لاکھوں روپے سیاست کشمیر کے نام پر کئی سال سے ہڑپ کر رہے ہیں اور اس طرح اپنی دکانداری چکارہ ہے ہیں۔ اب انھیں خدشہ ہے کہ ان کی سیاسی دکان داری مسلح جدوجہد کے نام سے (جو لہر کشمیری نوجوانوں میں اُٹھی ہے) اس سے کہیں ختم نہ ہو جائے۔“ مقبول بٹ شہید نے کہا کہ ”میرے اور باقی سیاستدانوں میں ایک مسلمہ فرق یہ ہے کہ وہ لوگ آزاد کشمیر میں حکومت کرنا چاہتے ہیں اور میں ریاست جموں و کشمیر کی آزادی چاہتا ہوں۔“

صدر اُتی تقریر کے بعد محاذ کا دو روزہ کونشن اختتام پذیر ہوا۔ اس کے دوسرے روز را ولپنڈی کے مقامی ہوٹل میں جناب مقبول بٹ شہید نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس سے خطاب میں

ایک صحافی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ”میں اپنا خون دے کر ثابت کر دوں گا کہ ہم جس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں وہ کیا ہے۔ آزادی پسندوں کے سامنے بڑے بڑے پھاڑ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ مجھے اپنے آپ اور اپنے ساتھیوں پر مکمل بھروسہ ہے۔ میری قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہم ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ کشمیر کے متعلق بھارت سامراج کا دعویٰ تاریخ ہو جائے گا اور دنیا پر ثابت ہو جائے گا کہ کشمیر پر طاقت کے ذریعہ قبضہ برقرار رکھا جا رہا ہے۔“ اس موقعہ پر مقبول بٹ شہید نے دوسری جنگِ عظیم میں دشمنوں کے بھری بیڑے تباہ کرنے والے اُن جانباز جاپانی ہوابازوں کی مثال بھی پیش کی جو بہوں اور اسلحے سے لدے ہوئے طیاروں کو لے کر امریکی طیارہ بردار جہازوں سے نکلا جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ”ظالم اور ظلم کے امین کو بے نقاب کرنا ہمارا مشن ہے۔“ شہید ملت مقبول بٹ کے ان بے باکانہ، جرأت مندانہ خیالات سے صحافیوں پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک ایسا شخص بول رہا تھا۔ جس کا جذبہ صادق تھا اور جس نے اپنے ارفع مقاصد کے لیے سب کچھ نچاہو رکھ کر نہیں کیا۔

عہد کر رکھا تھا۔

محاذ رائے شماری کا صدر منتخب ہونے کے بعد شہید ملت میر پور کے دورہ پر تشریف لائے۔ اُن کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ میر پور میں انہوں نے جماعتی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے سنٹرل جیل سری نگر سے فرار ہو کر آزاد کشمیر میں داخل ہونے تک 16 روزہ پیادہ سفر کی رواداد بیان کی اور بتایا کہ ”یہ سفر میری زندگی کا تاریخی سفر تھا۔ اس دوران مجھے جن تجربات اور مشاہدات سے سابقہ پڑا۔ میں انھیں اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ تصور کرتا ہوں۔ جیل سے فرار کی تکمیل میں میری ذہنی کاؤشوں کے ساتھ ساتھ تائید ایزدی کا بھی بڑا خل تھا۔ اس سولہ روزہ سفر نے میرے اعتقاد اور ایمان کو جلانچھی۔ جس ولولہ خیز عقیدت اور محبت کے ساتھ میرے وطن کے مکوم عوام نے میرے مشن کی تکمیل میں مجھ سے تعاون کیا اور قدم قدم پر میری دستگیری کی اُس کے گھرے نقوش میں اپنے دل دماغ سے کبھی مٹا نہیں سکوں گا۔“

مقبول بٹ شہید نے کارکنوں کے سامنے اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ”میں کشمیریوں کے حق خود ارادیت پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا نظریہ ہے کہ ہم کشمیریوں کو اپنے مادر وطن کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اور ناقابل تصحیر حق حاصل ہے۔ دوسرے الفاظ میں میں سمجھتا ہوں کہ کشمیریوں کے

سامنے اپنی ریاست کے سیاسی مستقبل کے لیے تمام راستے کھلے ہونے چاہیں۔ کچھ بھی ہو جائے میں اپنے موقف سے ایک انفع بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرا ایمان ہے کہ ریاست جموں کشمیر ناقابل تقسیم وحدت ہے تھی وجہ ہے کہ میں حد مدار کہ جنگ کے تقدس کو ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ اسی بناء پر گلگت و بلستان کو ریاست جموں کشمیر کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ میں مادر وطن کی تقسیم کو کسی صورت میں برداشت نہیں کروں گا کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے کسی بہانے سے بھی اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ ہمیں وطن عزیز کے کسی حصہ سے محروم کر دیا جائے۔ میں ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو ریاست جموں کشمیر کے لاکھوں ننانوں کے حق خود ارادیت کے مسئلہ کے برعکس علاقائی تنازعہ قرار دینے والوں کی پر زور مخالفت کرتا رہوں گا۔ میں اپنے آخری سانس تک ”کشمیر کشمیریوں کا ہے، کافر ہ حق بلند کرتا رہوں گا“۔

”میں اقوامِ متحده کی کسی ایسی قرارداد کو تسلیم نہیں کرتا جو اس حق کی نفی کرتی ہو۔ میری ذاتی رائے کے مطابق کشمیریوں کو اپنی تحریک مزاحمت کو کامیاب بنانے کے لیے پاکستانی عوام اور دنیا کی دیگر آزادی پسند اقوام کی حمایت و ہمدردی کی ضرورت ہے۔“ شہید کشمیر نے کہا کہ ”ان جیالے کشمیری سپوتوں کے لیے جو آزادی وطن کے لیے اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرتے ہوئے جدو جہد کرنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں ان کی صرف عزت و احترام ہی نہیں بلکہ میں انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے سلام پیش کرتا ہوں،“ انہوں نے کہا کہ ”حق خود ارادیت سے میری وابستگی کسی اور شخص کی اس اصول سے وابستگی کے مر ہون منت نہیں ہے۔ اگر میں اس اصول کے حصول کے لیے یک و تنہابھی رہ گیا تب بھی میرے موقف میں تبدیلی نہیں آئے گی۔“

دوسرے روز نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جانب سے ایک مقامی ہوٹل میں دیئے گئے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے شہید ملت مقبول بٹ نے کہا کہ ”مجھے غفار انقلابی، شوکت راجہ، نمیر نیازی آپ جیسے شعلہ بیان اور محض تقریروں کے سہارے کشمیر کی آزادی چاہنے والے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ مجھے ایسے انقلابی جوانوں کی ضرورت ہے جو وادی جنت کی آزادی کے لیے ان بڑے بڑے بلند و بالا پہاڑوں کو عبور کر کے مقبوضہ کشمیر میں مسلح جدو جہد کر سکتا ہو۔ مجھے خون دینے والے مجنوں چاہئیں۔ چوری کھانے والے مجنوں آزاد کشمیر میں پہلے ہی موجود ہیں،“ انہوں نے کہا



کہ ”گوریلہ جنگ اتنا آسان کام نہیں۔ اس مقصد کی راہ میں دوست بھی شمن بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ میں ان آزمائشوں سے گزر کر آپ کے پاس پہنچا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ سرحد کے اُس پار مجھے پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام میں گرفتار کر کے سزا نے موت سنائی گئی تھی۔ میری ذاتی اور دوستوں کی کوششوں سے میں جیل سے بھاگ کر یہاں پہنچا تو یہاں کے حکمرانوں نے ہندوستانی ایجنت قرار دے کر بلیک فورٹ میں پوچھ گھٹھ شروع کر دی۔ اس کڑی ستم ظریفی سے گزرنے کے بعد آپ کے اس اجتماع میں پہنچا ہوں۔ آپ نوجوانوں نے مجھے جو عزت بخشی ہے اُس کا میں شکر گزار ہوں اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی لیکن ہو چکا ہے کہ میرے وطن کی نوجوان نسل اس راستہ پر میرے ساتھ ضرور چلے گی۔ جس راستہ کو میں نے وطن کی آزادی کے لیے منتخب کیا ہے۔“

اسی روز محاذ رائے شماری بن خرماں برائی کی طرف سے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں مقامی راہنماء محمد دین بٹ، صوفی عبدالعزیز، محمد رفیق انقلابی، چودھری گلاب دین (مرحوم) عارف کمپلوی اور راقم الحروف (میر آزاد بصیر) نے خطاب کیا۔ جناب مقبول بٹ شہید کے دل میں جہاں وطن کی آزادی کی تڑپ تھی۔ وہاں وطن کے باسیوں کے لیے بنیادی ضروریات زندگی اور اقتصادی مسائل کے حل کے بارے میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے جس کا اندازہ اس تقریر سے ہوا۔

انھوں نے پارٹی کی سٹی میر پور برائی اور صوفی محمد زمان (مرحوم و مغفور) کو خصوصی ہدایات دیں اور کہا کہ شہر کے مختلف سکیشوروں کے لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ خصوصی توجہ دیں تاکہ عوام کو درپیش مشکلات سے نجات مل سکے۔

شہد وطن مقبول بٹ ضلع میر پور کے مختلف شہروں و قبصوں، بھبر، کوٹلی، ڈڈیال، چڑھوئی، چترپور میں مختلف اجتماعات سے خطاب کرنے کے بعد اپنادو ہفتواں کا دورہ مکمل کر کے واپس راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ جہاں انھوں نے پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین جو مختلف شہروں میں آباد ہیں، کی جانب سے دی گئی دعتوں میں شرکت فرمائی آزادی کشمیر کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات و نصب العین کا پر چار کیا۔ اور کشمیری عوام کے دلوں میں آزادی کشمیر کے جذبہ کو دلوں تازہ بخشنا۔

فروری 1970ء میں جموں کشمیر اسٹیٹ پیپلز کونٹری سری نگر کی استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے تمام کشمیری جماعتوں کے سیاسی راہنماؤں کو دعوت نامے ملے۔ اس طرح محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر پاکستان کے تمام عہدیداران کو بھی دعوت نامے موصول ہوئے جن میں ریاست کے سیاسی حل کے بارہ میں واضح اور جامع تجوادیز طلب کی گئی تھیں۔ باہمی مشورہ کے بعد طے پایا کہ ارکین محاڑ کی جانب سے فرد افراد اجواب ارسال کرنے کی بجائے یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ ارکین مجلس عاملہ محاذ رائے شماری کے تمام ممبران جنہیں دعوت نامے موصول ہوئے ہیں ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں طے کر کے مشترک طور پر اپنا نقطہ نظر سٹیٹ پیپلز کونٹری سری نگر کو بھیجا جائے۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے مقبول بٹ شہید نے ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کے چیئرمین میر ہدایت اللہ بنائے گئے جب کہ کمیٹی کے ارکین کے لیے عبدالخالق النصاری، مسٹر جی۔ ایم۔ لوں، امام اللہ خان اور میر عبد المنان کا تقرر ہوا۔ ارکین نے اپنے خیالات تحریری طور پر کمیٹی کو پیش کیے۔ چنانچہ 20-21 مارچ 1970ء کو ریکس ہوٹل روڈ پنڈی میں کمیٹی کے باقاعدہ اجلاس ہوئے جن میں ورکنگ کمیٹی کے غور کے لیے ایک ورکنگ پیپرڈ ریز ولیشن کی صورت میں تیار کر کے سٹیٹ پیپلز کونٹری سری نگر کو بھیجا گیا۔

محمد مقبول بٹ شہید نے محاذ رائے شماری کے صدر کی حیثیت سے 23 مارچ 1970ء مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا جو دو روز جاری رہا۔ اس اجلاس میں فقراردادیں پاس کی گئیں۔ یاد رہے کہ ذیل میں یہ قراردادیں اس لیے شامل کی گئیں ہیں کہ مقبول شہید نے بحیثیت محاذ کے صدر مجلس عاملہ کا پہلا اور آخری اجلاس طلب کر کے ان قراردادوں میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ جموں و کشمیر کے اس حصہ جو پاکستان کے زیر تسلط ہے میں بھی انقلابی قسم کی تبدیلیاں چاہتے تھے۔

قرارداد نمبر ۱:

اجلاس آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کا نظام حکومت چلانے کے لیے ایک عارضی دستور ساز اسٹبلی کے قیام کے مطالبہ کا اعادہ کرتا ہے جو دستور سازی کے ساتھ ساتھ قانون ساز اسٹبلی کے فرائض بھی سرانجام دے۔ اسٹبلی کے ممبران آزاد جموں و کشمیر گلگت و بلتستان بشمول ہنزہ، ہنگرو پولیٹکل اضلاع کے علاوہ مهاجرین ریاست جموں و کشمیر مقیم پاکستان کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو، ان

نمائندوں کو بالغ رائے دہندگی کے اصول پر چنا جائے۔ ریاست کا ہر وہ باشندہ جو کم از کم اٹھارہ برس کا ہو، اُس کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ اسیلیٰ کو بجٹ سازی کے مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ عبوری صدر کو دستور ساز اسیلیٰ منتخب کرے۔ دستور کی تکمیل کے بعد قانون ساز اسیلیٰ آئین کے مطابق نئی حکومت بنائے جو اسیلیٰ کے سامنے جواب دہ ہو۔ آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر کا تعلق پاکستان کے ساتھ سفارتی سطح پر ہوا اور یہ حکومت ریاست کی آزادی، اتحاد اور سالمیت کے تحفظ کے لیے تحریک حریت کو تقویت پہنچائے۔ کشمیری عوام کو ان کے حق خودداریت کے حصول کے لیے ہر نوع کی جدوجہد میں مدد دے۔ نیز بین الاقوامی سطح پر مسئلہ کشمیر کو انسانی آزادی کے مسئلہ کے طور پر پیش کر کے اخلاقی و سیاسی اور مالی و مادی امداد حاصل کرے۔

قرارداد نمبر ۲:

اجلاس حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ محاذ رائے شماری کے سرکاری ترجمان ہفت روزہ "محاذ" اردو۔ فرنٹ (انگریزی) کے اجرا کے لیے جس کی درخواست دو سال قبل دی گئی تھی کا ذیکر یشن جاری کیا جائے۔ تا کہ محاذ رائے شماری اپنے نظریات کی اشاعت کر سکے۔

قرارداد نمبر ۳:

اجلاس آزاد کشمیر کے عوام کے لیے بنیادی انسانی حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کے آغاز کا اعادہ کرتا ہے۔ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام کو پریس اور پلیٹ فارم کی مکمل آزادی دی جائے۔ آزاد کشمیر سے ایم جنی پاور ایکٹ سول ڈینس ایکٹ، پبلک سٹیچ ایکٹ اور دیگر کالے قوانین ختم کیے جائیں۔ اس علاقہ میں بنیادی انسانی حقوق بحال کیے جائیں۔ گلگت و بلستان کو برداشت آزاد کشمیر حکومت میں نمائندگی دی جائے۔ اور فرینٹر کرائمز ریگولیشنز و پلیٹیکل نظام ختم کر کے دہل کے لوگوں کو آزاد کشمیر میں قائم ہونے والی جمہوری حکومت میں شریک کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۴:

اجلاس میں کہا گیا کہ آئین سازی کا حق دنیا کے مسلمہ اصولوں کے تحت عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اجلاس ایسے کسی آئین کو جسے دستور ساز اسیلیٰ نہیں بنائے گی، کو

قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

قرارداد نمبر ۵:

اجلاس موجودہ عارضی حکومت کو نہ صرف غیر نمائندہ اور غیر جمہوری سمجھتا ہے بلکہ موجودہ جانبدار حکومت کے ہوتے ہوئے آزاد کشمیر میں غیر جانبدارانہ ماحول میں انتخابات کے اعلان کو فریب سمجھتا ہے۔ آزاد کشمیر میں غیر جانبدارانہ ماحول میں انتخابات کرانے کے لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آزاد کشمیر کی عدالت عالیہ کے کسی فاضل بحث کو انتخابات کرانے کے لیے فگران بنایا جائے۔ سٹیٹ کونسل اور موجودہ وزارت کو توڑ دیا جائے۔ انتخابات کے لیے آزاد کشمیر کی عدالیہ اور انتظامیہ میں سے کسی فرد کو الیکن کمشنز مقرر کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۶:

اجلاس آزاد کشمیر میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ آزاد کشمیر میں صنعتوں کا قائم عمل میں لا یا جائے تاکہ بے روزگاروں کو روزگار میسر آ سکے۔ نیز آزاد کشمیر کے جنگلات کا تحفظ کیا جائے۔ آزاد کشمیر کے عوام کے کمائے ہوئے کشیر زر مبادلہ کو آزاد کشمیر کی اقتصادی حالت کو سنوارنے پر خرچ کیا جائے امپورٹ لائیسنسوں کو بطور سیاسی رشوت دینا بند کیا جائے۔

قرارداد نمبر ۷:

اجلاس اس امر پر تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ آزاد کشمیر میں حالیہ انتخابات کے سلسلہ میں جو اعلان ہوا ہے اس میں مہاجرین جموں و کشمیر مقیم پاکستان کے دوٹ دینے کے طریقہ کار کا تفصیل پیش کیا گیا اس لیے اجلاس کا مطالبہ ہے کہ مہاجرین جموں و کشمیر مقیم پاکستان کے لیے آزاد کشمیر کے انتخابات میں دوٹ دینے کا حق تسلیم کیا جائے اور پاکستان میں کشمیری مہاجرین کی فہرستیں تیار کر کے وہیں انتخابی حلے بنائے جائیں تاکہ مہاجرین اپنے نمائندوں کو منتخب کر سکیں۔ آزاد کشمیر اسمبلی میں گلگت و بلستان اور مہاجرین مقیم پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

قرارداد نمبر ۸:

اجلاس "محاذ" پلندری شاخ کے صدر راجہ ولایت خان کی وفات پر گھرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور مرحوم کے پسمندگان کے لیے صبر و استقامت کی دعا کرتا ہے۔

قرارداد نمبر ۹:

اجلاس دنیا بھر کی تحریک آزادی کی حمایت کرتا ہے کیوں کہ بیرونی سلطاط سے آزادی ہر قوم کا بنیادی حق ہے۔

15 اگست 1970ء کو ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہوا جس میں ایک 1970ء کو مسترد کر دیا گیا۔ اس طرح آزاد کشمیر کی عوام کو باور کرنے کے لیے جلسہ جلوس کا پروگرام بنایا گیا اور نئے ایک 1970ء کے ذریعے جموں کشمیر کے عوام کے سینوں کو کانٹے والے حد تارکہ جنگ کو مستقل کرنے کی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے پورے آزاد کشمیر اور گلگت و بلستان کا دورہ کرنے کا پروگرام وضع کیا گیا۔ اس سلسلہ میں 13 ستمبر 1970ء کو ضلع میرپور سے ایک 1970ء کے خلاف اور ایکشن کے بایکاٹ کی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ میرپور شہر میں ایک عظیم الشان ماتمی جلوس جس میں لا تعداد سیاہ علم لہرائی ہے تھے، نکالا گیا اور "آمریت مردہ باد" "میہنی خان مردہ باد" "ایک 1970ء نام منظور نام منظور" کے نعرے لگائے گئے۔ جلوس کا اختتام ایک عظیم جلسہ عام پر ہوا جس میں مرکزی، ضلعی اور مقامی عہدیداران و کارکنان نے زبردست تقریروں کے ذریعے مسئلہ کشمیر کی اہمیت، جمہوری اداروں کا قیام، صدر آزاد کشمیر کی حیثیت، اسیبلی کے اختیارات، وزارت امور کشمیر کی کشمیر ڈمن کا رروائیوں اور آزاد کشمیر میں ریشہ دو ایوں کے ذریعے بے چینی، گلگت و بلستان میں ظالمانہ قوانین، ایف سی آر اور ایجنٹیں نظام کے خاتمہ، گلگت و بلستان کے عوام کو بالغ رائے دہی کا حق لوٹانے اور آزاد کشمیر کی اسیبلی میں آہادی کے تناسب سے نشیں دینے اور دوسرے مطالبات پر روشنی ڈالی گئی۔ جلسہ عام میں قرارداد کے ذریعہ حکومت پاکستان وزارت امور کشمیر اور دیگر متعلقین سے مطالبہ کیا اور تاریخی گئے اور کشمیری عوام کے مطالبات پر توجہ دینے کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا گیا۔ جناب مقبول بٹ شہید نے درجنگ کیمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کر کے ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دی۔

اجلاس کے ممبران مسٹر عبدالمنان، مسٹر عبدالخالق انصاری اور مسٹر امان اللہ تھے۔ اس کمیٹی کو گلگت و بلستان کے عوام کو سیاسی حقوق دلانے اور ایکٹ 1970ء کے خلاف تحریک چلانے کے سلسلہ میں ذمہ دار یاں سونپی گئیں اور تمام ممبران جزل کو نسل کو واضح ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ اپنے اپنے ضلع میں واپس پہنچ کر ایکٹ 1970ء کے خلاف ایکشن بائیکاٹ مہم کو آخری دن تک جاری رکھنے کے لیے بھر پور جدوجہد کریں۔

ایکشن کمیٹی کے پروگرام کے مطابق مظفر آباد، راولکوٹ، راولپنڈی، میرپور، کوٹلی، سیالکوٹ اور ایبٹ آباد کے مقامات پر پلک جلسے ہوئے۔ ایبٹ آباد میں کی جانے والی ایک تقریر میں بیکھی خان کی آمریت پر شدید نقطہ چینی کے صلہ میں مسٹر عبدالخالق انصاری کو گرفتار کر لیا گیا۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی تقاریر میں آزاد کشمیر، گلگت و بلستان میں جمہوریت کا قاتل بیکھی خان کو قرار دیا۔ چنانچہ گلگت جانے کا پروگرام متوجی ہو گیا۔

28 نومبر 1970ء کو گلگت جانے کا دوبارہ اعلان کیا گیا۔ ایکشن کمیٹی کے اراکین قائدِ حریت مقبول بٹ شہید کی قیادت میں گلگت پہنچے وہاں مسٹر امان اللہ نے لاڈ پسیکر کے ذریعہ جلسہ عام کرنے کا اعلان کیا۔ اس پر گلگت ایجنسی کے احکام نے دفعہ 144 کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ اس طرح اس تحریک کو ناکام بنانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔ مسٹر امان اللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ قائدِ حریت مقبول بٹ، میر عبدالمنان، غلام مصطفیٰ علوی اور جی ایم میر کو ایک گاڑی میں بٹھا کر گلگت ایجنسی سے باہر دیران علاقہ میں چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح محاذ کے لیڈر دوسرا روز واپس راولپنڈی پہنچے۔

قائدِ حریت مقبول شہید نے ایک پریس کانفرنس کے ذریعہ گلگت و بلستان کے دورہ میں درپیش تمام حالات و واقعات سے صحافیوں کو تفصیل آگاہ کیا۔ انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ گلگت بلستان ریاست جموں کشمیر کا اُسی طرح حصہ ہیں جس طرح آزاد کشمیر حصہ ہے۔ اس کے باوجود وہاں میں جسے وجلوں کے پروگرام نہیں کرنے دیئے گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ گلگت و بلستان سے ایجنسی نظام اور کالے قوانین ختم کر کے وہاں کی عوام کو قومی وحدت میں شامل کر کے بالغ رائے دہی کے ذریعے انتخابات میں نمائندگی دی جائے۔

30 جنوری 1971ء کو بھارتی طیارہ گزگا اغوا کر کے لاہور ایئر پورٹ پر لا یا گیا۔ طیارے کے اغوا کا مقصد اخباری ریکارڈ میں موجود ہے تاہم مختصر اس کے محل وقوع کو جناب مقبول بٹ شہید کے کردار کے ارد گرد رکھنے کی سعی کروں گا۔ طیارہ کے اغوا کے دوسرے روز راتم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ لاہور ایئر پورٹ پر پہنچا تو وہاں پہلے ہی لائٹی چارج ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں لبریشن لیگ کے صدر مسٹر کے اتنے خورشید کے بازو پر چوت آئی تھی۔ اسی روز مقبول بٹ شہید نے لاہور میں ایک پر جموم پریس کانفرنس میں طیارہ کے اغوا کو آزادی کشمیر کے لیے ایک اہم اقدام قرار دیتے ہوئے دنیا کو باور کرایا کہ ریاست جموں کشمیر پر بھارت سامراج کا قبضہ سراسر غاصبانہ و جابرانہ ہے چونکہ ریاست ایک متنازعہ علاقہ ہے اس لیے بھارتی حکومت ریاست سے اپنی تمام فوج کو باہر نکال لے اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرے۔ نیز بھارتی مقبوضہ کشمیر میں فرنٹ کے تمام گرفتار شدگان کو رہا کیا جائے۔

لیکن بھارتی حکومت نے ان مطالبات پر ہمدردانہ غور کرنے کی بجائے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اور طیارہ کے اغوا کا بہانہ بنایا کہ مشرقی پاکستان کی فضائی مک کی رسید کو بند کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔ ادھر کشمیری حریت پسندوں کے چوتھے روز تک اپنے مطالبات کی پذیرائی نہ ہونے کی صورت میں طیارہ جلا دیا۔ دونوں حریت پسند ہائی جیکر بھی شدید زخمی ہوئے۔ انھیں ہسپتال داخل کرادیا گیا۔ صحت یا بی کے چند روز بعد حریت پسند اول پنڈی روانہ ہو گئے۔ روپنڈی پہنچنے کے بعد محاذ رائے شماری کے مرکزی دفتر میں راتم کی ملاقات جناب مقبول بٹ شہید، ڈاکٹر عبدالباسط ایڈ ووکیٹ اور دونوں حریت پسندوں ہاشم اور اشرف قریشی کے ساتھ ہوئی۔ اس کے چوتھے روز یہ قافلہ آزاد کشمیر کے دورہ کے سلسلہ میں میر پور روانہ ہوا۔ منگلا پل پر اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ انھیں قائدِ حریت مقبول بٹ کی قیادت میں محلی جیپ میں جلوس کی صورت میں میر پور لا یا گیا۔ جب جلوس شہر کی حدود میں داخل ہوا تو لوگوں نے حریت پسندوں کے سروں پر پھولوں کی پتیاں نچھاوار کیں۔ جلوس جب پرانیاں ہیاں پہنچا تو وہاں راجہ اکبر مر جوم کی قبر پر عبدالحق انصاری نے دعائے خیر پڑھی۔

ماحقہ سڑک کو اکبر مر جوم کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس طرح یہ جلوس شہر کی مختلف شاہراہوں سے ہوتا ہوا جلسہ گاہ ناگی پہنچا۔ جلسہ سے جماعت کے مرکزی اور مقامی راہنماؤں نے

خطاب کیا۔ جناب مقبول بٹ نے اس تاریخی اجتماعِ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میرے ساتھیوں نے بھارتی طیارہ گنگا اغوا کرنے کے بعد اُسے جادا یا ہے۔ ہندوستان کا یہ طیارہ اغوا کر کے ہم نے اقوامِ عالم پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کا یہ دعویٰ جھوٹا اور لغو ہے کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ ریاست جموں کشمیر ایک الگ ملک ہے۔ یہ ہندوستان یا پاکستان کا حصہ نہیں ہے۔ ہماری تحریک کا اول مقصد یہی ہے کہ دنیا کو بتا دو کہ مسئلہ کشمیر 80 لاکھ کشمیریوں کا مسئلہ ہے۔ قائدِ حریت نے کہا کہ آزاد کشمیر کے کچھ سیاستدانوں نے میرے ساتھیوں کو خریدنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان پر واضح کر دینا چاہتا ہوں محب وطن تحریکوں کو دولت کی چمک سے خریدا نہیں جاسکتا اور نہ ہی کارکوٹھیوں کا لائق دے کر حریت پسندوں کو بہکایا یا حراساں کیا جاسکتا ہے۔ وہ لوگ اگر آزادی کشمیر کے لیے مغلص ہیں تو ہمارے ساتھ آئیں، ہم ان کا خیر مقدم کریں گے۔

اس کے بعد دوسرے روز یہ قافلہ ڈیال کے لیے روانہ ہوا۔ قائدِ حریت مقبول بٹ، ڈاکٹر فاروق حیدر، اور دونوں حریت پسندوں کو پہلے کی طرح محلی جیپ میں سوار کیا گیا۔ قافلہ جب کا کڑہ ٹاؤن پہنچا تو ہزاروں افراد نے انھیں روک کر زبردست نعروں کی گونج کے ساتھ استقبال کیا۔ قافلہ جب اکال گڑھ کے مقام پر پہنچا تو وہاں آزاد مسلم کانفرنس کے مرکزی راہنماء میر احمد بصیر نے استقبال کیا اور دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ ہم جس جگہ کھڑے ہو کر اپنے حریت پسندوں کا استقبال کر رہے ہیں یہ جگہ راج محمد شہید کی یادگار کے نام سے منسوب ہے۔ راج محمد شہید نے اپنا ہودے کر آزادی کی جوشی روشن کی تھی۔ اُس کی بدولت آج یہ علاقہ آزاد ہے۔ اس تقریر کے جواب میں شہید ملت مقبول بٹ نے کہا کہ میرے ان دونوں جوان ساتھیوں نے ہندوستان کا گنگا طیارہ اغوا کر کے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ جنگ ابھی جاری ہے جو ہمارے بزرگوں نے 1936ء میں ریاست جموں کشمیر کی آزادی کے لیے شروع کی تھی۔ راج محمد شہید کی طرح دوسرے کئی شہیدوں نے جن مقاصد کے لیے وطن کا یہ حصہ آزاد کرایا تھا۔ ان کامشناں ابھی پورا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ کشمیری راہنماء اپنے مقصد کو بھول کر صرف سیاسی جنگ کا تمثالتاگائے پیشے ہیں۔ قائدِ حریت کے مختصر خطاب کے بعد قافلہ یہاں سے روانہ ہو کر چکسواری کے مقام پر بھی تھوڑی دیر رکا۔ جہاں پر کرمداد

چودھری مرحوم نے قافلہ کا استقبال کیا۔ علاقہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ہاشم قریشی حریت پسند نے کہا کہ حکومت آزاد کشمیر ہمارے خلاف غلط قسم کے بیانات دے کر حالات کو خراب کر رہی ہے۔ پاکستان کی فوجی جنたے میں کہا کہ اس عظیم کارنامہ کو غلط رنگ دینا چاہتی ہے۔ ہاشم قریشی نے بلند آواز میں کہا کہ لوگوں کو اس طبقہ کے سپرد کر کے وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد کے لیے یہ رشتہ داروں بہن بھائیوں اور ماں باپ کو خدا کے سپرد کر کے وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد کے لیے یہ کام کیا ہے۔ تمام برادری کو بھارتی حکومت کے حوالے کر کے اس نیک مشن کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔ خدا جانے اب بھارتی حکومت ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گی۔

اس کے بعد قافلہ یہاں سے ڈیال کے لیے روانہ ہوا۔ قافلہ دریائے پونچھ کے مشرق کنارے پر پہنچا تو کشتی پر سوار ہو کر دریا عبور کیا تو وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور فضامیں فائرنگ کی بوجھاڑ سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ جلوس پیدا ہتھیں میل کا سفر طے کر کے ڈیال جلسہ گاہ تک پہنچا۔ وہاں پر مقتندر مقامی راہنماؤں نے خطاب کیا۔ جناب مقبول بٹ شہید نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے ساتھیوں کے عظیم کارنامہ کو دانستہ طور پر ایک سوچی سمجھی سیکیم کے تحت غلط رنگ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کی فوجی جنたا میں کہا کہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے والی ہے کیوں کہ پاکستان کے اخبارات میں دن بدن مختلف قسم کے بیانات شائع ہو رہے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس عظیم کارنامہ کو غلط رنگ دینے کے لیے ایک منصوبہ بنایا گیا ہے۔ قائد حریت نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ انقلابی لوگوں کا ہمیشہ راستہ روکنے کی سازشیں کی گئی ہیں۔ مگر میں اس راستہ کو انبویاء کرام کا راستہ جان کر اپنائے بیٹھا ہوں۔ میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں۔ آزاد کشمیر کی سابق نام نہاد حکومت دلائی کمپ میں مجھے رکھ کر میرے امتحان لے چکی ہے اور اگر موجودہ حکومت کی تجویز کے مطابق میرے امتحان کے پرچے ابھی باقی ہیں تو میں اور میرے ساتھی اُنھیں حل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہمارے بڑے بڑے استقبالیہ جاؤں کو دیکھ کر آزاد کشمیر میں عبدالقیوم خان کی حکومت اور ان کے حواری بوکھلا گئے ہیں۔

اسی لیے پاکستان کے بزرگ اقتدار سامراجی نولہ سے مل کر ہمارے ساتھ ایک نیا کھیل کھیلا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے ساتھی اس کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ دعویٰ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر موڑ پر حق و انصاف کا ساتھ دیا ہے اور ظلم و استھصال کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔ میں نے 1965ء میں ریاست کی سیاست میں آنے کے بعد جان بوجھ کر اپنے لیے یہ راستہ معین کیا تھا۔ جس پر چل کر ہم نے پہلی بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ میں اس راستہ پر چنان انقلابی لوگوں کا شیوه سمجھتا ہوں، ”اختتم جلسہ کے بعد تمام کشمیری لیڈر ان بشمول مقبول بٹ شہید میر پور پہنچے۔ دوسرے روز حکومت پاکستان نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کر کے شہید ملت مقبول بٹ، میر عبدالمنان، میر عبدالقیوم، جی۔ ایم۔ لوں، ہاشم قریشی، اشرف قریشی اور ڈاکٹر فاروق حیدر کے علاوہ پاکستان میں مقیم کشمیری مہاجرین اور محاذ رائے شماری کے دیگر راہنماؤں اور سیکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد مقبول بٹ شہید، میر عبدالمنان، میر عبدالقیوم، جی۔ ایم۔ لوں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے علاوہ باقی تمام لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ گرفتارشدگان کو طیارہ کے اغواء کے جرم میں ملوث کر کے لا انتہاء تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس طرح پندرہ جولائی 1971ء کو نور العارفین کمیشن نے حکومت کو رپورٹ دی جس میں کہا گیا کہ اس مقدمہ کی ساعت عام قوانین کے تحت عام عدالت میں ہونی ممکن نہیں ہے اس لیے مارشل لاء کے ضابطے 7. 16.12.9. کے تحت مقدمہ چلانے کے علاوہ خصوصی قانون بنایا جائے جس کی روح سے قانون شہادت اور ضابطہ فوجداری کی بعض دفعات کو اس مقدمہ پر ناقابل اطلاق قرار دیا جائے تاکہ بھارتی اخبارات کے تراشے وغیرہ شہادت میں پیش کیے جاسکیں۔ اور پولیس کے حاصل کیے ہوئے بیانات کو جائز اور قانونی تصور کیا جائے۔

8 نومبر 1971ء کو بھی خان نے کمیشن کی تجویز کے مطابق صدارتی حکم نمبر 13 کے تحت خاص عدالت کا قیام عمل میں لایا اور اس حکم کے تحت ملزیں کو ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کے تحت کی گئی تعزیرات سے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح 4 دسمبر 1971ء کو پولیس نے خصوصی عدالت میں چالان پیش کیا۔ 20 دسمبر کو حریت پسندوں کے خلاف مقدمہ کا آغاز را لوپنڈی میں ہوا۔ اسی روز بھی خان کو صدارت سے سکدوش کر کے نظر بند کر دیا۔ 10 جنوری 1972ء کو لاہور میں مقدمہ کی باقاعدہ

ہم اعترض شروع ہوئی۔ یہ وہی تاریخ تھی جب چھ سال قبل 10 جنوری 1966ء کو سابق صدر ایوب خان نے پشاور میں بھارت کے ساتھ معاہدہ امن پر دستخط کیے تھے۔ چنانچہ یہ تاریخ یوم تاشقند سے موسم ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں بھی قومی محاذ آزادی کے حریت پسندوں پر 10 جنوری 1972ء کو ہی مقدمہ کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ وہاں پر انعام تھا کہ یہ پاکستانی ایجنت ہیں اور یہاں انھی مجاہدین کشمیر پر بھارتی ایجنت ہونے کے الزام میں مقدمہ چلا یا جاری تھا۔ مقدمہ کی کارروائی 11 ماہ جاری رہنے کے بعد 8 دسمبر 1972ء کو ختم ہوئی۔ 8 دسمبر وہ خصوصی دن ہے جب 4 سال قبل 1968ء میں اسی روز مقبول بٹ شہید سری فخر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

مضمون کو مختصر کرنے کے لیے رقم گزگا کیس کی تمام رواداد یہاں بیان نہیں کرے گا جو نکلہ اس کیس کی تمام تر سچی کہانی ریکارڈ میں موجود ہے تاہم مختصر ایہ کہ چھ ملزمان میں سے مساوی ہاشم قریشی باقی تمام کو حکومت پاکستان کی طرف سے مقرر کردہ تحقیقاتی کمیشن (نور العارفین) نے محب وطن قرار دے کر بری کر دیا۔ اور ہاشم قریشی کو غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کا مجرم گردانے ہوئے 14 سال قید کی سزا سنائی۔ رہائی کے بعد ان محب وطن کشمیری حریت پسندوں کا پاکستان بھر میں ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا۔ حریت پسند رہائی کے بعد جب پہلی مرتبہ میر پور آئے تو توپوں کی گن گرج سے ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ یاد رہے کہ آزاد کشمیر میں اس وقت کی سامراجی حکومت اور اس کے حواریوں نے روز نامہ ”جاوداں“ میں ایک کھلانخط کے نام سے کئی صفحات پر مشتمل ایک دستاویز شائع کرائی جس میں حریت پسندوں کو ہندوستان کا ایجنت قرار دے کے انتہائی بے بنیاد الزامات عائد کیے تھے لیکن تحقیقاتی کمیشن نے ان تمام لوگوں کو محب وطن قرار دے کر اس ٹولہ کی طرف سے لگائے گئے الزامات کو جھوٹ کا پلندہ ثابت کر دیا۔

اور بالآخر یہ حریت پسند حب الوطنی کا سرمیہ یکیٹ لے کر سرزی میں کشمیر پر وارد ہوئے تو ایک بہت بڑے تاریخی جلوس کی شکل میں انھیں ناگزی پارک کی جلسہ گاہ میں لا یا گیا۔ جہاں تلاوت قرآن پاک کے بعد ڈاکٹر فاروق حیدر نے ایک انقلابی نظم پیش کر کے کشمیریوں کے دلوں میں جذبہ آزادی کو اجاگر کیا۔ مرکزی راہنماؤں اور مقامی راہنماؤں نے بھی اس تاریخی جلسے سے خطاب کیا۔ جناب مقبول

بٹ شہید نے اس تاریخی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر تشدد کے تین ادوار سے گزرننا پڑا ہے۔ تین مقامات پر مجھ پر روا رکھے گئے تشدد کے مقاصد بالکل مختلف تھے۔ مقبولہ کشمیر میں مجھ پر اس لیے تشدد کیا گیا کہ قابض حکام میری ذات اور محاذ آزادی کے بارہ میں حقوق کی تلاش میں تھے وہاں مجھے پاکستانی ایجنسٹ قرار دیا گیا۔ دوسری دفعہ آزاد کشمیر کے ایف آئی یو وغیرہ کو حقوق کی تلاش تو نہ تھی البتہ وہ ایک پہلے سے قائم کیے گئے مفردات کے بارہ میں مجھ سے تائیدی شہادت حاصل کرنا چاہتی تھی اور شاہی قلعہ لاہور کے عقوبات خانے میں مجھ سے صریحًا جھوٹ بلوانا چاہتی تھی۔ ان واقعات کا یہ تسلسل ظاہر کرتا ہے کہ مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے خلاف اس مقدمہ کے سلسلہ میں جو کارروائی کی گئی اس کے پیچھے ایک خاص مقصد کا فرماتھا۔ وہ مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ فوجی حکمران نولہ نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائیاں کر کے ملک کو جس شدید خانہ جنگی سے دوچار کر دیا تھا اس کے لیے انہی کی مرضی کے مطابق ایک اور جواز پیدا کیا جائے۔ جناب مقبول بٹ شہید نے کہا کہ حریت پسندی کا دعویٰ کرنا یوں تو بہت آسان بات ہے لیکن اس راستے پر چلنے کے لیے بہت بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس راستے کے مسافروں کو زندگی کے ہر موڑ پر کڑی آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرننا پڑتا ہے۔ بعض آزمائشوں ایسی سخت ہوتی ہیں کہ بیگانے تو کیا اپنے بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جن سے دست گیری کی توقع ہوتی ہے وہ نہ صرف دست کش ہو جاتے ہیں بلکہ وہ اپنے مفادات کے پیش نظر را زنوں کی صفائی میں شامل ہو جاتے ہیں۔

جدوجہد کا میدان یقیناً ایک کسوٹی ہے جو حق کے علمبرداروں کو اور باطل پرستوں کو ہی نہیں بلکہ منافقین کو بھی اپنے مقام پر لاکھڑا کرتی ہے۔ زندگی کے اس دور میں جو میں نے اپنے وطن کی آزادی کی جنگ میں گزارہ ہے مجھے نہایت ہی کٹھن اور صبر آزمائشوں سے گزرننا پڑا ہے۔ ایسے مراحل بھی آئے جب صرف یہ کہ کوئی ساتھ دینے والا نہیں تھا بلکہ خود اپنی صلاحیتیں بھی جواب دے دیتیں تھیں، ایسے موقعوں پر صرف ایمان کی قوت اور ارادے کی پختگی ہی مقاصد کو کامیابی سے ہمکار کرنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ یقیناً یہ بات حریت پسندوں کے شایان شان نہیں کہ وہ راہ عمل میں پیش آنے والی مشکلات اور آزمائشوں کی وجہ سے گلہ گزار ہو۔ حق تو یہ ہے کہ آزمائشوں کے یہ دور حریت

پسندانہ زندگی کے لیے لازم ہوتے ہیں اور انھیں خنده پیشانی سے گلے لگانا انقلابیوں کا شیوه ہے۔
آزمائش آلام اور صعوبتیں اس صورت حال کا ایک حصہ ہوتی ہیں جن سے حریت پسندوں کا ہر وقت
سامنا رہتا ہے۔

دوسرے روز مقامی ہوٹل میں طلباء تنظیموں کی طرف سے ایک دعوت استقبالیہ جوان کے
اعزاز میں دی گئی تھی اس استقبالیہ پارٹی میں تمام سیاسی پارٹیوں کے قائدین نے بھی شرکت کی تھی۔
دعوت استقبالیہ سے جموں و کشمیر مجاز رائے شماری کے راہنماؤں مسٹر عبدالحالق انصاری ایڈ وکیٹ اور
سردار رشید حضرت نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر قائد حربت مقبول بٹ شہید نے اپنے خطاب میں کہا
کہ ”گنگاہائی جیکنگ کیس کی کارروائی اخبارات کے ذریعے آپ تک پہنچتی رہی ہوگی۔ یہ تمام واقعات
آپ کے سامنے ہیں آج میں اپنی دونوں حکومتوں کے مصائب سے آزاد ہو چکا ہوں اس کے باوجود
وطن کی آزادی کے لیے میرا جذبہ آج بھی وہی ہے جو میرے اندر اول روز سے تھا۔ قائد حربت نے کہا
کہ آج کچھ ایسی شخصیتیں نظر آ رہی ہیں جنھوں نے ہمارے جیل جانے کے بعد دوستی کا پورا حق ادا کیا جو
کچھ وہ ہمارے خلاف کہہ سکتے تھے وہ انھوں نے کہا۔ مگر آج ہم زندہ و پاسندہ جیل سے فارغ ہو گئے ہیں
اب یہ لوگ دوبارہ ہماری صفوں میں گھس رہے ہیں ایسے لوگ صرف ذاتی مفادات کے لیے سیاست
کرتے ہیں۔ ملک و قوم کی غلامی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ صرف منتخب کردہ راستے پر نہیں چل
سکتے۔ میرے ساتھ چلنے والے ایسے لوگوں پر جب مشکل وقت آئے گا تو یہ پہلے کی طرح پھر دوسرے
کیمپوں میں پہنچ جائیں گے۔ مسلح جدوجہد کرنے والے افراد دوست و دشمن کی تمیز اچھی طرح کرنے
کے بعد اپنا ساتھ منتخب کرتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس میر پور شہر میں وہ کون لوگ ہیں جو میرے راستے
پر چلانا گوارہ کرتے ہیں اور وہ کون ہیں جو صرف تقریریں کر کے اپنی سیاسی شہرت چاہتے ہیں۔ جناب
مقبول شہید نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ میرے وطن کی نوجوان نسل اس
راستے پر ضرور میرے ساتھ چلے گی جس راستے کو میں نے وطن کی آزادی کے لیے منتخب کیا ہے۔“

دعوت استقبالیہ کے بعد وہ راولپنڈی روائیہ ہو گئے جہاں انھوں نے مجاز رائے شماری کے
مرکزی دفتر میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور فیصلہ کیا گیا کہ مجاز رائے شماری کا کونشن میر پور میں منعقد

(218)

کیا جائے۔ مئی 1974ء کو میر پور میں مرکزی کونشن ہوا جس میں ایک روز قبل مسٹر عبدالخالق انصاری کو دوبارہ صدر منتخب کیا گیا تھا۔ چوک شہید ایام میر پور سے ایک بہت بڑا جلوس نکلا گیا۔ قبل از میں چوک شہید ایام میں جناب مقبول بٹ شہید نے اپنے دست مبارک سے محاذ رائے شماری کے پرچم جس کی اونچائی 40 فٹ سے زائد تھی فضا میں لہرا کر پرچم کشائی کی۔ محاذ کے باñی صدر عبدالخالق انصاری نے دعائے خیر پڑھی۔

مقبول بٹ شہید نے اس موقعہ پر اپنے جذباتی انداز میں کہا کہ اے جماعت کے پرچم! میں ان ہزاروں لوگوں کے سامنے تجھ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ تیری سر بلندی اور وطن کی آزادی کے لیے اگر مجھے اپنی جان کا نذر انہی بھی دینا پڑتا تو دریغ نہیں کروں گا۔ اور تجھے کسی صورت میں سرگوں نہیں ہونے دوں گا۔ اُس وقت تالیوں کی گونج میں ”ایک حل ایک امنگ گوریلہ جنگ گوریلہ جنگ“ کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے یہ جلوس میر پور چوک سے قائد حریت کی قیادت اور ڈاکٹر فاروق عبد اللہ، اشرف قریشی، عبدالخالق انصاری اور سردار رشید حضرت کی معیت میں نانگی پارک کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں مرکزی کونشن کا انعقاد کیا گیا تھا۔

جب جلوس جلسہ گاہ میں پہنچا تو فضا ”ایک حل ایک امنگ گوریلہ جنگ گوریلہ جنگ“۔ ”ہمارا دلیش تمہارا دلیش پاکش رو دلیش“ کے نعروں سے گونج اٹھی۔ اس کونشن کے مہمان خصوصی ڈاکٹر فاروق عبد اللہ تھے۔ دور روز قبل پاکستان و آزاد کشمیر کے دورہ پر آئے تھے۔ جب کہ صدارت آزادی کشمیر کے بزرگ راہنماء اور شیر کشمیر شیخ عبداللہ مرحوم کے دریں ساتھی حاجی وحاب الدین مرحوم نے کی۔ اس کونشن کی باقاعدہ کارروائی سے قبل ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کو ایک کشمیری نوجوان نے بندوق تحفہ میں پیش کی اور انھیں تاکید کی کہ یہ بندوق مقبولہ کشمیر میں لے جائیں لیکن ڈاکٹر فاروق عبد اللہ نے سُلح پر کھڑے ہو کر بندوق واپس کر دی اور کہا کہ یہ میرے ہاتھ میں نہیں جلتی۔ اسے کسی انقلابی شخص کے حوالے کیا جائے۔ جلسہ سے سعید شاہ ناز کی، میر عبدالقیوم، غلام محمد لون، میر عبدالمنان، اکرام اللہ خان جسواں، میر ہدایت اللہ، پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی، مرحوم محمد زمان عباسی، محمد یوسف زمرگ، ڈاکٹر فاروق حیدر، عبدالخالق انصاری، قائد حریت مقبول بٹ شہید کے علاوہ مہمان خصوصی ڈاکٹر فاروق

عبداللہ نے خطاب کیا۔ شہید وطن مقبول بٹ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ”مادر وطن کی نوجوان نسل کو اتنی پہچان ہونی چاہیے کہ اس ملک کے اندر وہ کون سے لوگ اور سیاستدان ہیں جو بندوق سے محبت کرتے ہیں اور وہ کون ہیں جو صرف تقریروں کی سیاست کرتے ہیں اور کہا کہ یہ بندوق جو تم فاروق عبد اللہ کو دے رہے ہو، وہ صرف میرے ہاتھ میں آ کر آزادی کی زینت بن سکتی ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ صرف اقوام متحده کی قراردادوں کے ذریعے ریاست جموں کشمیر کی آزادی چاہتے ہیں۔ مقبول بٹ ایسے نام نہاد اداروں سے آزاد ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزادی تقریروں اور قراردادوں سے حاصل کرنے کا وقت بیت چکا ہے میرے وطن کی آزادی کا ایک ہی حل ہے اور وہ مسلح جدوجہد ہے۔ اس بات پر جلسہ عام میں ”ایک حل ایک امنگ۔ گوریلہ جنگ گوریلہ جنگ“ کے نعرے بلند ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ اس راہ پر چلنے کے لیے مجھے مضبوط محب وطن ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ جب مجھے وہ ساتھی میر ہو گئے تو میں دوبارہ حقیقی راستہ پر نکل جاؤں گا کیوں کہ جدوجہد میر ایمان ہے اور وطن کی آزادی میرا مستقبل ہے۔“ جناب مقبول بٹ شہید کے ان الفاظ کے ساتھ ہی دوروزہ کنوش اختتام پذیر ہوا۔

دوروزہ کنوش میں ہونے والے فیصلوں پر عملدرآمد کے سلسلہ میں جدوجہد شروع کر دی گئی۔ جناب مقبول شہید نے آزادی کشمیر کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور اسی جذبہ کے تحت وہ 1976ء میں اپنے دوسرا تھیوں عبدالحمید بٹ اور محمد ریاض ڈار کے ہمراہ جنگ بندی لائیں عبور کر کے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو گئے لیکن پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اس طرح 8 سال مسلسل قید تہائی میں رکھنے کے بعد 11 فروری 1984ء کو برطانیہ میں ایک بھارتی سفارت کار مہاترے کے قتل کے فوراً بعد مذکورہ تاریخ کو صحیح سورے تہاڑ جیل دہلی میں پھنسی کے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور اس طرح آزادی کشمیر کے اُس چراغ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا گیا جس نے ایک کروڑ کشمیری قوم کے دلوں کی امنگوں کی صحیح اور حقیقی ترجمانی کی تھی اور جس نے وطن عزیز کی آزادی کے لیے اپنی جان دینے اور مسلسل جدوجہد کرنے کی قسم کھائی تھی۔

..... اور وہ وقت چھوٹ گیا

راجہ مظفر خان (سینے روائیں چیزیں KLF مظفر آباد)

1968 میں شہید مقبول بٹ سری نگر جیل سے فرار ہو کر آئے۔ میں ان دنوں راولپنڈی میں زیر تعلیم تھا۔ وہ جب مظفر آباد سے رہا ہو کر پنڈی آئے تو پیر مقبول گیلانی (میرے تایا) کے ہاں میری ان سے سیاسی ملاقات ہوئی۔ میں اس سے تقریباً پانچ ماہ قبل حاذراۓ شماری میں شمولیت اختیار کر چکا تھا۔ چھٹی ملاقات میں ان سے میں کوئی بات نہ کر سکا البتہ ان کی باتیں غور سے سنتا رہا۔ یہ شعور و آگہی کی باتیں تھیں جو میرے دل و دماغ پر اترتی چلی گئیں۔

سکول کے زمانہ میں راجہ خالد اکبر میرے استاد تھے وہ ہمیں کشمیریت کا درس دیا کرتے تھے۔ چنانچہ بحیثیت کشمیری میرے اندر بھی قومیت کے جرأتم پرورش پانے لگے۔ ایک اور سبب یہ بنا کہ میں بیار ہوا تو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے کلینک پر چلا گیا۔ وہاں دیکھا میز پر دو پمپلٹ پڑے ہوئے تھے۔ ایک تھا "افغان کشمیری نوجوان" اور دوسرا تھا "آزادی یا موت" میں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ کتابچے پڑھنے کے لیے مانگے تو پوچھنے لگئے تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے بتایا تو انہوں نے دے دیئے اور تاکید کی کہ پڑھ کر واپس کر دینا۔ چنانچہ میں کتابچے لے آیا۔ جب میں نے "افغان اور کشمیری نوجوان" پڑھنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے جسم میں کرنٹ پیدا ہو رہا ہے۔

جب میں نے یہ کتابچے پڑھ لیے تو واپس کرنے آیا۔ کلینک بند ہونے کا وقت قریب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بٹھا لیا اور بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم کلینک بند کریں گے اور آپ میرے ساتھ چلیں گے۔ آٹھ بجے کلینک بند ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر ریکس ہوٹل پہنچا دیا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں حاذرا کا دفتر تھا۔ کمرے میں سائیکلو شائل میں، کاغذات اور

پھلٹ پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے ایک پھلٹ پڑھنے کو ملا۔ ایک کلیم سر بکف "اس پھلٹ میں مقبوضہ کشمیر میں NLF کی کارروائیوں کی کچھ تفصیلات تھیں۔ گوریلا کارروائیوں سے آگاہی ہوئی۔ کشمیریت کا جذبہ مزید عواد کر آیا۔ اسی عرصے میں جاوید ساغر اور نصیر دانی سے میری ملاقات ہوئی۔ دنوں نوجوان کشمیر کی تحریک آزادی کے حوالے سے پر جوش تھے۔ آزاد کشمیر میں NSF قائم ہو چکی تھی اور میر پور میں یہ خاصی متحرک تھی۔ میں کبھی کبھار اس کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرتا۔ ان دنوں میر پور میں شوکت راجہ میرے دوست ہوا کرتے تھے وہ بڑے متحرک تھے۔

1969 میں میری بھوپھی صاحبہ نیگم پیر مقبول گیلانی سری نگر سے راولپنڈی آئیں تو میں ان کے آزادی پسند خیالات سے بھی متاثر ہوا۔ انہوں نے مقبول بٹ کے سری نگر جیل سے فرار کا واقعہ بھی بتایا۔

ان واقعات اور سرگرمیوں نے مجھے بھی بٹ صاحب کے قریب ہونے اور ان کی جدوجہد میں شمولیت کی تحریک پیدا کی۔ میں اکثر تایا صاحب (پیر مقبول گیلانی) کی رہائش گاہ پر جاتا تو وہاں محاذ کے لیڈرلوں سے ملاقات ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بٹ صاحب پیر صاحب کے پاس آئے ہوئے تھے وہ غسل کرنے گئے تو پیر صاحب خود تولیہ اٹھا کر انہیں دینے لگے۔ مریدوں نے دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ پیر صاحب نے انہیں بتایا کہ میں اس نوجوان میں منفرد خوبیاں دیکھ رہا ہوں۔

گنگا کیس کے دوران جب بٹ صاحب گرفتار ہوئے تو ہم عدالتی کارروائی سننے جاتے، وہاں ان سے ملاقات ہوتی۔ ایک دن ہمیں ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب نے اطلاع دی کہ بٹ صاحب کو کوٹ لکھپت جیل سے کیمبل پور جیل منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم سب لوگ پنڈی ریلوے شیشن پر ان کا استقبال کریں گے۔ چنانچہ ہم نے تیاری شروع کر دی۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر جب ٹرین ریلوے شیشن پہنچی تو میں بٹ صاحب کو دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا اور نعرہ بازی شروع کر دی۔ میں دوڑ کر ڈبے کے اندر رکھ گیا۔ بٹ صاحب نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور تسلی دی۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ کر جیب میں رکھا۔ یہ خط میں نے ان کے ہاتھ میں دیا انہوں نے جیل سے اس خط کا دستی جواب ارسال کیا۔

کیمبل پور جیل میں پیر مقبول گیلانی صاحب کے ہمراہ بٹ صاحب سے ملاقات کے لیے
تین، چار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ پیر صاحب حسن ابدال رک کران کے لیے مجھی خریدتے تھے۔ بٹ
صاحب جب گزگا کیس سے رہا ہوئے تو ان سے بے تکلفانہ ملاقاتیں ہونے لگیں۔ بٹ صاحب بھارتی
مقبوضہ کشیر میں مسلح جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے جب دوسری بار اندر جانے کا پروگرام بنارہ ہے تھے تو
خاص خاص دوستوں اور نوجوانوں سے مشاورت کی۔ کچھ دوستوں نے اس ضمن میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا
تو بٹ صاحب نے کہا میں خود اس کا بندوبست کروں گا۔

مقبوضہ کشیر جانے کے سلسلے میں بٹ صاحب نے ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے پاس مجھ
سے بھی ملاقات کی اور اس ضمن میں میری رائے اور خیالات جانے چاہے۔ انہوں نے مجھ سے گھریلو
حالات وغیرہ دریافت کئے اور پوچھا کہ میں گھر سے باہر کچھ عرصے کے لیے رہ سکتا ہوں کہ نہیں۔ میں
نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے پیش کیا اور ان کے ہمراہ جانے کی حادی بھر لی۔

اس سلسلے میں ایک اور مینگ ہوئی جس میں کچھ اور نوجوان بھی تھے۔ میرے ساتھ میرا کلاس
فیلو آزاد مظفر بھی تھا۔ ہم دس، بارہ نوجوان تھے۔ ہم میں سے انتخاب ہونا تھا۔ پنڈی ہم جس ہوٹل میں
ٹھہرے تھے وہاں ہمارے ساتھ اشرف قریشی بھی تھے۔ وہاں چھاپہ پڑا۔ اشرف صاحب نے اپنے آپ
کو ایک بنگالی تاجر ظاہر کیا اور ہم نجع نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ لاہور کے لیے ریلوے سٹیشن چلے گئے۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد مجھے راولپنڈی پہنچنے کا ہم سا پیغام ملا۔ ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کا
ڈرائیور مجھے پلندری ملا اور پنڈی پہنچنے کا پیغام دیا۔ میں ان دنوں ملکہ بر قیات میں سب انجینئر کی
حیثیت سے بھرتی ہو چکا تھا۔ میں نے بچوں کو مظفر آباد شفت کیا اور بیرون ملک جانے کا بہانہ کر کے
پنڈی آگیا۔ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کو ملا تو انہوں نے بتایا کہ بٹ صاحب کشیر چلے گئے ہیں۔ مجھے
یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکا۔ میں واپس آگیا۔ لیکن اب ملازمت سے جی
اچٹ ہو چکا تھا چنانچہ 1977 میں ملازمت سے استعفی دے دیا۔ (گفتگو: 25-02-1994)



آزادی کا سچا عاشق

محمد یوسف زرگر (مظفر آباد)

میں بارہ مولہ کا رہنے والا ہوں۔ 1942 میں پیدا ہوا۔ میرے والد کا نام شیخ محمد ہے۔ جو اندر وون ریاست کپڑے کا کار و بار کرتے تھے۔

میں نے جب ہوش سنجا لاتو گھر پر حالات دکھنے کیے۔ والدہ بیمار تھیں۔ بڑے بھائی فوت ہو گئے۔ میں بھی ان پریشانیوں کے سبب مسلم ہائی سکول بارہ مولہ سے صرف مڈل تک تعلیم حاصل کر سکا اور پھر کام کا جم شروع کر دیا۔ اس عرصے میں شیخ صاحب کی سیاست عروج پر تھی۔ مجھے بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہونے لگا۔ میرے نانا عمر جو وصال تھے۔ میں نے ان کے ساتھ زرگری کا کام شروع کر دیا۔

مجھے 1953 میں پہلی بار جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ شیخ محمد اکبر نیشنل کانفرنس کے راہنماء تھے۔ لیکن جب 1953 میں شیخ صاحب گرفتار ہوئے اور بخشی غلام محمد کو حکومت سونپی گئی تو شیخ اکبر نے بھی اپنی ہمدردیاں بدل لیں۔ ہم نے اس کے جلسے پر پتھراو کیا۔ کیونکہ ہمیں اس کی یہ حرکت پسند نہ تھی۔ پولیس نے رات کو گھر چھاپہ مارا اور مجھے گرفتار کر لیا۔ پندرہ روز تک سنترل جیل سری نگر کی منڈابارک میں قید رہا۔

جب میں جیل سے رہا کیا گیا تو باہر آ کر دیکھتا ہوں کہ بارہ مولہ میں میں کے قریب میرے رشتہ دار میرے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ یہاں مجھے زندگی کا ایک منفرد منظر دکھائی دیا۔

شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ان کے حامیوں نے ایک وارکنسل قائم کی تھی۔ غلام نبی بھلی صاحب کے گھر اس کونسل کے اجلاس ہوئے۔ ہم ہاتھوں سے پوشر لکھتے اور دیواروں پر لگاتے۔ کچھ لوگ لکھنے کا کام کرتے اور کچھ چھپاں کرتے جاتے۔ ہم ہڑتاں کا پوشر لگاتے تو صحیح سارے شہر میں

ہڑتاں ہو جاتی۔

میری ان سرگرمیوں کا حکومت کو پتا چلا تو 1953 میں مجھے دوسری مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ سری نگر کے کوئی باغ ائڑو کیعنی ستر میں اڑھائی ماہ تک بند رکھا گیا۔ قادر گاندربلی انٹیلی جنس آفیسر تھا۔ وہاں ایک سکھ سپاہی نے میرے اوپر بہت تشدید کیا۔ میرے زخموں میں پیپ پڑ گئی۔ مجھے کہتا "تم لوگ پاکستان کے چاپے لگتے ہو" پاکستان سے آیا ہوا ہتھیار کھا رکھا ہے۔ پاکستان سے کون آدمی تمھیں ہتھیار لا کر دیتا ہے؟ ان دونوں سترل جیل میں کچھ بپھان بھی تھے۔ جو 1947 کے قبائلی حملے میں پکڑے گئے تھے۔ بعد میں نہ معلوم ان کے ساتھ کیا ہوا۔

اس گرفتاری نے مجھے لیڈروں کی صفائی میں شامل کر دیا۔ 1953 سے 1958 تک میں پولیسکل کانفرنس میں کام کرتا رہا۔ غلام محمد کراہ ہمارے صدر تھے۔ نیشنل کانفرنس اور پولیسکل کانفرنس کا آپس میں تنازع چلتا رہتا تھا۔ میں 1956 میں ڈسٹرکٹ بارہ مولہ کا آرگناائزر بھی رہا۔

1958 میں ایک بم دھماکہ ہوا۔ جس میں سلاں بونیار کا معراج دین گرفتار ہوا۔ اس نے پولیس کو میرے بارے میں بتایا کہ یہ دھماکہ یوسف کتابی نے کیا ہے۔ ایس۔ ایس۔ او (بعد میں ڈی آئی جی) غلام حسن شاہ کے میرے ماموں غلام محمد واصل (کشمیر سازش کیس کا ملزم) سے اچھے تعلقات تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ یوسف خطرے میں ہے۔ میں نے سوچا اب مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ یہ بم پاکستانی ساختہ تھا۔ معراج دین لے کر آیا تھا۔ اس نے میرے پاس رکھا تھا۔ ہم نے محمد رمضان نان بائی سے دھماکہ کروایا تھا۔ معراج دین بھاگ کر یہاں آگیا اور میں نے بھی بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

اوڑی میں ہمارے کچھ جانے والے تھے جو گری اور اخروٹ کا کاروبار کرتے تھے۔ چنانچہ میں ان کے ہاں کنڈیاں کے جندر پر آگیا۔ وہاں سے آزاد کشمیر کی حدود میں داخل ہوا۔ اس جندر سے دونوں طرف کے آدمی آنا پسواتے تھے۔

منظرا آباد پہنچ کر میں سیدھا پولیس اسٹیشن گیا اور انہیں بتایا کہ میں بھارتی مقبوضہ علاقے سے آیا ہوں۔ وہ یہ سن کر حیران رہ گئے، مجھ سے پوچھ پکھ کرنے لگے۔ میں نے بتایا کہ میں سول آدمی ہوں

آری سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپ مجھے اپنے کسی بڑے آفسر سے ملا دیں۔ انہوں نے مجھے ایس پی سلطان علی شاہ کے ہاں پیش کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھ گھکھ کی۔ جب مطمین ہوا تو مجھے پوچھنے لگا کہاں جاؤ گے۔ میں نے بتایا کہ میرے ایک جانے والے راولپنڈی میں زرگری کا کام کرتے ہیں، میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس نے مجھے راولپنڈی کا کرایہ دیا اور میں غلام نبی زرگر کے والد حاجی غلام محمد زرگر کے پاس چلا گیا۔ وہاں ان کے ساتھ زرگری کا کام شروع کیا۔ جب میں کام سیکھ گیا تو مظفر آباد آ کر اپنا الگ کاروبار شروع کر لیا۔

یہاں آ کر میں نے سیاسی سرگرمیوں کے لیے مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کی۔ دوسال تک ورکنگ کمیٹی کا ممبر رہا۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مسلم کانفرنس سے تنفر کر دیا۔

یونچ اڈے پر عوامی کانفرنس کے راہنماء عبدالخالق انصاری صاحب تقریر کر رہے تھے۔ ہم حبیب اللہ میر کی دکان پر بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے تقریر شروع کی تو مسلم کانفرنس کے ایک غنڈے شیدے نے جو کہ شراب کے نشے میں دھست تھا آگے بڑھ کر عبدالخالق انصاری کا گریباں پکڑا اور ان کے منہ پر تھیڑا مار دیا مجھ سے رہانہ گیا اور شیدے کو وہاں سے دور ہٹا دیا۔ اس وجہ سے مسلم کانفرنس والے مجھ سے ناراض ہو گئے اور میں بھی ان سے بُدُن ہو گیا۔

1965 میں سیالکوٹ کے مقام پر محاذ رائے شماری کا پہلا کنوش ہوا۔ میں نے بھی اس میں شمولیت کی۔ مقبول بٹ نے مجھے دعوت دی تھی۔ وہاں محاذ کے راہنماؤں کی جو تقاریر سنیں اس سے دل کی دنیا بدل گئی۔ چنانچہ اس جلسے میں میں نے محاذ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت جو میرا فوری تاثر تھا وہ یہ تھا کہ ان لوگوں کے دل و دماغ میں کشمیر کے لیے خلوص بھرا ہوا ہے۔ جہاں سے میں آ رہا تھا وہاں یہ بات نہ تھی۔ وہاں تو بس شراب پیا اور جس کو مرضی پکڑا لو۔

منظفر آباد میں اس زمانے میں مسلم کانفرنس والوں کی غنڈہ گردی خوب چلتی تھی۔ یہ غنڈے ہر جگہ فتنہ فساد کھدا کرتے۔ ہمارے جلوسوں میں شمولیت نہ کرنے کے لیے مساجد میں اعلانات کرواتے۔ ہم پر پاکستان مخالف اور انڈیا کا ایجنسٹ ہونے کا بے ہودہ اور بے بنیاد الزام لگایا جاتا۔

اپراؤہ کا واقعہ ہے۔ قیوم خان کا دور حکومت تھا۔ محاذ کے جلسے میں بٹ صاحب تقریر کر رہے تھے کہ پیر رفیع بدمعاش اپنے کچھ دیگر شرپسند عناصر کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس نے سٹچ پر جا کر بٹ صاحب کو گریباں سے پکڑ لیا اور قائدین کو گالیاں دینے لگا۔ اس نے اس وقت شراب پی ہوئی تھی۔ ارشاد بچھ صاحب اور ہم لوگ بھی آگے بڑھے۔ رفیع بدمعاش کو نیچے اتارا اور جلسہ گاہ سے باہر نکلا۔ اس طرح حکومت، خفیہ ایجنسیاں اور مسلم کافرنز محاذرائے شماری کی قیادت کو عوام کی نظر میں سے گرانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے اکثر استعمال کرتے رہتے۔

بٹ صاحب کی خوبی تھی کہ وہ اس طرح کے ہتھکنڈوں سے گھبراتے یا پریشان نہیں ہوتے تھے۔ وہ انبیاء کی مثال دیتے تھے کہ خدا کے بھیجے ہوئے ان برگزیدہ پیغمبروں کو بھی دعوتِ حق سے روکنے کے لیے کیسے کیے ہوئے۔ وہ ہر جلسے میں سامعین کو سوالات کرئیںکی دعوت دیتے تھے۔ وہ سامعین کے سوالات کا تسلی بخش جواب دیتے۔ بعض اوقات سوالات کا یہ سلسلہ طویل ہو جاتا۔

مقبول بٹ انہائی درویش صفت انسان تھے۔ نہایت سادہ طرز زندگی تھا۔ نمود و نمائش سے بے نیاز، وہ گھر میں آجائیں آپ انہیں فرش پر سلا میں یا پلنگ پر۔ سترہ قسم کے کھانے کھلانے میں یا سادہ دال چاول وہ ہر حال میں مطمئن دکھائی دیتے۔ بٹ صاحب کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ آنکھ کے کالے حصے میں بڑی کشش تھی۔ اس طرح کی چمک اور کشش میں نے بعد میں کسی آدمی کی آنکھ میں نہیں دیکھی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کیا ماجرا تھا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے۔ ہم نے پنڈی سے ایک آباد جانا تھا۔ صدر سے راجہ بازار تک سواری دالے نے تین روپے مانگے۔ بٹ صاحب فرمائے لگے "چھوڑ وزرگر صاحب تھوڑا سا فاصلہ ہے ہم پیدل چلے چلتے ہیں" ہمارے پاس ایک بریف کیس بھی تھا۔ آدھے راستے میں وہ میں نے اٹھایا اور آدھے میں بٹ صاحب نے اٹھایا۔ اس طرح ہم نے تین روپے بچالیے۔

جب گنگا طیارہ انگو ہوا، ہم پر گویا مصائب و آلام ٹوٹ پڑے۔ بڑی تعداد میں قائدین اور کارکنان گرفتار کرنے لئے گئے۔ ہمیں قائم مقام صدر اور پھر اس کے اوپر پھر قائم مقام صدر بنانا پڑا۔ عوام غائب اور قائم مقام عہدیدار رہ گئے۔ ہمارا لڑپر اور کتابیں شائع ہوتی رہیں اور عوام میں تقسیم کرتے

رہے۔ جب چودھری عزیز نے انصاری صاحب کو گرفتار کیا تو ہم نے اس گرفتاری کے خلاف رث دائر کی۔ رات کو دو بجے پولیس نے میرے گھر چھاپ مارا اور مجھے بھی گرفتار کر لیا۔ پہلے دوالائی کیمپ اور پھر سنہل جیل میں گیارہ ماہ قید کاٹی۔

تفقیش آفیسر مجھے پوچھنے لگا کہ آپ کہتے ہیں کہ گاندر بلی نے میری تفقیش کی ہے۔ اب بتائیں اس کی اور ہماری تفقیش میں کیا فرق نظر آیا ہے۔ میں نے کہا کہ انڈیا والوں اور آپ کی تفقیش میں بڑا فرق ہے۔ وہ زور دیتے تھے بتاؤ سچ کیا ہے؟ آپ کہتے ہیں ہماری مرضی کے مطابق بیان دو اور وہ بھی لکھا ہوا پڑھو۔ میں نے کہا آپ سچ پوچھنے کی زحمت اس لیے نہیں کرتے کہ ہمارے سچ بتانے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم جھوٹا اور فرضی بیان دیں تو اس سے آپ کو ترقی بھی ملتی ہے اور آپ کا عہدہ بھی بڑھتا ہے۔

ہائی کورٹ میں ہماری پیروی مشتاق فاروق ایڈ ووکیٹ کر رہا تھا۔ میں نے رث واپس لے لی اور عدالت میں تقریر کی۔ چودھری عزیز پوچھنے لگا "کیا آپ اپنے آپ کو پاکستانی سمجھتے ہیں؟ میں نے کپڑے اتار کر وہ زخم دکھائے جو پاکستان کی محبت میں ہمیں لگے تھے۔ میں نے کہا" چودھری صاحب میں بلا تشوہ پاکستانی تھا تم تو تشوہ دار پاکستانی ہو۔ تم نے تو لاکھوں کمائے ہیں۔ ہم نے تو اپنی جانب لڑائی ہیں۔ میں نے کہا تم لوگوں نے یہاں کشمیریوں کا گوشت اور خون بیچا ہے۔ اب ان کی الائشوں پر منڈلا رہے ہو۔ میں بنے خوف بولتا چلا گیا۔ آئی جی کا پسینہ بہنے لگا۔ نجح صاحب ٹھپ ٹھپ کرتے رہے۔

اگرچہ بٹ صاحب نے آزاد کشمیر کی روائی سیاست میں حصہ ضرور لیا۔ لیکن وہ اس کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بڑی زبردست سیاسی تقریر بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کی منزل اقتدار یا کرسی نہیں تھی۔ ان کی منزل آزادی تھی اور آزادی کے لیے ان کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک کشمیری ہتھیار نہیں اٹھائیں گے اس وقت تک ان کی فریاد کوئی نہیں سنے گا۔ وہ قوم کو مسلح کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے کہ اصل پلانگ اس فریڈم فائز کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں بندوق ہو۔ ان کا موقف تھا پلانگ اس کی کارگر ہو گی جس کے ہاتھ میں بندوق ہوگی۔

جب گنگا کیس چل رہا تھا تو ہمارے کچھ ساتھی نجح صاحبان سے شکایت کرتے تھے کہ ہمیں

کاس اے نہیں ملی یا فلاں فلاں سہولتیں نہیں ہیں۔ بٹ صاحب نے کبھی نجع کے سامنے شکایت نہیں کی۔ بلکہ ایک دفعہ جسٹس یعقوب علی نے بٹ صاحب سے پوچھا بھی کہ آپ کو کوئی پر ابلم ہو تو بتائیں۔ بٹ صاحب نے جواب دیا "میرا اس طرح کا کوئی پر ابلم نہیں۔ بس میرا ایک ہی پر ابلم ہے، کشمیر کی آزادی اور اس پر ابلم کا حل آپ کے پاس نہیں ہے" مجھے اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھیں یا سیاسی قیدیوں کے ساتھ کوئی فرق نہیں پڑتا"

وہ زیادہ تر غور و فکر کرتے رہتے۔ بولنے، قائل کرنے اور جواب دینے کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ میں نے ان کی زندگی کو بڑے غور سے اور قریب سے دیکھا۔ ان کا کوئی ذاتی مقصد یا غرض نہ تھی۔ مالی وسائل کا شکار ہر وقت رہتے تھے۔ لیکن کبھی ان مسائل کے سبب ماہیوس یا ناماہیں دکھائی دیئے۔

ان کا اصل عشق اپنے وطن کی آزادی تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اُن کا ہم پلہ نہیں تھا۔

(گفتگو: کیم جنوری 1994 مظفر آباد)



یادوں کی مہک

ڈاکٹر سیف الدین (مظفر آباد)

سکول کے زمانے میں ہم مظفر آباد کے چند دوستوں نے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ جس کا نام تھا "اسلامی وحدت طلباء" اس تنظیم کے بانیوں میں شیخ فاروق، عبدالحمید اور راقم شامل تھے۔ ہماری تنظیم کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔

۱۔ معاشرے میں اسلامی رجحان کو فروغ دینا۔

۲۔ اسلامی فتح پر طلباء کی تربیت کرنا۔

۳۔ معاشرتی برائیوں کا خاتمه

ہم نے باہمی اشتراک سے ایک دارالعلوم قائم کیا اس میں کتابیں رکھیں۔ لوگوں سے کتابیں عطیے کے طور پر بھی حاصل کی گئیں۔ ہمارا کسی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ ہی حوالے سے ہم جو تقریبات منعقد کرتے ان میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کو دعوت دی جاتی۔ ہمارے شیخ سے وہ خاصتاً دین کے حوالے سے گفتگو یا خطاب کرتے۔ ان علماء کرام میں مولانا اشرف علی ہزاروی، مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار خان نیازی کو ہم بلا تے تھے۔ علماء دین کے علاوہ ہم دیگر سکالرز کو بھی دعوت دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار آزاد کشمیر کے ڈائریکٹر ایجوکیشن شیخ محمود صاحب کو ہم نے دعوت دی۔ انہوں نے سود کے حوالے سے بڑی مدد اور سیر حاصل بحث کی۔

کچھ دوستوں کے والدین خالص دینی ذہن رکھتے تھے۔ ایسے والدین بچوں کو ہدایت کرتے تھے کہ آپ نے سیاست کی طرف بالکل دھیان نہیں دینا بلکہ دین کی طرف توجہ رکھنی ہے۔ ہماری تربیت بھی اسی طرح کے ماحول میں ہوئی تھی مثلاً ہمیں والدین کی طرف سے ہدایت ہوتی تھی کہ آپ نے کرہ امتحان سے کوئی گری پڑی چیز نہیں اٹھانی۔ امتحان کے دوران ادھر ادھر نہیں دیکھنا۔ نہ ہی

نقل لگانے کی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ اگر نقل لگاتے ہوئے پکڑے جاؤ گے تو تعلیم سے بھی فارغ ہو گے اور گھر سے بھی نکال دیتے جاؤ گے۔ چنانچہ امتحان میں نقل لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم اپنی محنت اور صلاحیت کی بنیاد پر امتحان دیتے تھے۔

1967-68 کی بات ہے ہم میں سے کچھ طلباء کا رجحان مکمل طور پر جماعت اسلامی کی طرف ہو گیا۔ ان میں سے قاضی منظور صاحب (نورا زمڈی پارٹمنٹ) سرفہرست تھے۔ یہ جماعت اسلامی کی طلباء تنظیم اسلامی جمیعت طلباء قائد کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے انھیں مشورہ دیا کہ پاکستان کی سیاسی جماعت کی یہاں آزاد کشمیر میں شاخ قائد نہ کریں اس طرح دوسری جماعتیں بھی ایسا کریں گی۔ خاص طور پر این۔ ایس۔ ایف بھی پھر بن جائے گی۔ آزاد کشمیر میں این ایس ایف کے علاوہ اس وقت تک کوئی طلباء تنظیم نہ تھی۔ ہم اپنی تنظیم "اسلامی وحدت طلباء" کو سارے آزاد کشمیر تک پھیلانا چاہتے تھے۔ یہ ایک مخصوص قسم کا ماحول تھا جس میں ہم لوگ کام کر رہے تھے۔ ہم اس سے باہر نہیں لکھنا چاہتے تھے۔

اس زمانے میں ہمیں ایک پہلث ملا "الفتح اور کشمیری نوجوان" ہم میں سے حمید بڑا اچھا مقرر تھا اور یہ ہماری تنظیم کا صدر بھی تھا۔ شخ فاروق بھی بہت اچھا مقرر اور کارکن تھا۔ یہ پہلث کسی دوست کے ہاتھ لگا اور پھر ہم سب نے باری باری پڑھا۔ یہ پہلث پڑھ کر ہمیں الفتح کے نوجوانوں کے کردار پر بڑا شک آیا اور ہمیں اپنے کردار پر بڑی شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ یہ پہلث پڑھنے کے بعد ہم سب کا تاثر یہی تھا کہ ہمیں بھی الفتح کے نوجوانوں کی طرح انقلابی خطوط پر کام کرنا چاہیے۔ اس پہلث کے بارے میں ہم نے سنا کہ اس پر حکومت پاکستان نے پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اس پہلث کو پڑھ کر پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ ہم کشمیری ہیں اور ہمارا وطن کشمیر و حصوں میں تقسیم ہے۔ ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ جس طرح فلسطینی کر رہے ہیں۔ ہمارے کچھ دوست جو جماعت اسلامی کی طرف رجحان رکھتے تھے انھوں نے اس پہلث پر اعتراض کیا کہ اس پہلث کو لکھنے والے لوگ سو شمس نظریات رکھتے ہیں اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے بجائے اسے آزاد و خود مختار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ پہلث امان اللہ خان نے لکھا تھا جبکہ ہم نے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ان سے ملے تھے۔ یہ معاذ رائے شماری کی طرف سے جاری ہوا تھا۔ اس جماعت سے بھی ہماری واتفیت نہ تھی۔ مخالفت

کرنے والے بڑی شدودت سے تنقید کر رہے تھے۔ ان کی تنقید سے ہمارے تمثیں کو مزید شملی۔

"اللَّعْنُ أَوْرَكَشِيرِيْ نُو جُواْن" پڑھنے والے ہم کچھ لاکوں کے دل میں یہ خواہش جاگزیں ہو چکی تھی کہ اس پھلفٹ کو لکھنے والے اور اسے شائع کرنے والے لوگوں سے ملاقات کی جانی چاہیے۔ لیکن کوئی موقع میسر نہیں آ رہا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بالآخر ہماری یہ خواہش پوری ہو گئی۔ میں ان دنوں فرست ائمہ کا طالب علم تھا۔ ہمیں پتہ چلا کہ امام اللہ خان صاحب مظفر آباد آئے ہوئے ہیں اور سیکورٹی کے سخت پہرے میں ہیں۔ ان سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم کچھ دوستوں نے مشورہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح ہم امام اللہ خان صاحب سے ضرور ملیں گے۔ ہمیں پتہ چلا کہ امام اللہ صاحب جیل روڈ پر فاروقی صاحب کے ہاں پھرے ہوئے ہیں۔ ہم نے فاروقی صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے ہمیں ملاقات کا وقت دے دیا۔

سیکورٹی والوں کے پھرے کی وجہ سے امام اللہ خان صاحب سے ملاقات کرنا خاصا مشکل اور پڑھتر کام تھا۔ جس کمرے میں امام اللہ خان صاحب پھرے ہوئے تھے اس کی ایک کھڑکی دریائے نیلم کی طرف کھلتی تھی۔ ہم نے مشورہ کیا کہ ہم کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہونگے۔ چنانچہ جب سورج ڈھل گیا اور اندر ہیرا چھانے لگا تو ہم چھسات دوست جن میں حمید، فاروق، قیوم اور راقم شامل تھے اس کمرے کی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئے تو امام اللہ صاحب ہمارے متنظر تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ایک دبلا پتلا اور چھوٹے قد کاٹھ کا آدمی جس کے جسم میں بظاہر خون کی بوند بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ناتوان اور نحیف سے آدمی سے حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر اتنی خائن کیوں ہیں اور اس کے گرد اتنا کڑا پھرہ کیوں رکھا گیا ہے۔ علیک سلیک کے بعد ابھی ہماری بات چیت بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ فاروقی صاحب کمرے سے باہر نکل گئے اور انہوں نے باہر سے کمرے کو تالا لگا دیا تاکہ سیکورٹی والوں کو جھل دے سکیں۔ جب وہ باہر نکل گئے تو حمید نے سب سے پہلے بات شروع کی۔ وہی ہمارا گروپ لیڈر تھا۔ اس نے کہا! امام صاحب ہم آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ ہم نے آپ کا لکھا ہوا پھلفٹ "اللَّعْنُ أَوْرَكَشِيرِيْ نُو جُواْن" پڑھا ہے۔ پہلے یہ بتا نہیں آپ یہاں مظفر آباد کیسے آئے ہیں۔ فرمائے گے" میرے ایک دوست کشمیر کے اس

پار یعنی بھارتی مقبوضہ کشمیر میں قید ہیں۔ میرا ان سے وعدہ ہے کہ میں ہر حال میں ان کا ساتھ دوں گا۔ ان کی مدد کے لیے اب کچھ پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ میرا کراچی میں ایک کالج ہے "جیسیہ ناٹ کالج" سیالکوٹ کی ایک پارٹی میرا کالج خریدنا چاہتی تھی، میں ان سے بات چیت کرنے سیالکوٹ آیا تھا۔ راستے میں ایک اپے دوست مل گئے جن سے میں نے اپنی ضرورت بیان کی تو انہوں نے کالج فروخت کرنے سے منع کر دیا اور میرے مشن کی تکمیل کے لیے بیس ہزار روپے کا بندوبست کر دیا۔ اب میں اپنے اگلے پروگرام کے لیے مظفر آباد آیا ہوں۔

ہم نے ان سے پوچھا وہ دوست کون ہیں جو کشمیر میں قید ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرے اس دوست کا نام مقبول بٹ ہے اور وہ سری نگر جیل میں حریت پسندانہ سرگرمیوں کی پاداش میں قید کاٹ رہا ہے۔ انہوں نے مقبول بٹ کے بارے میں مزید تعارف بھی کروا دیا۔ انہوں نے بتایا کہ 1965 میں جب ایوب خان نے بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ایک خفیہ فوجی اپریشن کا پروگرام بنایا تو حکومت پاکستان نے ہم سے بھی رابطہ کیا تھا اور تعاون مانگا تھا۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ آپ اس پارے سے جو گوریلے بھیجنے کے یہ غلط ہو گا۔ بہتر ہے کہ آپ کشمیری نوجوانوں کو تیار کریں۔ انہیں تربیت اور تھیار دیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہو گا کہ یہ لوگ اپنے خطے میں گوریلہ کارروائیاں آسانی سے کر سکیں گے۔ دشمن انہیں آسانی سے پہچان نہیں سکے گا اور جب ان کے خلاف دشمن کوئی کارروائی کرے گا تو ان کے علاقے اور خاندان کے لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یوں بھارت کے خلاف ایک عوامی بغاوت پھیل جائے گی۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ ایوب خان نے ہمارا مشورہ نہ مانا اور اپریشن جبراہ شروع کیا۔ جس میں پاکستان ریکولفوج کے لوگ اور رضا کار دستے اندر بھیجے۔ جس کے نتیجے میں بھارت نے کھلی جنگ چھیڑ دی۔ جنگ کے نتیجے میں 10 فروری 1966 کو تاشقند معاہدہ ہوا۔ جس میں پاکستان کو پسپائی اور ہریمیت کا سامنا کرنا پڑا اور کشمیر کے معاملے میں بھارت کی شرائط مان کر کشمیریوں کو بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ تقسیم کشمیر کو قبول کر لیا۔ پاکستان کے اس رویے اور طرزِ عمل کے خلاف محاذرائے شماری کے عسکری ونگ این۔ ایل۔ ایف نے فیصلہ کیا کہ کشمیر میں مسلح تحریک آزادی شروع کی جائے۔ چنانچہ

اس فیصلے اور حکمتِ عملی کے تحت مقبول بٹ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے تاکہ وہاں کے لوگوں کو تیار کر سکیں۔ چنانچہ وہ اپنی حریت پسندانہ سرگرمیوں کے دوران گرفتار ہو گئے ہیں اور انہیں سزاۓ موت کی سزا دی گئی ہے۔ ہم نے سوال کیا کہ پاکستان تو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا ہے ہماری خواہش ہے کہ کشمیر بھی آزاد ہو کر پاکستان میں شامل ہو جائے۔ لیکن ہم نے سنا ہے کہ آپ پاکستان کے خلاف ہیں اور کشمیر کی خود مختاری چاہتے ہیں۔ پاکستان نے ہمارے لیے جنگیں لڑی ہیں، قربانیاں دی ہیں۔ پاکستان ہی ہمارا قبلہ و کعبہ ہے۔ ہم اس کا کہاتے ہیں، اسی کا پیتے ہیں، ہمیں پاکستان کے خلاف تو نہیں ہونا چاہیے؟

ہمارا یہ سوال سن کر امان اللہ خان صاحب ہنس پڑے اور پوچھنے لگے آپ کو ہمارے بارے میں یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟ ہم نے بتایا کہ ہمارے والدین اور دیگر سب لوگ آپ کے بارے میں یہی کہتے رہتے ہیں۔ کہنے لگے ہم پاکستان کے خلاف ہرگز نہیں ہیں۔ ہم تو کشمیر کی آزادی چاہتے ہیں۔ ہمارے اس حق کو بھارت اور پاکستان نے اقوام متحده میں تسلیم کر رکھا ہے۔ یہ ہمارا انسانی اور پیدائشی حق ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم پاکستان کے دشمن ہیں۔ پاکستان سے ہمارے تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور خونی برثتے وابستہ ہیں۔ انہوں نے وضاحت کی کہ ان کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کرنے والے اپنے آپ کو پاکستان کا خیرخواہ اور وفادار ثابت کر کے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے عناصر کو صرف مظفر آباد کی کرسی سے غرض ہے پورے کشمیر کی آزادی سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

اماں اللہ خان کی یہ باتیں سن کر ہم جیران ہوئے کہ ان لوگوں کے نظریات کیا ہیں اور ان کے خلاف میڈیا میں اور عوامی سطح پر پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ اس نشست میں اماں اللہ خان صاحب سے اور بھی بہت سے سوالات کئے گئے۔ انہوں نے تمام سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ انہوں نے آزادی کی عالمی تحریکوں کا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ کشمیریوں کو بھی آزاد رہنے اور حق خود را دیت استعمال کرنے کا حق ہے۔ بھارت اور پاکستان ان کے اس حق پر شب خون مار رہے ہیں۔

اماں اللہ خان کے ساتھ ہونے والی کئی گھنٹوں کی اس مفصل گفتگو نے ہمیں ایک نئے موڑ پر لا

کھڑا کیا اور ہم اپنے دل و دماغ میں ایک ہچل اور طوفان لیے گھروں کو لوئے۔ اس کے بعد جب ہم اپنے دوستوں یا گھروں والوں کے درمیان کشمیر کی آزادی و خود مختاری کی بات کرتے تو ہم پر یہ الزام لگایا جاتا کہ یہ مجاز رائے شماری کے حامل ہو گئے ہیں۔ اور کشمیر کی خود مختاری چاہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہی گروپ مجاز کی سوچ و فکر کی ترجیحی کرنے لگا۔ ہمیں دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں کہ اگر آپ نے کشمیر کی آزادی و خود مختاری کی باتیں کیں تو آپ کو حکومت تعلیمی اداروں سے نکلوادے گی اور عبرت ناک انعام سے دوچار کر دے گی۔

کچھ ہی عرصہ گزر اک 1968ء میں ہمارے ایک دوست اسرار شاہ نے جس کا انشیل جنس والوں سے میل جول تھا، ایک روز ہمیں خبر دی کہ مقبول بٹ بھارت کی قید سے فرار ہو کر آگئے ہیں اور بلیک فورٹ مظفر آباد میں LIA والوں نے انہیں زیر حراست رکھا ہوا ہے۔ اسرار کے والد محکمہ پولیس کے آفیسر تھے اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سیکورٹی اداروں کے لیے کام کرتا ہے۔

ہمیں یہ خبر سن کر خوشی ہوئی اور ساتھ ہی حیرانی بھی ہوئی کہ ایک شخص جو کہ بھارتی قید سے فرار ہو کر آیا ہے اب اسے پاکستانی ادارے نے کیوں قید رکھا ہوا ہے۔ یہ بات ہمارے لیے ناقابل فہم تھی۔ اسرار شاہ نے یہ بھی بتایا کہ مقبول بٹ پر بھارتی ایجنت ہونے کا الزام ہے اس لیے ایف آئی یوان سے تفتیش کر رہی ہے اور برف میں کئی روز تک رہنے کی وجہ سے ان کی پاؤں جل گئے ہیں۔ ہم یہ باتیں سن کر ان سے ملنے کے لیے پیچ و تاب کھانے لگے۔ چونکہ وہ ایف آئی یو کے کنزروں میں تھے اس لیے ان سے فی الحال ملاقات ناممکن تھی۔ اسی دوران امان اللہ خان صاحب پھر مظفر آباد آئے۔ یہاں ان سے مختصر ملاقات ہوئی۔ مقبول بٹ کے حوالے سے پوچھا تو انہوں نے علمی کاظہ کیا۔ غالباً وہ اس بات کو ابھی صیغہ راز میں رکھنا چاہتے تھے۔

چند ماہ بعد ایف آئی یو والوں نے مقبول بٹ کو رہا کر دیا۔ اس عرصے میں ایف۔ ایس۔ سی کے بعد میں لاہور چلا گیا تھا اور وہاں ڈینٹل کالج میں بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا تھا۔ لاہور میں کشمیری طلباء نے "جموں کشمیر سٹوڈنٹس ویلفیر آر گنائزیشن" بنائی۔ بعد میں ویلفیر کا لفظ حذف کر دیا گیا اور JKSO (جموں کشمیر سٹوڈنٹس آر گنائزیشن) بنائی۔ اسی زمانے میں پنجاب میں لوگوں کو کشمیر

کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ شاید آج بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ہوگی۔ دلچسپ واقعہ ہے کہ ہمارے ایک اسنٹ پروفیسر تھے اناثی کے، انہوں نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے بتایا کہ کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ وہ فرمانے لگے وہاں تو سنا ہے اندر اگاندھی کافی ظلم کر رہی ہے۔

پنجاب میں ہمیں جس چیز سے تحریک ملی یہ تھی کہ ہم جہاں بھی اپنا تعارف بحیثیت کشمیری کرواتے وہ ہمیں نفرت کی نظر سے دیکھتے اور طعنہ دیتے کہ آپ لوگوں نے پانچ روپے لے کر سارے پاکستانی گوریلوں کو گرفتار کر دایا ہے۔ پھر وہ ہمیں طعنہ دیتے کہ تم تو ہاتو ہو جو بزدل قوم ہو اور کہتے ہو "آپ تپسی تے ٹھس کری"

ان باتوں کے بعد میں کشمیری طلباء کی غیرت و حمیت جوش میں آتی اور کشمیریت کے جذبات کو مزید آنچ ملتی۔ اس عرصے میں ہماری فلسطینی طلباء سے بھی ملاقاتیں ہو ہمیں اور ان سے تحریک آزادی فلسطین پر تبادلہ خیال ہوا۔ ہمیں آزادی اور غلامی کے حقیقی تصور سے آگاہی حاصل ہوئی۔ ہم نے بھے کے ایس اکو یونیورسٹیز اور کالجز کی سطح پر آرگناائز کیا۔ پاکستانی طلباء کو بھی ہم اپنی تاریخ، جغرافیہ اور قومی مسئلہ سمجھانے اور ان سے حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اکثر پاکستانی طلباء ہم سے پوچھتے کہ کیا ہم پاسپورٹ یا ویزہ پر یہاں آئے ہیں۔ ہم انہیں بتاتے کہ کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن کیا ہے اور یہ کس کے قبضے میں ہے۔ لاہور میں ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ پاکستانیوں کی ایک بڑی اکثریت حتیٰ کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی مسئلہ کشمیر سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے۔ انہیں ان کے میڈیا اور لیڈر ان نے صرف اتنا بتایا تھا کہ کشمیریوں نے پانچ، پانچ روپے لے کر پاکستانی گوریلوں کو ہندوستانی آرمی کے حوالے کیا ہے۔ ہمیں احساس ہوا کہ اصل میں صوران کا بھی نہیں۔ انہیں تو بتایا ہی بھی گیا ہے۔ اصل حقائق تو ان کے سامنے نہیں لائے گئے۔ ہماری کوششوں سے کسی حد تک آگئی پھیلی اور کچھ پنجابی اور کچھ پاکستانی طلباء ہماری حمایت کرنے لگے۔

اسی عرصے میں 30 جنوری 1971 کو دو کشمیری نوجوانوں اشرف قریشی اور ہاشم قریشی نے سری نگر کے ہوائی اڈے سے انڈین بوئنگ طیارہ "گنگا" اغوا کیا اور لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار لیا۔

اس واقعہ سے ہم ایسا محسوس کر رہے تھے کہ جیسے بزدلی اور کم ہمتی کے ہمارے دامن پر لگے تمام داع
وہل گئے ہوں اور ہم فخر سے سراخا کر چلنے کے قابل ہوں گے۔

اس واقعہ سے کشیری طلباء اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ وہ حصول تعلیم کے بجائے گورنمنٹ
ٹریننگ حاصل کرنے کو ترجیح دینے لگے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ اگر اس وقت حکومت آزاد کشمیر نوجوانوں کو
عسکری تربیت دینے اور تحریک آزادی کے لیے حقیقی معنوں میں آزاد کشمیر کو بیس کیپ بنانے کی کوئی
پلانگ کرتی تو ہزاروں کی تعداد میں کشیری طلباء جہاد آزادی کشیر کے لیے تیار ہو جاتے۔

ہم کشمیریوں کی بدقیبی یہ ہوئی کہ ابھی ہمارا یہ جوش و جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ دونوں ہائی
جیکروں کو اور محاذ رائے شماری کے سیکڑوں کارکنوں اور لیڈر ان کو انڈین ایجنسٹ قرار دے کر گرفتار کرنا
شروع کر دیا اور ایک بار پھر ہم کشمیریوں کو قدم قدم پر بھارتی ایجنسٹ کے طعنے سننے پڑتے۔ یہ فوجی امر
ڈکٹیٹر میکی خان کا دور حکومت تھا۔ پاکستان میں عام انتخابات ہو چکے تھے۔ شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ
اکثریتی ووٹ لے کر کامیابی حاصل کر چکی تھی۔ لیکن میکی خانی ٹولہ عوامی لیگ کو اقتدار نہیں سونپنا چاہتا
تھا۔ لاہور مینار پاکستان کے احاطے میں پاکستان پبلز پارٹی نے جلسہ منعقد کیا۔ جس میں بھٹونے
واشگاف الفاظ میں کہا کہ مغربی پاکستان میں ہماری اکثریت ہے ہم ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس نہیں
ہونے دیں گے۔ جو ڈھاکہ جائے گا ہم اس کی تائگیں توڑ دیں گے۔ انہوں نے ”ادھر ہم ادھر تم“، کاغز
بند کیا۔ ڈھاکہ فال ہونے کا ہمیں دکھ ہوا۔ میں کئی روز تک اداس رہا۔

گنگا ہائی جیکنگ میں جواز ام تراشیاں ہوئیں ان میں شیخ مجیب الرحمن کی پریس سٹیٹ منٹ
یہ تھی کہ ڈال فقار علی بھٹونے اقتدار مشرقی پاکستان کو منتقل نہ کرنے کے لیے طیارہ اغو اکروایا ہے۔ اس
موقع پر کشمیری رہنمای شیخ عبداللہ نے اپنا موقف دیا کہ حکومت ہندوستان محاذ رائے شماری پر پابندی لگانا
چاہتی ہے اور اسے ایکشن میں حصہ لینے سے روکنے کے لیے اس نے یہ اقدام کروایا ہے۔ ادھر حکومت
پاکستان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ڈھاکہ سے ہمارا فضائی رابطہ منقطع کروانے کے لیے ہندوستان نے یہ قدم
ٹھایا ہے۔

آزاد کشمیر کی تنظیموں اور جماعتیں نے بھی بعد میں ہائی جیکنگ کے معاملے کو ڈھاکہ فال

سے مسلک کر کے یہ بیانات دیئے کہ اگر ہائی جیکنگ سے کشمیر کا مسئلہ حل ہوتا تو ہم ہندوستان کے تمام طیاروں کو اغاوا کر کے لاتے (محمد عبدالقیوم خان) ان تمام بیانات سے ہائی جیکر ز کی پوزیشن اور این۔ ایل۔ ایف کی پوزیشن ایک بار پھر پوری قوم کی نظروں میں مشکوک ہو گئی۔ کچھ کشمیری خواہ وہ مقبوضہ کشمیر میں تھے یا آزاد کشمیر میں اس تنظیم کو اور ہائی جیکروں کو دشمن کا ایجنسٹ گردانے لگے۔ آزاد کشمیر میں بھی اس تنظیم کے افراد کو تراست میں لے لیا گیا۔ لیکن کچھ ماہ کے بعد عدالت نے ان کو ان الزامات سے بری کر دیا اور انہوں نے رہائی پائی۔ لیکن پاکستان میں یہ معاملہ کافی دیر کے بعد عدالت میں گیا اور جسٹس یعقوب علی کی سربراہی میں ایک فل بنیخ نے اس مقدمے کی سماعت کی۔

ہائی جیکنگ کے عرصے میں بٹ صاحب اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات ہوتی رہی۔ ایک موقعہ پر اکٹھے ہوئے تو کسی نے کہا بٹ صاحب اس گنگا ہائی جیکنگ کا کریڈٹ ہر ایک لینے کی کوشش کرے گا اس لیے آپ ان کے کسی چکر میں نہ آئیں۔ بٹ صاحب نے نہ کہا کہ جہاں تک مختلف لوگوں کی منزل ایک ہو وہاں تک اکٹھے مل کر چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس چورا ہے پر منزل مختلف ہو جائے وہی سے ہی علیحدگی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ تو کوئی داشمندی نہ ہوئی کہ انسان نقطہ آغاز سے ہی تنہا چل پڑے اور اس چورا ہے تک دوسروں کو ساتھ نہ لے کہ اس کی منزل کوئی مختلف ہے۔ المجاہد والوں کا خیال تھا کہ کہیں این۔ ایل۔ ایف والے ان کے کام کو ہائی جیک نہ کر لیں۔ ”المجاہد“، مسلم کانفرنس کی ایک کاغذی گورنلہ تنظیم تھی جس کا مقصد بیرونی ممالک سے جہاد کشمیر کے نام پر فنڈر حاصل کرنا تھا۔ اس کا یہاں عملًا کوئی وجود نہ تھا۔ بٹ صاحب اس سے مختلف پروگرام رکھتے تھے۔ بٹ صاحب اسے کریڈٹ کے بجائے ایک ایکشن سمجھتے تھے جو کشمیری قوم کو جگانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس وقت میری ذاتی رائے یہ تھی کہ پہلے ایک موقعہ پر جب مونے مبارک چوری ہوا تھا وادی بھر عوام بھارت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، لیکن لیڈر شپ نے اس وقت اس موقع کو آزادی کشمیر کے لیے استعمال نہ کیا اور موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب قدرت نے ایک اور موقع دیا تھا جس میں پوری قوم شامل پاکستانی بھائی کشمیر کی آزادی کے لیے اگھٹے ہو کر جہاد کرنے کے لیے تیار کھڑے نظر آئے تھے۔ لیکن اس وقت کے حالات نے ان جذبات کو دوبارہ منتشر کر دیا اور اس سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ جن دنوں جسٹس

یعقوب علی کی عدالت میں گنگاہائی جینگ کیس کی ساعت شروع تھی، رقم اکثر عدالتی کارروائی سنے یاد کیجئے ہائی کورٹ چلا جاتا تھا۔ ایک روز رقم کو ایک جسٹرڈاک ملی۔ اس پر بھیجنے والے کا پتہ نہیں لکھا ہوا تھا۔ رقم نے جب ڈاک کھولی تو اس میں میرے نام ایک رقعہ اور ایک بندلفافہ تھا۔ ایک گنمائن شخص نے مجھے مخاطب کر کے لکھا تھا کہ جس روز عدالت میں ڈاکٹر فاروق حیدر پر جرح ہو رہی ہو میں یہ بندلفافہ مقبول بٹ کے حوالے کر دوں۔ رقم کو تجویز ہوا کہ اس بندلفافے میں کیا ہو گا چنانچہ میں نے اسے کھول لیا۔ اس میں ایک پرانا خط تھا جو ڈاکٹر فاروق حیدر نے 1969 میں اس وقت ہاشم قریشی کو لکھا تھا۔ اس میں ہاشم قریشی کو دو وعد دتی بہم بنانے کی ہدایت کی گئی تھی اور بھارتی مقبوضہ کشمیر میں سرکاری تنصیبات کو نشانہ بنانے کی بھی ترغیب دی گئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ڈاک بھیجنے والا شخص عدالت تک ایک دستاویز پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن اپنا نام صینہ راز میں رکھنا مقصود ہے۔

مقدمے کی آئندہ پیشی کے موقع پر رقم نے یہ لفافہ مقبول بٹ کے حوالے کر دیا۔ اس روز ڈاکٹر فاروق حیدر پر ایم انور ایڈ ووکیٹ نے جرح کرنی تھی۔ جب جرح شروع ہوئی۔ ڈاکٹر فاروق حیدر بار بار یہ دھرا رہے تھے کہ وہ محض بیس ہزار روپے حاصل کرنے کے لیے این۔ ایل۔ ایف کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اس وقت مقبول بٹ نے وہ لفافہ ایم انور ایڈ ووکیٹ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وکیل موصوف نے اسی وقت وہ خط پڑھا تو اس کے ماتھے پر ایک بل سا آگیا۔ اس نے ہدایت کی کہ اس خط کو فائل کا حصہ بنایا جائے۔ ایم انور نے جسٹس یعقوب علی سے اجازت طلب کی کہ وہ اس خط کے حوالے سے ڈاکٹر فاروق حیدر سے کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ یعقوب علی نے یہ خط ایم انور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایم انور نے خط کا بقیہ حصہ فوٹڈ کر کے ڈاکٹر فاروق حیدر کو ان کے دستخط دکھا کر تصدیق کرنا چاہی کہ یہ ان کے ہی دستخط ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دستخط کو پہچانتے ہوئے ”ہاں“ کہہ دی۔ ایم انور نے جسٹس یعقوب علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایک طرف تو یہ اپنے آپ کو ہندوستان کا Paid Agent کہتے ہیں اور دوسری طرف ہاشم قریشی کو ہندوستانی الامک کونقصان پہنچانے کے لیے وہی بہم تیار کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے میں پہلے سے احاطہ عدالت میں پہنچ چکا تھا۔ ایک پولیس وین آکر

عدالت کے باہر کی۔ اس میں سے مقبول بٹ، میر عبدالقیوم، میر عبدالمنان، ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کو پاپہ زنجیر اتارا گیا۔ یہ وین انہیں شاہی قلعہ سے لے کر آئی تھی۔ اس وقت ہم چند کشمیری طلباء وہاں موجود تھے۔ علاوہ ازیں میر عبدالمنان اور میر عبدالقیوم کی بیٹیاں بھی کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے آزادی کے ان متوالوں کو اس حال میں دیکھا تو وہ بے اختیار چیخنے لگیں اور فرط جذبات میں آگے بڑھ کر ہتھکڑیاں پہنے ہوئے میر منان اور میر قیوم سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اس پر میر عبدالمنان نے نہایت حوصلہ مند آواز میں ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"میری بیٹیو! رو نہیں۔ ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ ہمارا خدا

گواہ ہے ہم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس پر ہم شرمند ہوں۔ آپ کو ہمیں اس حال میں دیکھ کر خوشی ہوئی چاہیے کہ ہم لوگوں نے اپنے مادر وطن کی آزادی اور خوشحالی کے لیے یہ زیور پہنانا ہے۔"

یہ منظر دیکھ کر ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ ہم بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ پولیس نے میر منان اور میر قیوم صاحب کو بیٹیوں سے علیحدہ کیا اور انہیں عدالت کے کمرے میں لے گئی۔ گنگا کیس کا فیصلہ ہوا تو عدالت نے محاذ رائے شماری کو ایک محب وطن جماعت اور اس کے قائدین کو حریت پسند قرار دے کر بری کر دیا۔ البتہ ہاشم قریشی کی سرگرمیوں کو مشکوک قرار دیتے ہوئے اسے مزید کئی سال قید کی سزا سنائی۔

مقبول بٹ خاموش طبع آدمی تھے۔ قدرے لمبا قد اور سمارٹ جسم تھا۔ شلوار قمیص کے ساتھ اکثر جیکٹ پہنتے تھے۔ باتھ میں جاتے تو بہت دیر لگادیتے۔ ہم اکثر پوچھتے کہ آپ باتھ میں اتنی دیر کیا سوچتے رہتے ہیں۔ کھانے پینے میں ان کی کوئی خاص پسند نہ تھی۔ حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ شخصیت پرست نہ تھے۔ مثلاً محاذ رائے شماری میں بھی شخصیت پرست لوگ تھے جو شیخ عبداللہ کے پیاری تھے۔ شیخ عبداللہ جو بھی کہتے وہ من و عن اس کو تسلیم کر لیتے۔ بٹ صاحب رواتی سیاسی لیڈروں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان لوگوں کا کوئی نظریہ یا نصب العین نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مفاد یا اقتدار کی خاطر بدل جاتے ہیں۔

ایک دفعہ انجینئر نگ یونیورسٹی کے طلباء نے انہیں خطاب کی دعوت دی۔ آخر پر طلباء نے سوال کیا کہ شیخ عبداللہ اقتدار کی خاطر ہندوستان سے گھٹ جوڑ کر رہا ہے اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ بٹ صاحب نے جواب دیا ”شیخ عبداللہ سیاست دان ہے وہ حالات کے مطابق اپنے مفاد میں کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے۔“ اس پر محاذ کے پچھے دوست ناراض بھی ہوئے۔

بٹ صاحب سچ اور کھرے جذبات رکھتے تھے۔ مصلحت پسندی یا خوف و خطر نام کی کوئی چیزان کی شخصیت میں دیکھنے کو نہ ملی۔ ایک دفعہ ہم ایک جگہ مقبول بٹ کے ساتھ تھے، میں نے ان سے سوال کیا کہ غیر تو غیر اپنے بھی آپ پر شک کرتے ہیں کہ یہ دشمن کا ایجنسٹ ہے تو ایسی قوم کی آزادی کے لیے آپ کیوں اتنی جدوجہد کر رہے ہیں۔؟ فرمائے گئے کہ اگر آپ ان قوموں کی تاریخ پر ہمیں جنہوں نے آزادی حاصل کی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ آزادی کی جدوجہد کی ابتداء میں جو لوگ آزادی کے لیے تحرک ہوئے ان کو حکومت وقت نے طرح طرح کے الزامات اور طعنے دیئے۔ بے گانوں نے اپنوں نے مشکلوں ناظروں سے دیکھا۔ پیغمبر آخر الزمان ﷺ سے لے کر آج تک تبدیلی اور انقلاب کی بات کرنے والوں سے ابتداء میں یہی سلوک روکھا گیا۔ اس لیے مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر اگر اس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔

میں نے ایک بار بٹ صاحب سے پوچھا کہ آپ کو اپنی جدوجہد کی کامیابی پر کتنا یقین ہے اور جدوجہد کب تک بار آور ہو گی تو فرمائے گئے، کہ جب میں پہلی بار کشمیر جانے کے لیے تیاری کر رہا تھا تو تقریباً ایک سو آدمیوں نے مجھے ساتھ چلنے کی یقین دہانی کر دی تھی۔ آخر کار صرف چار آدمی میرے ساتھ گئے تھے۔ میں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ ہماری جدوجہد آخر ایک روز ضرور نگ لائے گی۔ فی الحال میری کوشش ہے کہ میں اپنے ہم خیال لوگ تیار کروں۔ جو آزادی کے لیے حقیقی معنوں میں کام کر سکیں۔ شاید کسی کوشش سے یہ چنگاری شعلہ بن جائے اور بھڑک کر آگ کی صورت اختیار کرے۔ وہ کشمیری عوام کے سکوت اور بے حصی پر کڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب کوئی کسی کے ساتھ چلتا ہے تو کسی مفاد یا منافع کی خاطر چلتا ہے۔ اسے دولت ملے گی، اقتدار ملے گا۔ لیکن ہم جس کو ساتھ چلنے کا کہتے ہیں اس کی جان مانگتے ہیں، جان تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔ جو اپنی خوشی اور رضامندی

سے کوئی بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

مجموعی طور پر بٹ صاحب کی شخصیت کا جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نیشنل سٹ قسم کا کشیری تھا۔ اس کی ذاتی خواہشات کچھ نہ تھیں۔ وہ کشمیر کی صرف سیاسی آزادی نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ قوم کو ہر قسم کی آزادی میسر ہو یعنی معاشری انصاف ملے اور ہر ایک آدمی کو اس کی مشقت کے مطابق اجرت ملے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل ہو جس میں ہر آدمی کو بنیادی حقوق مساوی بنیادوں پر میسر ہوں ورنہ ایک سرز میں کو حاصل کرنے کے بعد اگر اس میں وہی ظلم و ناصافیاں جو غیر اس پر ڈھار ہے ہیں اپنے ڈھانے لگیں تو اس آزادی کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ خود مشقت پسند تھے۔ ہر وقت مطالعہ یا لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی بے کار وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔

بڑے تخل مزاج اور خاموش طبع تھے۔ اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا، دکھ درد میں شریک ہونا، یہاں تک کہ ان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ملک کی آزادی کے سلسلے میں انہوں نے اپنے بچوں کی کیا اپنی جان کی بھی کبھی پرواہ نہ کی۔ وہ سچے مسلمان تھے اور اپنے ارادے میں اتنے پختہ تھے اور اللہ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اکثر کہا کرتے تھے کہ موت کا ایک دین متعین ہے اگر اس سے پہلے ایک شخص موت کے منہ میں چھلانگ بھی لگادے تو موت اس سے دور بھاگے گی۔ لیکن جب موت کا دن آجائے تو اس سے بچنا محال ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار موت کے منہ میں جاتے تھے اور اسے آزماتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے وسائل کچھ بھی نہ تھے لیکن وہ ہر تکلیف اور ہر پریشانی کو خنده پیشانی سے برداشت کرتے اور جو بھی ان کے وسائل تھے انہی میں رہ کر زندگی گزارتے لیکن اپنے مشن کو جاری رکھے ہوئے تھے۔

بٹ صاحب ایک جمہوری ذہن رکھتے تھے۔ ہر ایک کی رائے سنتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا۔ جہاں بھی کبھی کسی ساتھی نے کوئی غلط زبان استعمال کی وہاں انہوں نے نہ صرف لوگا بلکہ سختی سے شاستگی اختیار کرنے کے لیے شبیہ بھی کی۔ بٹ صاحب کے اندر علاقوائی یا نسلی تعصب نام کی کوئی چیز نہ تھی کہ اس نے کبھی پوچھی، جموی، مظفر آبادی، میر پوری، بارہ مولاوی کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ وہ عام آدمی کی بات کرتے تھے۔ جس کو حقیقی آزادی چاہیے، کھیتوں میں آزادی



(242)

دلوانی ہے، مارکیٹوں، گلی کوچوں میں انہیں تحفظ دینا ہے۔ لیپہ، نیلم و میلی یا حولی میں رہنے والا بچہ یا پھر کیوں بڑا انسان بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ فقط بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والوں کے حصے میں یہ خواب کیوں آتے ہیں؟

(گفتگو: 28-02-1994 مظفر آباد)



توبق کے سفر پر گیا مطمئن

غلام دین لاالہ (مظفر آباد)

مقبول بٹ سینٹ جوزف کالج بارہ مولہ میں فرست ائمہ کے طالب علم تھے جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا۔ وہ عمر میں مجھ سے تھوڑے بڑے تھے۔ میرے والد فوت ہو گئے تھے۔ میں لڑکپن سے ہی روزی کمانے لگ گیا تھا۔ بارہ مولہ تحصیل روڈ پر غفار خان نامی ایک آدمی کا ہوٹل تھا۔ میں اس پر کام کرتا تھا۔ بٹ صاحب اسی ہوٹل پر کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ بارہ مولہ میں محمد عبداللہ مجاهد کے ہاں قیام پذیر تھے۔ کھانوں میں وہ عام طور پر کڑم کا ساگ اور چاول کھاتے تھے۔ صبح ناشتے میں وہ نمکین چائے پیتے لیکن ہاف نائم میں میٹھی چائے پیتے۔ گندم سے بننے ہوئے گردے بھی شوق سے کھاتے۔ اس وقت بارہ آنے میں ایک وقت کا کھانہ ملتا تھا۔ وہ بیل کی ادائیگی ماہانہ بنیادوں پر کرتے۔ کبھی کبھار ہوٹل پر ہی سو جاتے۔ کھانا کھانے ہمیشہ اکیلے ہی آتے تھے۔ ایک بار ان کی قیادت میں سینٹ جوزف کالج سے جلوس نکلا۔ جس میں تمام مذاہب اور فرقوں کے طالب علم شامل تھے۔ وہ نائی کے بغیر پینٹ کوٹ پہننے کے عادی تھے۔ میں بھی وہاں مجاز رائے شماری کے پروگرام اور طلباء کے پروگرام شوق سے دیکھتا۔ میں 14 فروری 1957 کو جنگ بندی لائن عبور کر کے بارہ مولہ سے چناری پہنچ آیا۔ میں ایک گائیڈ کی راہنمائی میں یہاں پہنچا۔ مجھے پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

میرے بڑے بھائی غلام محمد لاالہ مجھ سے پہلے بارڈر کراس کر کے یہاں آچکے تھے۔ ہوٹل والا غفار پولیس کی نظر وہ میں مشکوک تھا۔ اسے پولیس نے تشدید کا نشانہ بنایا۔ غفار نے مجھے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ میں راضی ہو گیا۔ بھائی صاحب پہلے ہی جاچکے تھے۔ غفار مجھے بارڈر کے ایک گاؤں دچھی تک چھوڑنے آیا۔ وہاں ایک آدمی پتے کے حوالے کیا۔ دچھی سے وہ آدمی مجھے آگے چھوڑنے آیا۔ اس کا چچا میر علی CID میں حوالدار تھا۔ پتے نے مجھے بارڈر کراس کروایا۔ راستے میں اس نے مجھے کھانا بھی کھلایا پتے نے مجھے اپنے چچا کا مکان بھی دکھا

یا۔ پتے نے مجھے ایک سنان نالے میں اتار کر کچھ ہدایات دیں اور خود واپس چلا گیا۔ میں نالے میں
ینچے اتر کر بہت خوف زدہ ہوا اور بہت رویا۔ میں خوف کے مارے بہت تیزی سے آگے ہی آگے گر ہا
پڑتا پہاڑی نالے میں چلتا گیا۔ کچھ فاصلہ طے کیا تو مجھے ایک آدمی ملا۔ اس نے مجھے اپنے پاس
بلا یا۔ اس نے پوچھا تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میں نے سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا۔ اس نے دن کے
کھانے میں مجھے پنے کی وال اور روٹی دی۔ یہ تقریباً دن کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ مجھے علم ہوا کہ میں
پاکستان کے زیر کنٹرول علاقے میں داخل ہو گیا ہوں۔ اس آدمی نے مجھے سیکورٹی والوں کے حوالے کیا۔
فروری کا مہینہ تھا۔ شدید سردی تھی۔ ایک پہنچان مجھ سے تفتیش پر مامور ہوا۔ وہ عصر تک مجھ سے سوالات
پوچھتا رہا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلائی۔ پھر مجھے دریائے جہلم رسے والے پل سے عبور کر دیا۔ اب
مجھے کوئی ڈر یا خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے چکوٹھی پہنچا دیا۔ یہاں مجھے ایک بڑے آفیسر
کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو سول کپڑوں میں تھا اور کتے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ بڑے آفیسر انہوں میں
تھا۔ اس نے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بارہ مولہ سے آیا
ہوں۔ اس نے پوچھا واپس کب جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ یہاں میرا بھائی آیا ہوا ہے اور مظفر آباد میں
ہے میں اس کے پاس رہوں گا۔ واپس نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے دوراتیں چکوٹھی میں اپنی تحویل
میں رکھا اور تیسرے روز مظفر آباد قلعے میں پہنچا دیا۔ قلعہ میں، میں نے ایک آدمی دیکھا جو وضع قطع سے
کشمیری لگتا تھا۔ میں نے اس سے کشمیری زبان میں بات کی۔ اس کے دو آدمی بھی اس قلعے میں بند
تھے۔ میں نے اس سے اپنے بھائی کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگا غلام محمد لاہو کو میں جانتا ہوں لیکن وہ
یہاں نہیں ہے پنڈی گیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے استدعا کی کہ وہ کسی طرح میرے بھائی کو میرے
بارے اطلاع کرے۔ میں نے اسے مظفر آباد میں رہنے والے کچھ رشتہ داروں کو اطلاع کرنے کو بھی
کہا۔

سی آئی ڈی کا ایک الہاکار ملک مصطفیٰ تھا جو سری نگر سے بھرت کر کے یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ بھی
میرے پاس بیان قلم بند کرنے آیا۔ وہ قلعے میں مجھ سے سخت مشقت کا کام لینے لگے۔ میں نے یہ کام
کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں بتایا کہ میں ہا در پی ہوں اور کھانا پکانے کا کام جانتا ہوں لہذا وہی کروں

گا۔ انہوں نے مجھے کھانا پکانے کی ڈیوٹی سونپ دی۔

ان دنوں قلعہ میں مجرم پہنچا آیا۔ جس کا نام تھا نیم شاہ۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے نیم شاہ نہیں خزیر شاہ کہا کرو۔ قلعہ میں اس کا خوف اور دہشت بہت تھی۔ چھوٹے بڑے سب الہکار اس سے ڈرتے تھے۔ تیدی بھی اس سے سہے رہتے تھے۔ آٹھ دن گزرے تو میرے بھائی مجھ سے ملنے قلعے میں پہنچ آئے۔ میرے بھائی نے مشکل سے ہی مجھے پہچانا کیونکہ تفتیش کے مرحلے سے گزرنے کے اس عمل میں میرا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔

میں 1957 میں یہاں پہنچا تو بٹ صاحب مجھ سے ایک سال بعد 1958 میں یہاں آگئے۔ انھیں بھی بڑے تشدد کے ماحول سے گزرننا پڑا۔ جن دنوں وہ آئے میں راولپنڈی کے دلبڑ ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ گرینڈ مسلم ہوٹل پر بھی کام کیا۔ یہ دنوں ہوٹل پنڈی صدر میں تھے۔

میں پنڈی جس ہوٹل پر کام کرتا تھا، میں نے دیکھا دونوں جوان کھانا کھانے میبل پر بیٹھے ہیں جن میں ایک مقبول بٹ ہیں اور دوسرے عبدالخالق میر۔ خالق میر بھی پارے ہجرت کر کے آیا تھا۔ میں نے دنوں کے سامنے کھانا رکھا۔ کھانے سے پہلے ان سے کوئی بات نہ ہوئی۔ میرے بھائی غلام محمد لاہ اللہ انہیں کھانا کھلا کر اپنے ہمراہ رہائش پر لے گئے۔ بھائی دمدہ مندر میں ایک کرہ کرائے پر لے کر رہ رہے تھے۔ وہ ہوٹل سے تھوڑی ہی دور تھا۔ بٹ صاحب نے پشت کوٹ پہنچا ہوا تھا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ عبدالخالق میر چلا گیا۔ رات کو چھٹی کر کے میں بھی رہائش پر آگیا۔ میر ایک اور منہ بولا بھائی بھی میرے ساتھ تھا۔ بھائی کی بیوی بھی اسی کرہ میں تھی۔ ہم نے سونے کے لیے کرے نے کے درمیان پر دلکا کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بھائی صاحب اور بٹ صاحب رات دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔

میں اور میرا منہ بولا بھائی صبح سویرے اٹھے اور کام پر چلے گئے۔ بعد میں بٹ صاحب بھی ناشستہ کرنے ہوٹل پر آئے۔ خالق میر بھی وہیں آگیا۔ ناشستہ کرنے کے بعد دنوں کہیں چلے گئے۔ شام کے وقت پھر واپس ہوٹل پر آگئے۔ دوسری رات انہوں نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا بلکہ کہیں اور نہ ہرے۔ انہوں نے حکومت سے مہاجر ہونے کی حیثیت میں وظیفہ لینا پسند نہ کیا۔ وہ پنڈی میں خالق میر کے پاس ہی قیام کرتے اور کبھی کبھار ہماری طرف بھی آ جاتے۔ کچھ عرصہ راولپنڈی میں قیام کرنے

کے بعد وہ پشاور چلے گئے۔ پشاور سے پنڈی آتے تو ہمارے پاس ضرور آتے۔ میں کچھ عرصہ راولپنڈی میں کام کرنے کے بعد ناران چلا گیا۔ کیونکہ پنڈی کی گرمی نے مجھے بہت ستایا ہوا تھا۔ بالاکوٹ میں مولانا عبدالباری کا ہوٹل تھا۔ میں دو سال تک وہاں کام کرتا رہا۔ پھر دو سال تک ایک ہوٹل پر ناران میں بھی کام کیا۔ 1965 میں میں نے مظفر آباد میں ہوٹل کھوا۔ اس کا نام پاکستان ہوٹل رکھا۔ ایک دفعہ طالب علموں نے جلوس نکالا تو میرے ہوٹل کا بورڈ توڑ دیا۔ میرا پختہ عزم ہے کہ میں اپنے ہوٹل کا یہی نام رکھوں گا۔ یہ ہوٹل میں نے غلام قادر کے تعاون سے شروع کیا تھا۔ پسیے اس نے لگائے کام میں نے سنبھالا۔ ہم باہم منافع تقسیم کرتے تھے۔ اس وقت میں ہوٹل کے پیچھے ایک مکان میں رہتا تھا۔ بٹ صاحب جب بھی مظفر آباد آتے میری ان سے ملاقات ہوتی۔

میں بارہ مولہ میں جس ہوٹل پر کام کرتا تھا اس ہوٹل کے ایک کمرے میں محمد مقبول شیخ نے دفتر قائم کر رکھا تھا۔ بٹ صاحب نے مجھے محاذ رائے شماری میں شمولیت کی دعوت دی۔ انہوں نے میرا فارم پر کیا اور میں نے دستخط کئے۔ اپر اڈہ میں محاذ رائے شماری کے ایک جلسہ عام میں میں نے محاذ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ محاذ کا تصور پہلے سے ہی میرے ذہن میں تھا۔

جب سے مقبول بٹ سے جماعتی تعلق قائم ہوا پھر کسی دوسری جماعت میں جانے یا کسی اور نظریے کو اپنانے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ خود مختاری کو اپنا نظریہ بنالیا۔ ماریں کھائیں۔ لوگوں نے گالیاں دیں۔ نظریوں سے گرایا لیکن ہم نے راستہ نہ بدلا۔ اگر میں آج کی حالت میں بٹ صاحب کے ساتھ ہوتا تو ان کے لیے اتنی مشکلات نہ ہوتیں۔ میں انصاری صاحب، میر صاحب، اور صوفی زمان صاحب کی طرح اپنا تن من در من پیچ کر بھی تحریک کی ضروریات پوری کرتا۔ میر پور، سیالکوٹ اور کوٹلی کے لوگوں کا جذبہ آزادی دیکھ کر رٹک آتا تھا۔ انہوں نے تحریک آزادی کے لیے وسائل بھی مہیا کئے اور مقبول بٹ کے راستے میں پلکیں بھی بچھائیں۔ بٹ صاحب کے دوستوں کے پاس وسائل تھے لیکن ان کے اپنے پاس کوئی وسائل نہ تھے۔ وہ ہر کام نہایت سادگی اور کفایت شعاراتی سے کرتے تھے۔ ان کا مشن تھا بچت کر دا در جماعت کو مضبوط کرو۔ جو بھی کام ہوتا وسائل کا مسئلہ در پیش ہوتا۔ پنڈی سے پشاور جانا بھی ان کے لیے مسئلہ ہوتا تھا۔ وہ خودداری کا پیکر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسے سے کچھ مانگتے بھی نہ تھے۔ کاش

وہ اس وقت ہمارے درمیان ہوتے میں اپنی دکان پنج کران کی ضروریات پوری کرتا۔ اُس وقت میں خود کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔

ایک بار بٹ صاحب مظفر آباد آئے۔ ہم ایک دکان پر بیٹھے تھے۔ بٹ صاحب کہنے لگے میرے پاس صرف تیس روپے ہیں۔ آپ لوگ مقامی سطح پر چندہ کر کے نظام چلایا کریں۔ اس وقت راولپنڈی سے مظفر آباد کا کرایہ پانچ روپے تھا۔ وہ پشاور سے آئے تھے۔

گنگا کے انواع سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ ہم اٹھ مقام جا رہے تھے۔ محاذ کے راہنماؤں میں بٹ صاحب، علوی صاحب، حبیب اللہ، غلام دین لالہ، یوسف زرگر اور میں اس قافلے میں شامل تھے۔ ایک دن پہلے ہم نے وہاں جلسے کی اناو نسمت کروائی تھی۔ ہم اٹھ مقام پہنچنے تو وہاں بازار بند تھا اور کوئی آدمی موجود نہ تھا۔ پتا چلا کہ مسلم کانفرنس کی قیادت نے لوگوں کو منع کیا ہے کہ محاذ کے پروگرام میں شرکت نہ کی جائے۔ کوئی ایک آدمی ہوٹل کھلا ہوا تھا۔ ہم نے خود ہی وہاں سے کریاں اٹھا کر لائیں۔ سڑک کے کنارے بچھا کر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی نے سُنج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیئے اور قائدین نے تقاریر کیں۔ جب تقاریر شروع ہوئیں تو کہیں سے لوگ بھی نمودار ہونے لگے۔ لیکن دور دور کھڑے ہو کر سنتے رہے۔ ہمارے قریب نہیں آئے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد پروگرام ختم کیا تو لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے اور جھگڑنے لگے کہ یہ کون آدمی ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ بٹ صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ کون ہیں اور ان کا مشن کیا ہے۔ ان لوگوں کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ جیسے ان کے دماغوں میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔

بٹ صاحب نے 1974ء میں جب قانون ساز اسمبلی کا ایکشن لڑا تو نہایت کثھن حالات تھے۔ ایبٹ آباد میں ماشر مقبول صاحب کا گھر ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ہم لوگ جہاں بھی کسیں کے لیے جاتے خشک راشن ہمارے ساتھ ہوتا تھا چاول اور دال وغیرہ۔ ہم خود پکا کر کھاتے تھے۔ کسی پر بوجھ نہیں بنتے تھے۔ کسی جانے والے کے ہاں بھی مٹھرتے تو اپنا کھانا تیار کرتے۔ کھانا کیا تھا بس پیٹ بھرنے کا چارہ کرتے۔ کرائے پر دور دراز جانے کے لیے موڑ گاڑیاں بھی استعمال کیں۔ بٹ صاحب ایکشن نہیں میں نووارد تھے۔ پھر بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہمیں ایبٹ آباد کے مقامی اسٹیشن سے زیادہ دوٹ

ملے۔ یہ ماشر مقبول کے اثر و سوخ اور محنت کا شمر تھا۔ خان حمید کے حامیوں نے کئی جگہ لڑائی جھنڈے کی کوشش کی لیکن بٹ صاحب کی تخلی مزاوجی اور برداشت کے سبب معاملہ محنڈا ہوتا رہا۔ بٹ صاحب جلسوں میں روائی قسم کی تقریر نہ کرتے بلکہ تحریک آزادی کشمیر اور خود مختار کشمیر کا نظریہ ہی ان کا موضوع ہوتا تھا۔ ہم تھی دست اور بے وسیلہ تھے لیکن ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہماری سیاست بھی ایسی ہے کہ لوگ دوٹ اسی کو دیتے ہیں جس کی جیب میں پیسے ہوں۔ خالی جیب لیکن بھرے دامن والے کا ساتھ نہیں دیتے۔

بٹ صاحب والز کے سیگریٹ پینتے تھے۔ میٹھی اور نمکین دنوں قسم کی چائے پسند کرتے تھے۔ کھانے میں انہیں بزری زیادہ پسند تھی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتے۔ میں نے انہیں اکثر صبح کی نماز پڑھتے دیکھا مخصوص ثوبی لگائے ہوئے۔

آخری بار جب مقبول بٹ بھارتی مقبوضہ کشمیر گئے تو مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ ایک بار وہ بارڈر سے کہیں واپس آئے تھے تو میری ملاقات ہوئی۔ چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ جرات نہ ہوئی وجہ پوچھنے کی۔ جب وہ اندر داخل ہو گئے تو مجھے علم ہوا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ لندن یا امریکہ جاتا۔ اس کی منزل کشمیر تھی۔ وہاں جانے کے لیے مال وزر کی ضرورت نہ تھی۔ بس سچا جذبہ درکار تھا اور یہی جذبہ اس کی متاع عزیز تھی۔

(گفتگو: 25-08-1994 مظفر آباد)



میرا بھائی مقبول بٹ

نیم اختر (مظفر آباد)

میرے خاوند غلام دین لاہ کا تعلق بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ہے۔ وہ مقبول بٹ شہید کے رشتہ دار ہیں۔ دونوں نے یکے بعد دیگرے ہجرت کا سفر اختیار کیا۔ میں جب رشتہ ازدواج میں مسلک ہوئی تو اس وقت میں مقبول بٹ سے متعارف ہوئی۔ اب میں ان کے خاندان کا ایک فرد تھی۔ خاوند کی زبانی بھی میرا ان سے موسوم ساتھارف ہو چکا تھا۔

دسمبر 1968 میں بٹ صاحب سری گرجیل سے فرار ہو کر ایک جان لیوا سفر طے کر کے آزاد کشمیر پہنچے۔ یہاں کی خفیہ ایجنسیوں نے انہیں مشکوک نظر دوں سے دیکھا اور بدنام زمانہ بلیک فورٹ میں مقید کر دیا۔ چند ماہ بعد جب انہیں قلعے سے رہائی ملی تو وہ مظفر آباد میں تمام رشتہ داروں سے ملنے۔ ہمارے گھر بھی تشریف لائے۔ ان دونوں ہم کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے جو ہوٹل کے عقب میں دو کمروں پر مشتمل تھا۔ میری شادی ہوئے ابھی تین ماہ ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے میں ہم نے مخصوص کشمیری ڈش واژہ و ان تیار کروائی۔ کھانے سے پہلے مجھے تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کا چہرہ سرخ انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔ جیل سے فرار کے جان لیوا سفر اور پھر بلیک فورٹ میں ڈھائے جانے والے مظالم کے سبب ان کی یہ حالت تھی۔ میں نے انہیں جیل سے فرار کے واقعات سنانے کو کہا تو انہوں نے جستہ جستہ اپنی داستان سنائی۔ ان کے پاؤں پر پٹی بندھی ہوئی تھی جسے انہوں نے وہیں بیٹھے ہوئے کھولا۔ زخم اتنے گہرے تھے کہ ان کے پاؤں کی ہڈی نظر آ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں ڈر گئی۔ میں نے پوچھا بٹ صاحب آپ کو درد نہیں ہو رہا؟ فرمانے لگئیں اسوقت زیادہ درد نہیں ہے۔

جب ان کے سامنے دستر خوان پر کھانا لا کر رکھا گیا تو واژہ و ان کے اہتمام پر ناپسندیدگی کا

انہار فرمایا۔ کہنے لگے آپ نے خواہ مخواہ اتنا تکلف برنا ہے۔ میں تو ایسے کھانوں کا عادی نہیں ہوں۔ پھر فرمائے گے ”گوشت کم کھایا کریں۔ کشمیری گوشت کھانے کے بہت عادی ہیں۔ جب تک یہ گوشت کھاتے رہیں گے ان کے موئے داغوں پر جلبی چڑھی رہے گی۔ انہیں ہوش نہیں آئے گا۔“

وہ جب مظفر آباد آتے، زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو عزیز واقارب کے ہاں جاتے۔ کوئی انہیں چائے پر باتا کوئی کھانے پر۔ ان کو گھر بلانے میں سب خوشی محسوس کرتے۔ میرا بہت خیال کرتے، کہتے ”تم میری چھوٹی بہن ہو“ کوئی قربی رشتہ دار یا عزیز کسی تقریب میں نظر نہ آتا تو اس کا ضرور پوچھتے۔

گنگاطیارے کے انگوے سے پہلے کا داقعہ ہے۔ ایک دفعہ وہ ہمارے ہاں آئے۔ ان کے ہمراہ کافی اور آدمی بھی تھے۔ انہیں ہم نے صحن میں شیٹ بچھا کر کھانا کھلایا۔ بڑے لاہ (غلام محمد لاہ) اس موقع پر نہ آئے تو مجھے پوچھنے لگے وہ کیوں نہیں آئے۔ میں نے صاف صاف بتا دیا کہ وہ ناراض ہیں اس لیے ادھر نہیں آئے۔ یہ سن کر فوراً اٹھے اور بڑے لاہ کے ہاں چلے گئے۔ انہوں نے کچھ گلے شکوئے کئے۔ واپس گھر آئے تو مجھے اپنے ساتھ لاہ کے ہاں چلنے کو کہا۔ میں کیسے انکار کر سکتی تھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ راستے میں کہنے لگے ”مجھے لاہ کی باتوں سے ایسے لگ رہا ہے جیسے دو بچے آپس میں خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں، لڑائی یا ناراضگی کی واقعی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ انہوں نے ہماری صلح کر دی۔ مجھے کہنے لگے آپ لوگوں کی یہ باتیں سن کر میرا تقریر کا مود خراب ہو گیا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹیاں عطا کیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ ایک دفعہ آئے تو اپنے ساتھ اپنے بیٹے جادید کو بھی لائے۔ اس کی عمر تقریباً چھ برس تھی۔ مجھے کہنے لگے ”بہن تیرا کوئی بیٹا نہیں ہے میرا یہ بیٹا کلو“ میں نے کہا کہ اللہ نے آپ کو دیا ہے آپ ہی اس کی پرورش کریں۔ میں بھی اسے اپنا بیٹا ہی سمجھتی ہوں۔ کہنے لگے میرا کوئی پتا نہیں میں نے کدھر جانا ہے۔ کہاں رہنا ہے۔ بچوں کی پرورش کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ میرے دل میں ایک ہوکی اٹھی ایسا کیوں کہتے ہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔

وہ جب آزاد کشمیر آسیل کے ایکشن کے لیے کھڑے ہوئے تو ایسٹ آباد سے ماسٹر مقبول صاحب کا پیغام ملا کہ بٹ صاحب کی ایکشن مہم کے لیے ہم لوگ بھی آئیں۔ ہم لوگ ایسٹ آباد گئے۔ صبح بٹ صاحب شیو بنا رہے تھے۔ یوسف زرگر صاحب انہیں کہنے لگے، بٹ صاحب ہمارے مخالفین کے

پاس گاڑیاں ہیں، روپیہ پیسہ ہے، بندے ہیں، انہوں نے جھنڈے اور نیچ لگار کئے ہیں دھوم دھام سے ایکشن مہم چلا رہے ہیں۔ بٹ صاحب مسکرا کر کہنے لگے "آپ کو علم تھامیرے پاس پیسے نہیں ہیں تو پھر مجھے ایکشن میں کھڑا کیوں کیا۔ میرے پاس گاڑیاں اور اتنے وسائل نہیں ہیں لہذا اب اسی طرح گزارہ کریں" ہم ایبٹ آباد پونگ اسٹیشن پر تھے۔ بارہ بجے تک اصل کشمیری دوڑوٹ ڈال رہے تھے۔

بارہ بجے کے بعد کار پولیشن کے سیکڑوں ملازم آگئے اور پی پی کے امیدوار خان حمید کے حق میں دوٹ ڈالنے لگے۔ ہم نے احتجاج کیا۔ لیکن وہ لوگ دوٹ ڈالتے رہے۔ ہماری کسی نے ایک نہ سئی۔ لگتا تھا پونگ کروانے والے خان حمید کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ بٹ صاحب نے ان حالات میں بھی ہمارا حوصلہ بڑھایا اور مقابلے کے لیے ڈٹے رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

ایکشن مہم کے دنوں کا واقعہ ہے۔ بٹ صاحب ماشر مقبول صاحب کے گھر ایبٹ آباد میں ٹھہرے تھے۔ میں بھی وہیں تھی۔ وہ با تھروم میں گئے۔ میں نے دیکھا با تھروم کی نالی میں خون بہرہ رہا ہے اور کافی مقدار میں ہے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ دوڑی دوڑی اندر گئی اور ماشر صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ مقبول بٹ کو بوا سیر کی تکلیف ہے۔ وہ جب باہر آئے تو میں نے پوچھا آپ کو اتنی تکلیف ہے تو علاج کیوں نہیں کرواتے۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہے۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے بٹ صاحب کی بیگم ذا کرہ بیگم چھت پر بنیٹھی کتاب پڑھ رہی تھیں کہ اچانک مکان کی چھت کا کچھ حصہ نیچے گر گیا۔ وہ ایک بو سیدہ اور پرانے طرز کا بنا ہوا ٹنگ و تار یک مکان تھا۔ بٹ صاحب پشاور میں کسی گھر میں پڑھانے جاتے تھے۔ ذا کرہ سکول ٹیچر تھیں۔ بٹ صاحب سے آمنا سامنا ہوا تو اس کے گھر والوں نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ چنانچہ بٹ صاحب نے دوسری شادی کر لی۔ اس خاتون نے بٹ صاحب کو کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی نہ ہونے دی۔ وہ صرف ان سے منسوب رہنا چاہتی تھی۔ اس بیوی سے اللہ نے انہیں ایک بیٹی لئی عطا کی۔ ذا کرہ ملازمت سے فارغ ہو کر کراچی چلی گئیں اور بیٹی کو بھی اپنے ہمراہ رکھا۔

بٹ صاحب کی پہلی بیوی راجا بیگم بھارتی مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے چچا عبدالعزیز بٹ کے ہمراہ دیگر اہل خانہ کے ساتھ آئیں۔ کراچی میں ان کی شادی مقبول بٹ سے ہوئی۔ راجا بیگم نے زیادہ وقت پشاور والے گھر میں ہی گزارہ۔ اس بیوی سے ان کے دو بیٹے تھے جاوید اور شوکت۔

بٹ صاحب جن دنوں تہاڑ جیل میں قید تھے راجا بیگم بچوں کو لے کر ہمارے ہاں آئیں تو مجھے کہنے لگیں جاوید پڑھائی میں سستی کرتا ہے۔ اسے آپ یہاں رکھ لیں تاکہ اچھی طرح پڑھائی کر سکے۔ میں بچے کو اپنے پاس رکھنے پر آمادہ ہو گئی لیکن جاوید نے یہاں رہنے سے انکار کر دیا۔ بٹ صاحب کو جیل میں بھی بچوں کی پڑھائی کی فکر تھی۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو اس بارے میں خطوط میں بھی اظہار کیا ہے۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میں بٹ صاحب کے بچوں کو اپنے پاس رکھوں اور ان کی پرورش کروں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ 27 اکتوبر 1990 کو مظفر آباد میں چار جماعتی اتحاد کا جلسہ ہوا۔ ہنگامہ آرائی ہوئی جس میں بھارتی مقبوضہ کشمیر سے آیا ہوا مقبول بٹ کا سب سے چھوٹا بھائی ظہور بٹ زخمی ہوا اور بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہسپتال میں داخل کروادیا۔ مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو میں ہسپتال گئی اور ہوش آنے پر اسے اپنے ہمراہ گھر لے آئی۔

بٹ صاحب بہت کم گوتھے۔ ہمارے گھر آتے تو میں ان کے منہ کی طرف دیکھتی۔ انتظار کرتی کہ وہ کب منہ کھو لیں اور کوئی بات کریں۔ جب بولتے تو میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنتی۔ وہ لڑائی جھگڑے اور منافقت کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ خاندان اور فیملی کی سطح پر بھی اتفاق و اتحاد کے قائل تھے۔ خاندان میں پائی جانے والی رنجشوں اور ناراضگیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ صلح صفائی کرواتے رہتے اور مل جل کر حسن سلوک سے رہنے کی تلقین کرتے۔ انہوں نے اپنی دنوں بیویوں کے مابین اتفاق قائم رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن دونوں اپنا اپنا کھانا الگ بناتی تھیں۔ دونوں کوشش کرتیں کہ بٹ صاحب جب گھر پر ہوں تو ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھائیں۔

مجھے بٹ صاحب کے گھنٹہ گھر پشاور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ وہاں محصلیاں فروخت کرنے والوں کی دکانیں تھیں۔ جہاں ہر وقت تعفن اور بدبوی پھیلی رہتی۔ 1976 میں جب بٹ صاحب بھارتی

مقبوضہ کشیر گئے تو مجھے اس کی خبر اس وقت ہوئی جب وہاں ان کی گرفتاری ہوئی۔ یہ خبر میں نے ریڈ یو پر سنی۔ یہاں مسلم کانفرنس والوں نے پروپیگنڈہ پھیلایا کہ مقبول بٹ نے ڈاکہ ڈالا ہے اور گرفتار ہوا ہے۔ ہم غلام نبی میر صاحب کے گھر گئے۔ وہاں لوگ یہ خبر سن کر افسوس کے لیے آرہے تھے۔ عورتیں بھی افسوس کے لیے آرہی تھیں۔ ایک عورت جو مسلم کانفرنی گھر سے تعلق رکھتی تھی کہنے لگی "اس بٹ کے لیے کیا افسوس کر رہے ہو؟ اس نے تو چوری کر کے ہماری ناک کٹوادی ہے" مجھے یہ سن کر طیش آگیا اور میرا اس عورت سے جھگڑا ہو گیا۔ عورتوں نے نیچ بچاؤ کروادیا۔

مجھے اس وقت بینک والے واقعہ کا علم نہیں تھا۔ میں یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ مقبول بٹ کے خلاف کوئی بات کرے۔

میں نے جب بٹ صاحب کی چنانی کی خبر سنی تو میری ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ میں کھڑے ہونے کے قابل نہ رہی۔ یہ خبر سنتے ہی ہمارا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ میں نے اللہ سے ان کی سلامتی کی بہت دعا مانگیں۔ لیکن تقدیر کا لکھا کچھ اور تھا۔ جب انہیں چنانی ہو گئی تو ہمارے گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتابندھ گیا۔ مرنا تو سب نے ہی ہے لیکن مقبول بٹ کا غم جداً ہمارے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اگر ہمارے اور سو بیٹے اور بھائی شہید ہو جاتے اور وہ زندہ رہتا تو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ابھی ہمیں ضرورت تھی۔ اس جیسا باب کوئی نہیں ملے گا۔

جن دنوں عورتیں ہمارے پاس افسوس کے لیے آرہی تھیں۔ غلام رسول زرگر نامی ایک شخص سری نگر سے آیا ہوا تھا۔ وہ میرے خاوند سے ملاقات کرنے ہمارے گھر آیا تو عورتوں کو آتا جاتا دیکھ کر پوچھنے لگا کہ یہ عورتیں آپ کے گھر کیوں آرہی ہیں۔ میں نے بتایا کہ مقبول بٹ کے افسوس کے لیے آرہی ہیں۔ فوراً بولا۔ "اس نے کون سا بہادری کا کام کیا ہے۔ اس نے تو پورے کشیریوں کی ناک کٹوادی ہے۔ ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے کشیر میں۔ میں تو بھٹو کا شیدائی ہوں۔ اس کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں۔ وہ ہمارا اصل ہیر و تھا"۔ میں یہ سن کر طیش میں آگئی۔ میں نے کہا تم ایسے پڑھے لکھ کشیریوں پر لعنت ہے جو اپنے محسنوں کے بجائے مجرموں کو سلام پیش کرتے ہو۔ بھٹو نے تو ہم کشیریوں کا شاملہ معاہدہ کر کے بیڑا غرق کیا تھا۔ وہ آگے سے بولنے لگا تو میں نے کہا بکواس بند کرو اور

یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ ہمارے گھر سے نکل گیا۔ بہت صاحب کی شہادت کے سامنے نے میری دنیا بدل دی۔ میں نظریاتی اور فکری اعتبار سے بھی ان کی ہمنوا بن گئی۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ حقیقی معنوں میں این۔ ایس۔ ایف کے نوجوان مقبول بٹ کے مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔

مقبول بٹ میرا بھائی تھا..... اس نے مجھے بہن کہا تھا..... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بھائی میرے دامن کو اپنی محبوتوں سے اتنا بھر کر خود اتنا دور چلا جائے گا جہاں سے آج تک کوئی لوٹ کے واپس نہیں آیا..... بس اس کی یاد آتی ہے اور مجھے تڑپاتی ہے..... جس روز انہیں تختہ دار پر چڑھایا گیا اور یہ خبر میں نے سنی..... یہ میرے لیے قیامت کا دن تھا..... پارہ برس بست گئے ہیں..... مقبول بٹ کی جدائی کا زخم اب بھی تروتازہ ہے..... وقت کا کوئی مرہم میرے اس زخم کو نہیں بھر سکتا..... ہاں میں نے اپنے غم کی تسلیں کے لیے ایک حل ڈھونڈ لیا ہے..... مقبول بٹ شہید کے بھائی اور بیٹے میرے ان زخموں کا مرہم بن گئے ہیں..... یہ میرا اٹاٹا ہیں..... میری روح کی تسلیں ہیں۔ یہ میرے پاس ہوتے ہیں تو مجھے راحت و سکون ملتا ہے..... میں ان کے لیے دل و جان فرش راہ کرتی ہوں..... یہ میری آنکھوں کا قرار اور دل کا سکون ہیں..... جی چاہتا ہے بس یہ میری نظروں سے اوجھل نہ ہوں..... جب تک میرے جسم میں جان ہے میں انہیں اپنے دامن میں لیے رکھوں..... اب میری زندگی کا حاصل یہی ہیں..... ان کی چاہتیں میری زندگی کی دلیل ہیں۔

ہر سال گیارہ فروری کے دن ہماری یادوں کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے گھر پر سیاہ پر چم لہراتی ہوں۔ سوگ مناتی ہوں۔ میری سب بچیاں اور میرا خاوند اس غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم شہید کی روح کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کرتے ہیں اور سب ملکر دعا کرتے ہیں اے اللہ ہمیں مقبول بٹ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرم۔ اس کے مشن کو پایا تکمیل تک پہنچانے کی ہمت عطا فرم۔ (آمین) (گفتگو: 26-08-1994)



تھاڑ جیل میں شہید کشمیر سے یادگار ملاقات

ملک محمد انور کشمیری (ترجمہ)

میں مقبول بٹ کو 1955 سے جانتا تھا۔ ہمارے قریبی روابط 1956 میں قائم ہوئے۔ میں ان دنوں پھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ بٹ صاحب سینٹ جوزف کالج کے سٹوڈنٹ تھے۔ میں کتابیں اٹھا کر کھیتوں کی طرف پڑھنے چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھار بٹ صاحب سے بھی راہنمائی لیتا۔ 1958 میں جب انہوں نے بی۔ اے کر لیا تو نج بہاڑہ ایک گاؤں میں قائم پرائیوریٹ مکتب میں تدریسی خدمات بھی سر انجام دینے لگے۔ یہ غالباً جماعت اسلامی کا قائم کردہ سکول تھا۔ موصوف کے چہرے پر داڑھی بڑی خوشنما لگتی تھی۔

مقبول بٹ حقیقی معنوں میں آزادی پسند، جذباتی اور قدرے مذہبی رجحانات رکھنے والے آدمی تھے۔ ان دنوں پاکستان کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 1958 میں اپنے چچا عبدالعزیز کے ہمراہ جنگ بندی لائن عبور کر کے آزاد کشمیر آگئے اور پوچھ چکھ کے مرٹلے سے گزرنے کے بعد پشاور میں سکونت اختیار کر لی۔ برس ہابرس نزر گئے وہ اس پارچلے گئے اور میں اس پار رہ گیا۔ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ کبھی کبھار اخبارات کے ذریعے ان کی سرگرمیوں کی اطلاعات ملتی رہتیں۔

یہ دسمبر 1976 کی بات ہے میں ان دنوں چاندنی چوک دہلی میں واقع ایک بینک میں ملازمت کرتا تھا۔ حسب معمول ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا کام کا ج میں مصروف تھا کہ قریب ہی ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ کوئی شخص ہمارے دفتر کے کسی شافمبر سے میرے بارے پوچھ رہا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا تو محمد مقبول بٹ کے برادر اصغر غلام نبی بٹ اندر داخل ہوئے۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور آگے بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد میں نے دہلی میں آنے کا

سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ مقبول بٹ کو ڈیڑھ ماہ قبل سری نگر تھا جیل میں منتقل کیا گیا ہے۔ میں ان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ دوسرا دن غلام نبی نے جیل حکام سے رابطہ کیا مگر کئی روزہ کاوشوں کے باوجود جیل حکام نے اس کی ملاقات بھائی سے نہ ہونے دی۔

غلام نبی میرا بچپن کا ساتھی تھا اور ہم ایک ہی محلے کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ہماری بچپن سے دوستی تھی۔ میں نے تقریباً ایک ہفتہ انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ کوشش کے باوجود جب ان کی بھائی سے ملاقات نہ ہو سکی تو وہ واپس کشمیر چلے گئے۔ 1978 میں غلام نبی بٹ ایک بار پھر میرے پاس دہلی آئے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں بھائی کے وکیل مظفر حسین بیگ ایڈ و کیٹ کی وساطت سے بھائی سے تھا جیل میں ملاقات کر کے آ رہا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ شبیر احمد شاہ نے بھی کسی کوڈ نام سے جیل میں مقبول بٹ سے ملاقات کی ہے۔ یہ سن کر میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی ان سے ملاقات کروں۔ میں نے بھی بٹ صاحب سے ملاقات کی کوشش کی لیکن میری میری ملاقات نہ ہو سکی۔ کچھ ماہ بعد میرا واپس کشمیر تباہہ ہو گیا اور مقبول بٹ سے ملاقات کی خواہش میرے دل میں ہی دبی رہ گئی۔

آخر کارجنوری 1983 میں غلام نبی اور میں نے مقبول بٹ سے ملاقات کے لیے دہلی جانے کا پروگرام تشکیل دیا۔ میں کچھ روز پہلے چلا گیا اور غلام نبی کو بتایا کہ مجھے اسی مقام پر ملیں جہاں ملازمت کے دوران رہتا تھا۔ غلام نبی میرے پاس آگئے اور ہم نے بٹ صاحب کے وکیل سے ملاقات کی۔ انہوں نے جیل حکام سے رابطہ کر کے ہماری ملاقات کا بندوبست کر دیا۔ اگلے روز وہ ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر جیل کے اندر لے گئے۔ جب ہم کار میں سوار جیل کی طرف روای دواں تھے تو میری کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میں اس وقت دل ہی دل میں اس خوف اور اندریشے کا شکار تھا کہ شاید اب بھی بٹ صاحب سے ملاقات ہو سکے یا نہ ہو سکے اور ان سے میں کیسے سامنا کر پاؤں گا۔ ضروری کار رواوی کے بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت ملی۔ مگر ایک مخصوص گیٹ سے اندر جانے سے پہلے ہماری نقدی، گھریاں اور دوسرا سامان جمع کر لیا گیا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ایک آدمی کو ٹھیٹ دیکھا تو میں نے غلام نبی کا ہاتھ پکڑ کر بے اختیار چلا یا کہ میں نے مقبول بٹ کو دیکھ لیا ہے اور پچھاں گیا ہوں۔ اگرچہ 1958 کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں ان کو

پہچان لیا۔ اس وقت انہوں نے سفید کھدر کی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اوپر ایک اچکن کوٹ براؤن کلر کا پہنا ہوا تھا۔ صحت اچھی تھی، شخصیت لکھری ہوئی تھی۔ موچھیں بڑھی ہوئی اور شیو کئے ہوئے تھے۔ سر کے بال سفید اور کالے تھے۔ میں 1958 کے بعد لگ بھگ پچیس برس بعد انہیں دیکھ رہا تھا۔ جو نبی ہم بارک کے صحن میں پہنچ تو فرط جذبات میں ان کے ساتھ لپٹ گئے۔ بٹ صاحب نے پہلے مجھے گلے لگایا پھر اپنے بھائی غلام نبی بٹ کو۔ یہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ جسے شاید میں لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ غلام نبی صاحب نے جب میرا تعارف کروایا تو فرمانے لگے ”ہاں میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ جب چھوٹا تھا پنگ بازی کے گر سکھنے کے لیے آیا کرتا تھا“۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ ہمیں اندر بارک نمبر 1 کے کمرے میں لے گئے۔ یہی شمال کی سمت پہلی بارک تھی۔ یہ ایک چھوٹے سائز کا کمرہ تھا جو سات سے آٹھ فٹ اونچا ہوگا۔ کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چکور سائبیل رکھا گیا تھا۔ پنگ لکڑی کا تھا کمرے کا فرش پختہ تھا۔ ایک برآمدہ نما کھلا کیچن تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی باتحر روم بھی تھا۔ کمرے کی چھت پختہ تھی۔ اس میں ایک چھوٹی سے کھڑکی تھی۔ جس کے بازو لوہے کے تھے۔ اور اندر کی طرف کھلتے تھے۔ باہر کے دوازے کو بازو لگے تھے۔ کمرے میں داخلے کے لیے دو ہر اور واژہ تھا جو دن کو کھلا رہتا اور رات کو جیل انتظامیہ کی طرف سے بند کر دیا جاتا۔

بٹ صاحب نے پہلے رشتہ داروں اور دوستوں عزیزوں کی خیریت دریافت کی۔ پھر دیگر تنظیمی دوستوں کا ذکر کرنے لگے۔ جن میں عبدالخالق انصاری صاحب، میر عبدالقیوم صاحب اور جی ایم لوں صاحب کا بطور خاص ذکر کیا۔

ہم نے کشمیری زبان میں بات چیت شروع کی۔ ہم نے انپکٹر کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے خود ہی کہا کہ چونکہ ہم آپس میں بات چیت کرتے ہوئے کشمیری زبان بولتے ہیں اس لیے اسے ہماری عادت یا مجبوری سمجھیں۔ کیا ہم اپنی مادری زبان میں بات کر سکتے ہیں۔ اس نے بڑے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں اجازت دی اور ساتھ ہی کہنے لگا ایسی کوئی بات نہیں، بٹ صاحب ہمارے دوست ہیں آپ بے شک اپنی مادری زبان میں بات چیت کریں۔ میں نے ان سے مقدمے کے بارے میں معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں مسلمان ہوں کہ اس وقت تک سزا پر عملدر آمد نہیں ہو

سکتا جب تک سارے قانونی تقاضے پورے نہیں ہو جاتے۔ پھر بھی ملزم کو اپنی صفائی میں بولنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ایسا بھی تک نہیں ہوا۔ اس لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی اگر مقدر میں یہی لکھا ہے تو اسے کوئی نہیں نال سکتا۔ میں ایسی موت کو خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ انسان نے بالآخر یہاں ہو کر یا کسی حادثے کا شکار ہو کر مرنा ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ انسان کسی عظیم مقصد کے لیے موت کو گلے لگائے ان کی یہ باتیں سن کر میرے آنسو نکل آئے تو عزم و ہمت کا وہ پیکر مجھے حوصلہ دیتے ہوئے فرمائے گے، ہو سکتا ہے میری شہادت ہی میرے کشمیر کی تقدیر بدل ڈالے۔

تحریک کشمیر کے حوالے سے جب بات چھڑگئی تو میں نے کہا ایک سوچ تھی کہ صرف ہندوستان کے خلاف جدوجہد کریں اور پاکستان کے حق میں آواز اٹھائی جائے، فرمانے لگے یہ کیفیت 1947 میں تھی۔ اب وقت بیت چکا ہے۔ بہت سے خالق کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ انہوں نے میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مختصرًا اپنے ساتھ حکومت پاکستان کی طرف سے ہونے والے غیر انسانی، غیر اخلاقی اور انسانیت سوز سلوک کی کچھ تفصیلات بیان کیں۔ پھر فرمانے لگے میں اس تیجے پر پہنچا ہوں کہ کشمیر ایک خود مختار ریاست ہو، ہم اپنے شخص سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے، فرمانے لگے اس کے لیے مسلح جدوجہد کرنا ہوگی۔ پر امن، روائی، سیاسی انداز میں کچھ نہیں ہو گا۔ خود مختار کشمیر ہی ہمارے مسائل کا حل ہے۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔ پاکستان ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ پاکستان ہمارے لیے نہ ماضی میں لڑا ہے اور نہ مستقبل میں لڑے گا۔ یہ جنگ ہماری ہے اور ہمیں خود ہی لڑنی ہے۔ انہوں نے 1965 میں صرف اپنے لاہور کو بچانے کی فکر کی۔ 1971 میں بنگال گنوا دیا۔ میں نے پوچھا اگر مسلح جدوجہد کریں تو وسائل کہاں سے آئیں گے، تو فرمانے لگے دیت نامیوں، فلسطینیوں اور الجزاًریوں کی طرح ہمیں بھی کہیں نہ کہیں سے مدد جائے گی۔ کراچی سے پشاور تک کتنے کشمیری ہیں۔ برطانیہ سے امریکہ تک کشمیری پہلے ہوئے ہیں وہ ہماری مدد ضرور کریں گے۔ ان کا موقف تھا کہ ہم ایک آزاد خود مختار ریاست کی شکل میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔

میں نے سوال کیا کہ آپ کو جب مزائے موت ہو چکی تھی تو پھر کیوں بھارتی مقبوضہ علاقتے

میں آئے، بولے ”اور کوئی آدمی آنے کو تیار نہیں تھا تو میں نے خود آنے کا فیصلہ کیا۔ اگر میری موت اسی جرم کی پاداش میں لکھی ہے تو ہستے ہوئے موت کو گلے لگاؤں گا۔ اگر میں سودا بازی کروں اور ہندوستان کے لائچ یا فریب میں آجائوں تو کل قوم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میری قربانی سے میری قوم جاگ اٹھے گی اور اس میں آزادی کا شعور آئیگا۔ یہ قربانی ضائع نہیں جائے گی۔ کم از کم یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ میں کسی کا ایجنت نہیں ہوں۔ گنگا طیارہ اغوا ہوا اور میں نے سیز فائر لائس کر اس کی تو مجھے ایجنت کہا گیا“۔ انہوں نے کہا ”آپ لوگ واپس جا کر میرا یہ پیغام آزادی پسند، محب وطن عوام تک پہنچادیں کہ وہ مسلسل جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے خود مختار کشمیر کے لیے جدوجہد کریں۔“

بٹ صاحب سے ان کے گھر یلو حالات پر بات چیت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ خط و کتابت کے ذریعے خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ بچوں کی مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے انہیں اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ بٹ صاحب کی گفتگو سے تھاڑ جیل کی بارک نمبر 1 کے اس کمرے کا ماحول نہایت سنجیدہ، جذباتی اور رقت آمیز ہو گیا تھا۔ میں اور غلام نبی اس ماحول میں رچ بس گئے تھے۔ میری نظریں ان کے چہرے کی لکیروں میں کھو گئیں۔ میں سوچنے لگا اتنا خوبصورت نوجوان اسے کیا واقعی پھانسی ہو جائے گی۔ وہ ہمیں مسلسل دلاسے دیتے رہے۔

جیل حکام نے مقبول بٹ کو چھوٹے موٹے کام کا ج کے لیے ایک ملازم بھی دیا ہوا تھا جو ہندوستان کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا اور کسی جرم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ اس کی عمر کوئی بیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ ان کو جیل میں اخبار بھی ملتے تھے جو پر ٹنڈٹن جیل کی وساطت سے آتے۔ انڈین ایکسپریس اور دہلی کا ہفت روزہ ”نئی دنیا“ اور بنگلور کا ہفت روزہ ”نشیمن“ ہم نے وہاں دیکھے۔ قرآن مجید بھی ان کے پاس غلاف میں لپٹا ہوا دیکھا۔ ایک بکس پڑا تھا جس میں کچھ کتابیں تھیں۔

ان کے بیڈ پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ رضاۓ رکھی تھی۔ کچھ میں کچھ برتن موجود تھے۔ کیونکہ وہ اپنا کھانا خود بناتے تھے۔ سودا سلف اپنا بازار سے منگواتے۔ ان کی شخصیت میں ایک رعب و دبدبہ تھا۔ اخراجات کے حوالے سے ان سے بات چیت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ برطانیہ سے کچھ احباب کے لیے جیل حکام کو کچھ رقم بھیجی ہے جس میں سے وہ حسب ضرورت مجھے دیتے رہتے ہیں۔

بٹ صاحب سے ہماری یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹوں تک مجب اتھی۔ جب ملاقات کا وقت فتح ہو گیا تو ہم نے اٹک بار آنکھوں سے ان سے رخصت چاہی۔ میں نے ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر وعدہ کیا کہ وقت آنے پر ہم کشمیر میں تحریک شروع کریں گے۔ انہوں نے وعدہ لیا کہ ہم کشمیر کی آزادی و خود مختاری کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ جس مقصد کے لیے میں مگر سے لگا تھا وہ مقصد میری موت کی وجہ سے ادھور انہیں رہنا چاہیے۔ انہوں نے فرمایا "غلامی سے بزدلی اور بے غیرتی جنم لیتی ہے۔ اگر متعدد اور متفق ہو کر قومی مقاصد کے لیے جدوجہد جاری رکھو گے تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن اپنی منزل مقصود تک ضرور پہنچ جاؤ گے"۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے مجھے گلے رکالیا۔ میں نے عقیدت کے طور پر اٹک بار آنکھوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چوہا۔ میرے بزرگ، میرے قائد نے مجھے دلا سادیتے ہوئے فرمایا "میرے مشن کو آگے بڑھانا اب آپ لوگوں کا فرض ہے۔ قوم کے لیے ہی جینا اور قوم کے لیے ہی مرننا سیکھیں" وہ یہ فرم رہے تھے کہ ہم ان سے رخصت ہو کر تہاڑ جیل سے باہر نکل آئے۔

میں اور غلام محمد ولی کاروبار کے سلسلے میں داخلی میں تھے۔ 6 فروری کو واپس گھر آئے۔ تین روز گزرے۔ اخبارات میں خبر پڑھی کہ مقبول بٹ کو 11 فروری کو تہاڑ جیل میں پھانسی دی جائے گی۔ یہ خبر ہم نے ریڈ یو پر بھی سن تھی۔ احتجاج شروع ہو گیا۔ 11 اور 12 فروری کو زبردست مظاہرے ہوئے 13 فروری کو ایک بہت بڑا جلوس دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے کپواڑہ تک آیا۔ جس میں عورتیں، بچے، بوڑھے، اور جوان بڑی تعداد میں شامل تھے۔ اس جلوس میں دس سال اور چھ سال کے بچے بھی شامل تھے۔ برف پڑی ہوئی تھی۔ کپواڑہ میں جلوس آنے کی خبر پھیلی تو پولیس نے دکانیں بند کر دیں۔ میں بنک آفیسر تھا لیکن چھٹی پر تھا میں نے پھر بھی اس جلوس میں شرکت کی۔ احتجاج کرنے والے سرکاری ملازمین کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مقبول بٹ کی شہادت میرے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھی۔ ان کی شہادت کے تین سال بعد میرا رابطہ ناظم الدین کے ذریعے مقبول بٹ کے دیرینہ رفیق کار اور لبریشن فرنٹ کے رکن مجید امجد بٹ سیا لکوٹ امنظفر آباد سے ہوا۔ مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے آر پار انہی روابط نے ایک نئی تحریک کو جنم دیا۔

(گفتگو: فروری 1994ء مظفر آباد)

اُس نے سردے دیا، سر جھکایا نہیں

امیں ایم افضل (سیکریٹری جزل JKLF)

میں اور مقبول بٹ شہید ایک ہی گاؤں تریہ گام سے تعلق رکھتے ہیں۔ بٹ صاحب کے والد غلام قادر بٹ بارہ مولہ سے آ کر تریہ گام میں آباد ہوئے تھے۔ وہ ہماری ہی دکان میں درزی کا کام کرتے تھے۔ اس لیے ان سے ہماری اچھی خاصی شناسائی تھی بلکہ گھر میں تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ غلام قادر بٹ بڑے زیر ک اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ وہ مزاحیہ طبیعت کے مالک تھے۔ ایک دفعہ گھر والوں نے انہیں میرے کپڑے سلانی کے لیے دیئے۔ میں نے کپڑے پہننے کے شوق میں روزانہ کی دکان پر پتا کرنے چلا جاتا۔ وہ مجھے کھجوریں اور پکوڑے کھانے کو دیتے۔ وہاں ایک احمد بیگ نامی آدمی تھا جو پکوڑے بیچتا تھا۔ اس کی اور غلام قادر بٹ کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے خوب ہنسی مذاق کرتے تھے۔ ایک روز غلام قادر بٹ نے مجھے کشیری زبان کا کوئی مصروع یا کہاوت یا و کروائی جس میں دکان میں مندہ پڑنے کا ذکر تھا کہنے لگے جاؤ احمد بیگ کو کھوا دھار پکوڑے دے دو۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے یہ شعر سنانا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو احمد بیگ میرے پیچھے بھاگا۔ آگے آیا تو قادر بٹ نے اسے کپڑلیا۔

ایک دفعہ قادر بٹ کی دکان پر ایک فاریسٹر آیا۔ قادر بٹ نے اس کی خیر خیریت دریافت کی تو اس نے بڑی بیزارگی کے عالم میں بتایا کہ مہنگائی کے سبب گوشت کھانا تو نصیب نہیں ہوتا۔ ہاکھ ٹر (ساگ کی ایک قسم) کھاتے کھاتے مر گئے ہیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ گوشت ناپید تھا۔ قادر بٹ نے اسے کہا کہ ہاکھ ٹر کو اگر مخصوص طرز پر پکائیں تو یہ بڑے مزے کا پکتا ہے۔ انہوں نے فاریسٹر کو کہا کہ جاؤ مجھے ہاکھ ٹر لاد دیں آپ کو پکوا کے دیتا ہوں۔ اگلے دن فاریسٹر بوری بھر کے لے آیا۔ کھانے کا وقت آیا تو پکے ہوئے ہاکھ ٹر کا تقاضا کیا۔ قادر بٹ نے اسے بتایا کہ وہ ہاکھ ٹر تو خراب تھا۔ پکانے کے

قابل نہیں تھا۔ میری بکری بھوکی تھی میں نے اسے کھلادیا۔

غلام قادر بٹ کے گھروالوں سے ہماری قربت تھی۔ 66 میں جب بٹ صاحب گرفتار ہوئے تو پولیس نے ان کے گھر پر دھاوا بول کر بٹ صاحب کے والد اور بھائی غلام نبی کو گرفتار کر لیا۔ باقی بھائی ابھی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مقبول بٹ کے چچا خضر محمد بٹ ناپینا تھے۔ وہ بچوں کی رکھوائی کے لیے ان کے گھر آگئے۔ پولیس نے مقبول بٹ کے بارے سارے علاقے میں دہشت پھیلا دی۔ کوئی بھی ہمسایہ ان کے گھر نہیں جاتا تھا۔ ان حالات میں زیادہ ذمہ داری ہم پر آن پڑی۔ ہم ان کے گھر جاتے اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔ ہم سب خوف کے مارے جا گتے رہتے تھے۔ نیند نہیں آتی تھی۔ خضر بٹ کو ہزار داستان زبانی یاد تھی۔ وہ ہمیں رات بھرا پنے پاس بٹھا کر کہانیاں سناتے رہتے۔ آہستہ آہستہ دیگر ہم سے بھی آنے لگے اور گھر سے خوف کا ماحول کم ہو گیا۔ غلام قادر بٹ اور ان کے بیٹے غلام نبی بٹ کو دواڑھائی ماہ بعد رہائی ملی۔ ایک دفعہ غلام نبی بٹ اداس اداس بیٹھے تھے میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگے ہمارے ایم۔ ایل۔ اے میاں یونس تریہ گام آرہے تھے۔ میں نے راستے میں سلام کیا اور ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے مجھ سے ہاتھ ملانا گوارہ نہ کیا۔ ساتھ دوسرے آدمی کو کہا کہ اسے بتاؤ کہ آئندہ وہ مجھے سلام نہ کرے۔ سیاسی و مذہبی ٹھیکیداروں نے ان کی فیملی کا سوشل بائیکاٹ کرنے رکھا۔ غلام نبی بٹ نے بتایا کہ ایس پی عبدالحمید لوں مقبول بٹ کی اثر و گیش پر مامور تھے۔ وہ تریہ گام میں تھانیدارہ چکے تھے اور مقبول بٹ کی فیملی کو جانتے تھے۔ میں ان سے ملنے سری گران کی رہائش گاہ پر گیا اور بھائی سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو ایس پی غصے میں آگیا۔ اور مجھے اسی وقت گھر سے نکل جانے کو کہا۔ بلکہ آئندہ اس غرض سے آنے سے منع کر دیا۔ مجھے پچھلے دروازے سے باہر نکلا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔

دہاں سے نکل کر غلام نبی بٹ ڈی ایس پی رشید کے پاس پہنچے۔ انہوں نے گھر کے اندر بٹھانے کے بجائے باہر لان میں بٹھائے رکھا اور رات کو باہر لان میں ہی سو جانے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ صبح سویرے اذان ہونے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔

چنانچہ غلام نبی بٹ نے دہاں رات گزاری اور صبح منہ اندھیرے وہاں سے نکل گئے۔ دن

چڑھاتو ہائی کورٹ بار میں چلے گئے وہ اپنے گاؤں کے وکیل عبدالغنی لوں سے ملے۔ ان سے کیس کی پیروی کے سلسلے میں درخواست کی۔ لوں اینڈ کمپنی نے مشورہ کیا اور طے پایا کہ اگر مقبول بٹ کا کیس لڑیں گے تو ہندوستان ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرے گا۔ چنانچہ لوں صاحب نے کشمیر کے نامور وکیل اور سابق وزیر قانون پیارے لعل ہندو کو آمادہ کیا کہ وہ مقبول بٹ کے کیس کی پیروی کریں۔ پیارے لعل ہندو کی کوشش سے ہی وہ بھائی سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دراصل کیس لوں اینڈ کمپنی ہی لڑ رہی تھی بظاہر پیروی پیارے لعل ہندو کر رہے تھے۔ تریہ گام میں یہی تاثر تھا کہ عبدالغنی لوں ہی مقبول بٹ کے کیس کی پیروی کر رہے ہیں۔ لوں صاحب نے اسے اپنا ذاتی کیس سمجھ کر لڑا۔ لیکن جب مقبول بٹ سری گنجیل سے بھاگ نکلتے تو تریہ گام میں ایک قیامت ٹوٹ پڑی چھاپے مارے گئے اور والد اور بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔

ع مجھ پر ٹوٹ پڑا سارا شہر نا بینا

بٹ صاحب کی سری گنجیل سے فرار ہونے کی کہانی تریہ گام کے گھروں میں لوک کہانیوں کی صورت اختیار کر گئی۔

1971 میں جب گنگا طیارہ اغا ہوا تو ایک بار پھر مقبول بٹ کا نام زبانِ زدِ عام ہوا۔ ہائی جیکنگ کے واقعہ نے ہمارے حوصلے بلند کر دیئے۔

بٹ صاحب جب سری گنجیل سے فرار ہوئے تو ان کے بارے لوگوں کا تاثر بدل گیا۔ وہ انہیں ایک دلیر اور بہادر انسان سمجھنے لگے۔ ان کا چھاپاں سے ملنے پا کستان آنا چاہتا تھا۔ لیکن اجازت نہ ملی۔ گنگا طیارے کے اغا کے بعد بٹ صاحب اپنے گاؤں تریہ گام میں ہیر و کی حیثیت اختیار کر گئے۔ کل تک جو لوگ ان کے والد صاحب کو طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔ وہ اب ان کے سامنے دوز اُنہوں کو بیٹھتے اور مقبول بٹ کے بچپن اور ماضی کے بارے میں سوالات کرتے۔

مقبول بٹ نے تریہ گام میں سکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہاں ان کے کلاس فیلوز میں ماشر محمد سکندر، ماشر دل محمد، محمد سکندر ملک، محمد عبداللہ اور مولانا یوسف مسعودی نمایاں لوگ تھے۔ بعد میں یہ لوگ نمایاں عہدوں تک پہنچے۔

و گر سکول فیلوز میں پیپلز کافنفرس کے راہنماء خواجہ عبدالغنی لون (یہ بٹ صاحب سے عمر میں دو سال بڑے تھے) ملک غلام رسول شہید (سابق ممبر راجیہ سبھا)، محاذ رائے شماری کے سابق صدر اور شیخ عبداللہ کی کابینہ کے سابق وزیر میر غلام قادر نما یاں تھے۔

تریہ گام میں اب بٹ صاحب کے حوالے سے بس یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ بٹ صاحب سکول کے زمانے میں بہت ذہین طالب علم مانے جاتے تھے۔ ذہانت اور شکل و صورت کی وجہ سے وہ اپنے اساتذہ اور کلاس فیلوز میں ہر دعزیز تھے۔ بتاتے ہیں کہ ہمیڈ ماسٹر محمد امین اکثر ویشتر ان کے مستقبل کے بارے اچھے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ تریہ گام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ گاؤں میں انڈیں آری کا ایک کیمپ تھا۔ وہ یونٹ ڈے کے موقع پر تریہ گام سکول کے بچوں کو دعوت دیتے اور ان کو کھیل و تفریح کے موقع بھی مہیا کرتے۔ چنانچہ آرمی کی دعوت پر سارے سکول کے بچے اس تقریب میں چلے گئے۔ بٹ صاحب ابھی تیسری کلاس میں تھے۔ بٹ صاحب نے اپنی نظریں بھارتی جزل پر مرکوز کئے رکھیں اور گھور گھور کر اسے مسلسل دیکھتے رہے۔ جزل بھی تازگی کا یہ بچہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ نہ مقبول کو مناسب کر کے کہنے لگا۔ "بینا آپ کے عزائم کچھ خطرناک لکتے ہیں بڑے ہو کر اچھے کام کرنا"

میڑک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ بارہ مولہ چلے گئے۔ تریہ گام میں جن دنوں وہ جماعتِ اسلامی کے سکول میں ٹیچر تھے انہوں نے کشیر کی آزادی کے حوالے سے بچوں کا ایک پروگرام منعقد کر دیا۔ جہاں تک میں نے مقبول بٹ کی شخصیت کا احاطہ کیا ہے یہ ایک وطن کے سچے عاشق اور جدوجہد آزادی کے سپاہی کا سراپا نظر آتا ہے۔ جس کے بظاہر دورنگ دیکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اگر وطن پرستی اور حق پرستی کی عینک سے دیکھا جائے تو ان میں باطنی ہم آہنگی چھلتی نظر آتی ہے۔ عشق کی بیقراری اور جس کو کبھی سپاہی کا عزم و حوصلہ سہارا دیتا ہے اور کبھی سپاہیانہ جدوجہد کو عشق جلا بخشتا ہے۔ کبھی ان کی صبح وطن کی عظمت و وقار کے لیے سامراجی قوتوں کے خلاف میدان کارزار میں طلوع ہوتی ہے۔ کبھی ان کا سورج کسی سامراجی جیل خانے کے اندر موٹی موٹی آہنی سلاخوں کے پیچھے دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت بھیثیت عاشق اور بھیثیت سپاہی ان کی جدوجہد کتنی کمٹھن دکھائی دیتی ہے۔ عشق کی وادی میں وہ آبلہ پا چلتا



رہا اور سپاہیانہ جدوجہد کے سامنے میں اس نے کانٹوں پر راتیں بسر کیں۔ اس راہ رو منزل کو دیکھتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ اسے توزیت کے ماہ و سال میں کہیں بیٹھنے، آرام کرنے اور ستانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ حالات و اتفاقات کی گھمبیرتا، حادثات کی گھسنگی، ہمسفروں کی کوتاہ نظری اور ایک برادر مسلم پڑوی کی تنگ دلی و تنگ نظری کے باوجود اس نے اپنی باریک بین نگاہوں سے اپنی منزل کو اوجھل نہ ہونے دیا۔ اپنی نکرناو اور تازہ لہو کی بہار سے وہ پوری قوم کو جگا گیا۔ اس نے دہلی کی تہاڑ جیل میں اپنی جان جان آفریں کے پر درکر کے منزل کا واضح تعین کر دیا۔ اب اس منزل کو کوئی سامراجی قوت دھندا نہیں سکتی۔

مقبول بٹ نے تہاڑ جیل میں تیرہ سالہ اسیری کے بعد چھانسی کے پھندے کو چوتے ہوئے جس چراغ راہ کو روشن کیا وہ اب ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کی منزل مراد ہے۔ کوئی غاصب اور منافق اب اس سنگ میل پر غلامی کا عنوان چپا نہیں کر سکے گا۔ انشاء اللہ شہید کشمیر کی امنگوں اور آرزوں کی تیکمیل ہو گی اور کشمیر آزاد خود مختار اور خوشحال ہو گا۔

(گفتگو: 24-02-1994 مظفر آباد)



ظلمت شب میں روشن چسرا غ

پرویز میر (مری)

ہم لوگ مری میں رہائش پذیر ہیں۔ 1947 میں والدین کشمیر سے بھرت کر کے آگئے۔ پہلے مظفر آباد اور پھر مری میں سلسلہ کار و بار آباد ہوئے۔ میرے والدین کشمیری طرز کی کشیدہ کاری کے ماہر تھے۔ مری میں ان کی دکان تھی۔ میں 1974 میں ایف۔ اے کا طالب علم تھا۔ ان دنوں محاذ رائے شماری کے زیر اہتمام مری میں ایک جلسہ عام ہوا۔ جس میں مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی تشریف لائے۔ بٹ صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ LONTTON کیفے میں منعقدہ یہ تقریب مری میں رہائش پذیر کشمیریوں کا عظیم الشان اجتماع تھا۔ مقبول بٹ اور فاروق عبداللہ دونوں کو سننے کے لیے عوام کا جم غیر جمع تھا۔ مقبول بٹ شہید کی تقریب کا جو تاشاب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ تبھی تھا کہ کشمیریوں کو اپنی جدوجہد آزادی اپنی قوت بازو کے بھروسے پر لڑنی چاہیے۔ تب ہی منزل سکتی ہے۔ مقبول بٹ شہید کو میں نے اسی جلسہ عام میں پہلی بار دیکھا۔

مجھے مقبول بٹ شہید سے ملنے کا دوسرا بار اتفاق اس وقت ہوا جب وہ 1975 میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کے سلسلہ میں مری تشریف لائے۔ وہ شلوار قمیں اور وا سک پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک معمولی سابریف کیس اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ ایک کارز مینگ کے سلسلے میں بانسری گلی کشمیری محلہ میں گئے۔ مری میں حلقة پانچ وادی کی نشت سے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے رہے تھے۔ مری میں وہ جہاں جہاں بھی گئے لوگوں سے دوست مانگنے کے بجائے کلمیاً تحریک آزادی کشمیر کے موضوع پر بات کرتے۔ اپنی تقاریر میں وہ کہتے کہ میرا مقصد ایکشن لڑکر اسمبلی کے ممبر یا وزیر بننا نہیں بلکہ اس مہم کے ذریعے میں آپ لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے آیا ہوں اور میرا پیغام آزادی ہے۔ ہماری منزل اقتدار نہیں بلکہ آزادی ہے۔ اور ہم اس وقت

تک ہر محاذ پر لڑتے رہیں گے جب تک ہمیں آزادی نہیں مل جاتی۔ ایکشن بھی ایک راستہ ہے۔ ہم جمہوری جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ میری جماعت نے مجھے اس راہ کو اختیار کرنے کی منظوری دی۔ اس لیے میں ایکشن کے میدان میں اتراؤں۔

مری میں بٹ صاحب ایک مینگ سے خطاب کر رہے تھے۔ تحریک آزادی کشمیر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے فرمائے گئے کشمیریوں کے ساتھ بزدلی کا جو داغ لگا ہوا ہے، ہم اس داغ کو دھونا چاہتے ہیں۔ اگر چند پر عزم نوجوان میرے ساتھ چلنے کا عزم کر لیں تو ہم یہ داغ دھو سکتے ہیں۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ کشمیر کی آزادی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ چند آدمیوں کے بس کی بات نہیں، پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ چند آدمی اس بزدلی کا داغ دھو سکتے ہیں۔ بٹ صاحب نے کہا "میرے ساتھی اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہیں۔ ان کا مقصد جدوجہد ہو گا اور جو لوگ جدوجہد کرتے ہیں وہ عزم و ہمت کا نشان بن جاتے ہیں۔ ساری قوم ان ہی کی جدوجہد کے طفیل عزت و آزادی کا مقام حاصل کرتی ہے۔"

مقبول بٹ شہید سے میری دوسری اور آخری ملاقات تھی۔ اگرچہ میں اس وقت تحریک آزادی میں فعال کردار ادا نہیں کر رہا تھا۔ لیکن اب بھی مقبول بٹ کا چہرہ سامنے آتا ہے تو ان کے چہرے کی تڑپ اور مچلتا ہوا کرب واضح نظر آتا ہے۔ یہ تڑپ اور کرب میں نے آج تک کسی کشمیری کے چہرے پر نہیں دیکھا۔ بعد ازاں کشمیر کی حالیہ جدوجہد آزادی کے دوران بھی میں ہزاروں مجاہدوں اور شہیدوں سے مل چکا۔ بڑے بڑے پر عزم اور باہمتوں نوجوانوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ لیکن جو ہمت، استقامت اور تڑپ مقبول بٹ کے چہرے میں مجھے نظر آئی وہ کہیں اور دیکھنے کو نہ ملی۔ مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ مقبول بٹ انسانی صورت میں کوئی دیوتا تھا یا فرشتہ تھا۔

آج مقبول بٹ بظاہر ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کے خیالات، جذبات، احساسات، نظریات اور عقائد ہمارے سینوں میں موجز ہیں۔ ان کے مداح اور نظریاتی ساتھی جگہ جگہ مصروف عمل ہیں۔ ان کے شیدائی وادی کشمیر، آزاد کشمیر، پاکستان، برطانیہ، امریکہ، ہالینڈ، جرمنی، مڈل ایسٹ الغرض دنیا کے بے شمار ممالک میں سرگرم عمل ہیں۔ اب وہ دن دو نہیں جب غلامی اور رسولی کی زنجیریں نوٹ جائیں گی اور آزادی کا حقیقی سورج طلوع ہو گا۔

آج بھارتی مقبوسة کشمیر اور آزاد کشمیر کے نوجوان مقبول بٹ شہید کے راستے پر گامزناں ہیں
انہوں نے بھارتی سامراجی تسلط کے خلاف مسلح جدوجہد کا علم بلند کیا ہے۔ طبل جنگ نئے چکا ہے۔ مری
نگر کے بازاروں، گیوں اور دیگر مقامات پر جدوجہد جاری ہے اور ہر روز ہمارے سیکڑوں مجاہد مقبول
بٹ، اعجازِ ذار، معراج الدین اور اورنگزیب شہید کی راہ پر چل کر اپنے وطن کی ناموس اور آزادی کے
لیے قربان ہو رہے ہیں۔ انشاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب وطن کے سینے سے یہ خونی اور مصنوعی لکیر من
جائے گی اور ہمارا پیارا وطن کشمیر آزاد ہو کر دنیا کے نقشے پر ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ ابھرے
گا اور مقبول بٹ شہید نے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ فتح و کامرانی سے ہمکنار ہو گا۔ یہ فتح صرف اور صرف
مقبول بٹ شہید کے نام سے لکھی جائے گی کیونکہ انہوں نے فتحِ مندِ جدوجہد کی ابتداء کی تھی۔

تمہی سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جوموت ہے وہ قوم کی حیات ہے

(گفتگو: 1994ء میں)



مکتوب

مئی 1995 لندن

عزیزم سعید اسعد صاحب،

السلام علیکم!

امید ہے بخوبیت ہو گے۔

آپ کا خط ملے بہت دن ہوئے۔ جواب جلدی نہ دے سکا۔ مغدرت چاہتا ہوں۔

آپ کے خط کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن مقبول بٹ شہید کے ساتھ بس رکھ کر ہوئے لمحات کی تلاش میں بھتلکنا شروع ہو گیا۔ کبھی تو شہید کی شخصیت تصور میں آ کر ضمیر کو جھنجور رہی تھی کہ تم سب تحریک آزادی کے لیے اپنے فرائض کو اچھی طرح سرانجام نہیں دے رہے ہو اور کبھی مقبول بٹ شہید کی رو خ مجھے جیسے کئی اور ساتھیوں کی پیٹھ پرشاباش کی تھیکیاں دے رہی تھی۔ گو کہ ان جانشاروں کی قربانیوں کے مقابلے میں ہم عشر عشیر بھی نہیں۔ جنہوں نے اپنی ماڈل بہنوں کی عصمت تک راہ آزادی میں پختہ اور کر دی۔ جان عزیز کا نذرانہ پیش کر کے شمع آزادی کو جلا دی۔ بہر حال ایک طرف سے ضمیر مطمئن ہے کہ اس شمع آزادی کو جلانے میں مجھے جیسے ناچیز کا بھی حصہ ہے۔ میرے عزیز! غالباً 18 جنوری 1980 کا دن تھا جب مجھے مقبول بٹ شہید سے دہلی تھاڑ جیل میں جیل حکام سے کافی لے دے کے بعد اسٹنٹ پر شنڈنٹ جیل، حوالدار پولیس اور دو سپاہیوں کے ساتھ مجھے اس کاں کوٹھڑی کی طرف لے جایا گیا جس میں تحریک آزادی کشیر کا وہ شیر بند تھا جسکی جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کی بدولت آج ہر کشیری نے مادریطن کی آزادی کے لیے اپناسب کچھ لانا باعث فخر تصور کر لیا ہے۔ میری آمد کی خبر تھوڑی دیر قبل غالباً

رام نے اپریل 1995 کو ملک غلام سرور صاحب کو برطانیہ خط لکھ کر ایک سوال نامہ ہمراہ بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے رام کو یہ خط ارسال کیا تھا جس میں مقبول بٹ شہید سے تھاڑ جیل دہلی میں ہونے والی ملاقات کی یادیں قلم بند کی ہیں۔ یہ مکتوب ہو بہوشمال اشاعت کیا گیا ہے۔

بٹ صاحب کو دے دی گئی تھی کیونکہ جو نہیں میں کال کوٹھری کے سامنے ہوا تو بٹ صاحب کو آ ہیں
سلاخوں کے پیچھے منتظر پایا۔ وہ قیدی لباس میں ملبوس آ ہیں سلاخوں کے پیچھے کھڑے تھے کہ میں جیل
حکام کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ان کے قریب جا کر سلاخوں سے باہر نکلے ہوئے مقبول بٹ کے ہاتھوں
سے مصافحہ کیا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ ہیں سلاخوں کی حائل دیوار کے دونوں طرف
بینھے گئے۔ ۲۵ منٹ کی اس طویل ملاقات کے دوران تحریک اور تنظیم کے حوالے سے تفصیلًا گفتگو کے
دوران جو باتیں ان سے ہوئیں وہ یہ ہیں۔۔

آن دنوں میں ہمارے نظریاتی خلافین کا یہ پروپیگنڈہ تھا کہ مقبول بٹ مذہب اسلام سے
مخرف ہے تو میں نے انہیں سوال کیا کہ بٹ صاحب آپ کو چار پانچ سال ہو گئے ہیں اسیрی میں اس
تہائی میں آپ کس کو تہائی کا ساتھی رکھتے ہیں تو ان کا جواب یہ تھا کہ "اس تہائی میں اللہ اور اس کے
رسول ﷺ میرے ساتھی ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس طویل اسیری کے دوران قرآن پاک کی
تفسیر کا مطالعہ نصیب ہوا" میں نے پھر بٹ صاحب سے زندگی کے تناہی شباب و روز کا ذکر کیا تو کہنے لگے
"جو لوگ عظیم مقاصد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں ان کے لیے جیل کے اندر رہنا اور باہر رہنا کوئی معنی
نہیں رکھتا" بٹ صاحب نے دوران ملاقات زیادہ تر تحریک آزادی کے متعلق باتیں کرنا ہی مناسب سمجھا
۔ اکثر تنظیمی ساتھیوں کے بارے میں دریافت کیا اور صرف اپنے چھوٹے بیٹے شوکت کی تعلیم کے بارے
میں معلوم کیا۔ بٹ صاحب سے میرے اس سوال کرنے پر کہ کشمیری قوم پر کچھ اس طرح آزادی کے
حوالے سے بے حصی چھائی ہوئی ہے تو آپ کہنے لگے کہ میرے ساتھیوں سے کہہ دینا کہ گھبرا نے کی کوئی
بات نہیں انشاء اللہ بہت جلد وادی کشمیر سے ایک چنگاری اٹھے گی اور آنا فنا سارے کشمیر کو اپنی لپیٹ
تیں لے کر ہر کشمیری کو جذب آزادی سے سرشار کرے گی۔

آخر میں شہید کشمیر نے اپنے رفقاء کے لیے پیغام دیتے ہوئے کہا "کہ میرے بارے میں
کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری موت صرف اس دن ہو گی جس دن میرے ساتھیوں نے
حوالے ہار دیئے" بٹ صاحب کے یہ آخری الفاظ سینے میں رکھ کر اور ہمت باندھ کر ان سے رخصت
ہونے کے لیے اجازت چاہی۔ آ ہی سلاخوں کے سامنے سے اٹھ کر ہم دونوں نے جب مصافحہ کیا تو

بٹ صاحب کے چہرے سے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ راولپنڈی صدر سے مجھے لندن آنے کے لیے رخصت کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے تاثرات ہرگز کال کوٹھری میں محسوس قیدی جیسے نہ تھے۔ آج کم و بیش ۱۵ سال کا عرصہ ہوا ہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ بٹ صاحب سے چند دن پہلے ملاقات ہوئی۔ جو خطوط آپ کو امان صاحب نے دیئے ان کے علاوہ بٹ صاحب نے مجھے اور کوئی خط نہیں لکھا۔ برطانیہ میں میری دانست میں اور کسی کے پاس ان کے خطوط نہیں۔

سعید اسعد صاحب! مقبول بٹ شہید نے نواسہ رسول ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہو کر فرض منصبی ادا کرتے ہوئے کشمیری قوم کو اقوام عالم میں باوقار مقام دلانے کے لیے مشعل راہ کا کردار ادا کر دیا اور آخرت کے لیے شہدا کی صفت میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم کہاں تک عملی طور پر حسب توفیق وطن کی آزادی کے لیے کچھ کر رہے ہیں۔

آپ نے میرے تعارف کا ذکر کیا تو میرا تعلق کوئی سے ہے۔ میرے والد صاحب مرحوم برش آرمی سے ۱۹۳۲ میں ریٹائر جو نیز کمیشنڈ آفیسر تھے۔ ۱۹۳۷ میں انہوں نے کشمیر کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جو ہم دونوں بھائیوں کو ورثہ میں ملا۔ میرا چھوٹا بھائی اصغر ملک ایڈوکیٹ ہے۔ جو ۱۹۴۷ سے مقبول بٹ کے ساتھیوں میں سے ہے۔ جموں کشمیر بریشن فرنٹ کی جب برطانیہ میں بنیاد ڈالی گئی تو اس ناچیز کو بھی بانی ارکان میں سے ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

آخر میں آپ جیسے نوجوانوں سے یہی التماس ہے کہ کشمیری قوم کو مادر وطن کی آزادی کے حصول کے لیے ہر ممکن تیار کرنے کی کوشش میں لگے رہو۔ پچاس ہزار کشمیریوں کا خون، کئی ماوں بہنوں کی لڑی عصمتیں انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائیں گی اور اگر ہم نہ بھی دیکھ سکے تو ہماری اولاد میں ضرور کشمیر کو ایک آزاد اور خود مختار ملک دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

غلام سرور (برطانیہ)



مقبول بٹ سے ایک یادگار ملاقات

سید عبدالرشید بخاری (جی سیداں ضلع حوالی)

میں پاکستان آرمی میں ملازمت کرتا تھا۔ ان دونوں لاہور میں تعینات تھا۔ گنگا کیس سے بٹ صاحب رہا ہو چکے تھے۔ کشمیری ہونے کی بحیثیت سے میں بھی ان خبروں میں دلچسپی لیتا تھا۔ تیزاب احاطہ لاہور کی کشمیری براذری نے بٹ صاحب کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ میرا ایک دوست رانا عثمان مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ کشمیری مہاجر تھا اور لیبرلیڈر تھا۔ رانا ٹاؤن میں رہتا تھا۔ میری اس سے علیک سلیک تھی۔

مقبول بٹ کے ہمراہ غلام نبی سوز، ملک زبیر زخمی، سید سعید شاہ نازکی، نیم اون اور مولوی مقبول وغیرہ تھے۔ انہوں نے کریم کلر کی شلوار قمیں پہنی ہوئی تھی اور بلیک واسکٹ زیب تن کئے تھے۔ اس تقریب میں پچیس، تیس لوگ موجود تھے۔ یہ تقریب ایک گھر کے اندر تھی۔ صحافی حضرات اور کشمیری طلباء اس میں موجود تھے۔ بٹ صاحب نے صحافیوں اور طلباء سے جوبات چیت کی وہ اب بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ طلباء کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ فرمائے تھے۔ "ویکھیں بھائی بعض قومیں جوزوال پذیر ہو گئیں اور دنیا کے نقشے سے مت گئیں ہمیں ان کی تاریخ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ ہماری ریاست کے لوگ اس وقت غفلت اور لا پرواہی کی زندگی گزار دے ہے ہیں۔ ہم جوبات کہہ رہے ہیں وہ انہیں سمجھنہیں آرہی۔ آنے والا کل ہمارے لیے بہت بڑے مسائل لے کر آئے گا۔ بحیثیت کشمیری ہماری شناخت ختم ہو رہی ہے۔ انڈیا اور پاکستان دونوں کی کوشش ہے کہ کشمیریت کی شناخت ختم کر دی جائے اور کشمیری لوگ اپنے ماضی کو بھول جائیں۔ ہماری تاریخ بھی ہم سے چھین لی گئی ہے۔ ہم آزاد کشمیر کو ایوبی دور تک تو آزاد سمجھتے رہے لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ یہ بھی غلامی کی ایک بہترین شکل ہے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کو بھی بیدار ہونا ہو گا اور حقیقی آزادی کے لیے میدان عمل میں

اترنا ہوگا۔ یہ بات جو آج میں کہہ رہا ہوں یہ آپ نوجوانوں کو سمجھ آجائی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جائیں تو ہمیں پاکستانی ایجنت نہ سمجھیں اور اگر ہم آزاد کشمیر میں آئیں تو پاکستان ہمیں بھارتی جاسوس نہ سمجھے۔

انہوں نے طلباء کو کشمیر کی تاریخ اور قدرتی وسائل کے حوالے سے بھی تفصیلی معلومات فراہم کیں اور ریاست کی آزادی کے تصور کو اجاگر کیا۔

اس موقع پر میں نے بٹ صاحب سے سوال کیا کہ یہاں پاکستان میں ہم کشمیریوں کو طعنہ دیا جاتا ہے "آپ تپسی تے ٹھس کرسی" کیا بھارت میں بھی کشمیریوں کو اس طرح کا طعنہ دیا جاتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ بھارت میں ہمیں یہ بات کبھی سننے کو نہیں ملی۔ البتہ ان دوران بھارت جائیں تو کشمیریوں کے گلے میں پڑی ہوئی رسی ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ وہاں ہمارے لوگ "پانڈی" کہلاتے ہیں۔ میں یہ رسی قوم کے گلے سے اتنا رنا چاہتا ہوں۔ بھارت میں ہمیں اس طرح حقارت سے نہیں دیکھا جاتا۔ بھارت کے خلاف ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ اس نے ہمیں حق خود ارادیت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس نے پورا نہیں کیا۔

رانا عثمان نے بھی بٹ صاحب سے پاکستان میں موجود کشمیر پر اپنی کا سوال کرتے ہوئے اپنا موقف واضح کیا کہ پاکستان یہ پر اپنی کشمیریوں کو دے تا کہ کشمیری یہاں آباد ہو سکیں۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بٹ صاحب نے فرمایا کہ "کشمیر پر اپنی ریاست کا حق ہے اس کا مفاد ریاست کو مانا چاہیے، مہاجرین یہاں گھر بسانے اور مستقل آباد ہونے نہیں آئے تھے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہم کشمیر کو آزاد کرائیں اور ہمارے کشمیری بھائی واپس اپنے وطن میں آ کر آباد ہوں۔ ہم سب بے بائے گھر چھوڑ کر آزادی کی تلاش میں آنکھے ہیں۔ لہذا آزادی ہی ہمارا مشن ہے"

میں بٹ صاحب کے پیچے بیٹھا ہوا تھا۔ پہلو میں ان کا بریف کیس پڑا تھا۔ جس پر ایک نوٹ بک اور ٹوپی پڑی تھی۔ یہ سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی جو بٹ صاحب پہنتے تھے۔ میں نے ٹوپی ہاتھ میں لی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ رانا عثمان صاحب نے کہا کہ رکھ دو یہ بٹ صاحب کی ٹوپی ہے۔ ٹوپی کی اندر ورنی سائیڈ میں ایک انسانی آنکھ بنی ہوئی تھی جو مجھے بہت اچھی لگی۔ بات چیت سے فارغ ہوئے تو میں نے

بٹ صاحب سے پوچھا کہ یہ ٹوپی تختے میں مل سکتی ہے۔ میں نے بتایا کہ میں فوج میں ہوں۔ یہ ٹوپی مجھے اچھی لگتی ہے۔ اگر ممکن ہو تو مجھے عنایت فرمادیں۔ فرمائے گے "آپ میری طرف سے یہ ٹوپی رکھ لیں۔ لیکن آپ کو یہ بہت مہنگی پڑے گی کیونکہ اس نے عدالت کے کئی کٹھرے اور جیلیں دیکھی ہیں" انہوں نے بتایا کہ نیل کٹھنگوں کی عدالت میں بھی انہوں نے یہی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے یہ تختہ دے دیا۔ میں نے اسے نہایت سنبھال کر رکھا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اس تاریخی ٹوپی کو کسی خاص موقع پر استعمال کیا جائے لیکن افسوس 2005 کے زلزلے میں میرے گھر جب سیداں ضلع حولی میں شارٹ سرکٹ ہوا جس سے گھر میں آگ لگ گئی۔ اس سانحے میں یہ ٹوپی اور دیگر قیمتی دستاویزات بھی جل گئیں۔

کشمیری قہوہ کا دور چلا۔ ہاشم قریشی کی رہائی کے سلسلے میں ان راہنماؤں نے آپس میں بات چیت بھی کی اور محفل برخاست ہو گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی یہ محفل تھی۔

جب 1976 میں مقبول بٹ بھارتی مقبوضہ کشمیر گئے اور وہاں گرفتار ہوئے اس وقت میں آرمی میں ملازمت کرتا تھا۔ یہ خبر میں نے اخبارات میں پڑھی۔ افسوس ہوا۔

(گفتگو: 24-12-2016 کہوٹہ حولی)



مسیر کاروال تھا وہ.....

خواجہ نذیر احمد (پاک واقعہ اس مظفر آباد)

میرے والد خواجہ غلام رسول مسلم کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ انھیں 1948 میں جموں جبل سے رہا کر کے جلاوطن کرتے ہوئے پاکستان بھیج دیا گیا۔ وہ مظفر آباد آ کر آباد ہو گئے۔ بعد ازاں چوبھری غلام عباس کی کوششوں سے میں، بڑے بھائی اور والدہ بھی ترک سکونت کر کے والد صاحب کے پاس آگئے۔ جب ہوش سنبھالا اور سیاسی سوجھ بوجھ کے قابل ہوا تو میں بھی مسلم کانفرنس سے واپسیتہ ہو گیا۔ کشمیر میں لفتح تنظیم کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ اس تناظر میں مقبول بٹ کا نام بھی سننے میں آرہا تھا۔

1966 میں مظفر آباد میں محاذ رائے شماری کا مرکزی کنوشنا تھا۔ اس موقع پر محاذ کے قائدین کی تقاریر اور خیالات سن کر میں نے بھی محاذ رائے شماری میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ خالی تقاریر سے کشمیر آزاد نہیں ہو گا۔ مسلم کانفرنس کے پاس کشمیر کی آزادی کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بٹ صاحب اور ان کے ساتھیوں یعنی محاذ رائے شماری کا پروگرام مجھے اچھا لگا اور آزادی کی کرن نظر آئی۔ چنانچہ خاندانی وابستگی اور عزیز واقارب کی ناراضگیاں مولے کر میں نے محاذ میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں نے والد صاحب اور عزیز واقارب کو بتایا کہ یہ ایک اصول کی بات ہے۔ مسلم کانفرنس کے پاس کوئی نظریہ یا اصول نہیں رہا۔ یہ اب ٹھیکیداروں، لوٹ ماروں اور مفاد پرستوں کی جماعت بن گئی ہے اس لیے اب اس جماعت کے ساتھ چلنا ممکن نہیں رہا۔

محاذ کے کنوشنا کا ماحول بڑا جذبائی تھا۔ پتا چل رہا تھا کہ آزادی چاہئے والے سچے اور مغلص لوگ ہیں۔ بہت بڑا جمیں غیر تھا۔ اس وقت بٹ صاحب سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ البتہ انہوں نے اپنی تقریر میں ہم نے شامل ہونے والوں کو مبارکہ اور امید ظاہر کی کہ ہم لوگ تنظیم کے

لیے بہتر انداز میں کام کریں گے۔ ہم نے مظفر آباد میں مقامی سطح پر محاذ رائے شماری کو منظم کیا۔ پیرزادہ غلام مصطفیٰ علوی صاحب، عبدالستار، بشیر لون، ارشاد بچہ، یوسف زرگر، عبدالرشید قریشی اور حنفی قریشی وغیرہ نے دن رات محنت کی۔ ہم جوں جوں کام کرتے گئے ہمارے قافلے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

غالباً 1970 کی بات ہے۔ عوامی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے سلسلے میں محاذ کے راہنماؤں نے نیلم ویلی کے دورے کا پروگرام بنایا۔ وزارتِ امورِ کشمیر کے خلاف اور ایکشن کا بایکاٹ کرنا مقصود تھا۔ اس وفد میں میر عبدالمنان، مقبول بٹ، غلام مصطفیٰ علوی، غلام دین لالہ، میں اور دیگر قائدین وکارکنان بھی تھے۔ ہم نے ایک جیپ کرائے پرلی۔ اس وقت مظفر آباد بھی پچارولینڈ نہیں بنا تھا۔ بس تھرڈ کلاس قسم کی جیپیں چلتی تھیں۔ بعض اوقات انہیں دھکا بھی لگانا پڑتا تھا۔ راستے میں ہم نے پہنچ میں جلسہ کیا۔ بٹ صاحب نے بازار میں لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "کشمیری قوم کوئی گئی گزری قوم نہیں ہے۔ اللہ نے اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کشمیر کی سر زمین بھی قدرت کے خزانوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں بہت سے قیمتی معدنیات ہیں۔ اگر ہم ان معدنیات سے استفادہ کریں تو کشمیر ایک خوشحال ریاست بن سکتا ہے"

آزادی و خود مختاری کے ساتھ ساتھ کشمیری عوام کی خوشحالی ان کی دلی خواہش تھی۔ وہ کہتے تھے "آزاد کشمیر کے نوجوان کراچی، لاہور اور اولینڈی کے ہوٹلوں پر برتن مانجھ کے لیے پیدا نہیں کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہانت اور خوبصورتی عطا کی ہے۔ لیکن وزارتِ امورِ کشمیر اور اس کی کچھ تپلی حکومت نے ان نوجوانوں کو گداگرا اور ہوٹلوں کے بہرے بنادیا ہے یہ مجبوری اور بے بسی کا نشان بن گئے ہیں"

نوسری پہنچے، وہاں ایک ہوٹل پر کھانا کھایا۔ کھانا کیا تھا۔ کچا گوشت تھا۔ بٹ صاحب اور منان صاحب نے ایسا تاثر دیا جیسے یہ کوئی اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں۔ رات کو ہم اٹھ مقام پہنچ گئے۔ جس ہوٹل میں ٹھہرے نہایت خستہ حالت تھا۔ بسترے گندے تھے۔ ہم سب لوگ ایک ہی کمرے میں سوئے۔ بستروں کی حالت دیکھ کر بٹ صاحب کہنے لگے "تحریکی سفر میں مشکلات کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ہم سیر و تفریق کے لیے تو نہیں آئے۔ کھانے اور بستروں کو نہ دیکھیں" ہمارا ذیڑھ سو

روپے بل آیا۔

صحیح اٹھ مقام بازار میں جاسہ کیا۔ لوگوں کو ہماری باتیں نہیں لگتی تھیں۔ وہ ایک طرح سے تماشائی بن کر کھڑے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو آدمی بہ شکل جمع ہوئے۔ وہاں بٹ صاحب، منان صاحب، علوی صاحب اور میں نے تقاریر کیں۔ صحیح جب ہم اٹھے بڑا خوبصورت منظر تھا۔ بٹ صاحب نے مجھے اور غلام دین لالہ کو مخاطب کرتے ہوئے بھارتی چوکیوں کی طرف ریوا اور تانتے ہوئے کہا "ہم ہندوستان سے انتقام لیں گے" بٹ صاحب نے یہاں تقریر کرتے ہوئے آزاد کشمیر کی حیثیت، میں کیمپ کی خستہ حالی پر کڑی تقید کی۔ آزاد کشمیر کی سیاست کو ہدفِ ملامت بنا یا اور کشمیر کی آزادی کا پیغام دیتے ہوئے لوگوں کو مسلح جدوجہد کے لیے تیار ہونے کا پیغام دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت نے طاقت کے زور پر کشمیر پر قبضہ کیا ہے۔ اب اسے طاقت سے ہی نکالنا ہوگا"۔

1975 میں بٹ صاحب نے قانون ساز اسمبلی کے تین حلقوں سے ایکشن لڑا۔ سرحد، راولپنڈی اور مری والے حلقوں سے۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ ان کی جیب میں بسا اوقات کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ ہم صوبہ سرحد میں بہت سے مقامات پر گئے۔ یوسف زرگر، محمد اکبر پلاجی، غلام دین لالہ مہم میں پیش پیش رہے۔ پیپلز پارٹی نے دھاندی کا پروگرام پہلے سے بنایا ہوا تھا۔ وہ مقبول بٹ شہید کی عوامی مقبولیت سے خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ تین حلقوں سے ایکشن کے امیدوار کی حالت یہ تھی کہ بیوی بچوں کو پشاور چھوڑنے کے لیے کرایہ جیب میں نہیں تھا۔ پونگ والے روز پی پی نے دھنس دھاندی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ میں اور ماسٹر مقبول صاحب ہری پور کے اشیش کے لیے اپنا پونگ ایجنسٹ لے کر گئے۔ وہاں صحیح سویرے ہی پہنچے۔ انتخابی عملہ نے کہا یہاں آپ سے پہلے ہی ووٹ آئے تھے اور ووٹ ڈال کر چلے گئے ہیں۔ صرف دو ووٹ پول ہونا باتی رہتے ہیں۔ ہم ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس پونگ اشیش پر 107 ووٹ تھے۔ گویا صحیح سویرے 105 ووٹ دو دروازے سے چل کر آئے اور آنا فاناً ووٹ ڈال کر چلے گئے۔ شنکیاری میں مقبول بٹ کا پله بھاری دیکھ کر پی پی کے غنڈوں نے محاذ کے ایک کارکن غازی محمد انور کو شدید زخمی کر دیا۔

بھنو نے آزاد کشمیر میں غنڈہ گردی اور بدمعاشی کی سیاست کو روایج دیا۔ وہ آزاد کشمیر بھر کے

دورے کر کے آزاد کشمیر کو پاکستان کا صوبہ بنانے کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ وہ شملہ معاهدہ کو بہت بڑا کارنامہ قرار دے رہا تھا۔ وہ مسلح بغاوت کے خلاف تھا۔ بٹ صاحب اور محاذ رائے شماری نے شملہ معاهدے کی ڈٹ کر مخالفت کی اور صوبہ بنانے والی تجویز کو بے نقاب کیا۔ مظفر آباد دورے کے دوران جب اس نے کشمیریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کب تک دو پہاڑوں کے درمیان لٹکتے رہو گے تو اس پر بٹ صاحب نے سخت رد عمل کا اظہار کیا۔ میر پور کے جلے میں بھٹو کے خلاف این۔ ایس۔ ایف کے طلباء نے اور محاذ کے کارکنوں نے زبردست احتجاج کیا۔

"بھٹو جی یہ کام نہ ہو گا، غیرت کا نیلام نہ ہو گا"

"بچہ بچہ کٹ مرے گا، کشمیر صوبہ نہیں بنے گا"

"آزادی کا ایک ہی ڈھنگ، گوریلہ جنگ گوریلہ جنگ"

جب یہ نعرے میر پور کے پروگرام میں بلند ہوئے تو بھلکدڑ بچ گئی۔ ہم بھی وہاں موجود تھے۔ رسائی زمانہ ایف۔ ایس۔ ایف نے بھٹو کے کہنے پر لوگوں کو تشدید کا نشانہ بنایا اور گرفتاریاں ہو گیں۔ ہم نے بھٹو کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ بٹ صاحب شملہ معاهدہ کے سخت خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس معاهدے نے کشمیر کا زکون نقصان پہنچایا ہے۔

قیوم خان نے ایک کاغذی تنظیم "المجاہد فورس" بنائی تو اس نے مقبول بٹ سے بھی ملاقات کی اور ان سے تعاون مانگا۔ بٹ صاحب نے کہا سردار صاحب ہم ضرور آپ سے تعاون کریں گے لیکن آزاد کشمیر یا پاکستان میں نہیں بلکہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں۔ آپ وہاں پانچ آدمی بھیجیں گے تو ہم دس بھیجیں گے۔ وہاں آپ کے مجاہد اور ہمارے گوریلے شانہ بثانہ لڑیں گے۔ بٹ صاحب گوریلہ جنگ کے ساتھ ساتھ حق خوداردیت کے زبردست حامی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کشمیر کا فیصلہ کرنے کا حق صرف اور صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔ کوئی جماعت، گروہ، کمانڈر یا یہڈی فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

بٹ صاحب جب دوسرا دفعہ مقبوضہ کشمیر پہنچ گئے اور وہاں گرفتار ہو گئے تو مجھے سخت مایوسی ہوئی اور میں رفتہ رفتہ غیر متحرک ہو گیا۔ محاذ کا شیر اڑہ بھی بکھر نے لگا۔ نظریات کے بجائے ذاتیات نے لے لی۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ (ملاقات: 94-2-13-13 مظفر آباد)

شہید وطن مقبول بٹ سے میری پہلی ملاقات

سردار خادم حسین خان (بن جونسروالا کوٹ)

1947-48ء میں کشمیر کی جنگِ آزادی کے بعد فائز بندی، اقوام متحده کی قراردادوں کے سہارے زندہ رہنے کے وعدے، تحریکِ آزادی کشمیر کے بیس کمپ میں جھوٹے اور نامنہاد اقتدار کی جنگ، کراچی معاہدہ کے تحت گلگت بلستان کا 29 ہزار مرلے میل کا علاقہ ابراہیم خان اور چودھری غلام عباس کے ہاتھوں پاکستان کے حوالے کرنے اور وہاں فرانشیز کر انہر گیلویشن کے رسوائے زمانہ قانون کا نفاذ، تقسیم کشمیر کی سازشوں کے منصوبے جو 63-1962ء میں بھٹو، سورن سنگھ ملاقاتوں اور مذاکرات کی صورت میں سامنے آئے۔ 1965ء میں آپریشن جبراذر کی ناقص منصوبہ بندی اور معاہدہ تاشقند وغیرہ یا یہی عوامل تھے جن سے محب وطن کشمیریوں کے دلوں میں مايوسی اور بدولی پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ ان تمام حالات و واقعات پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کے بعد اگست 1965ء میں پشاور میں میجر امان اللہ خان، شہید کشمیر مقبول احمد بٹ، امام اللہ خان اور میر عبدالقیوم نے جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ نامی تنظیم کا قیام عمل میں لا یا جس کا مقصد مسلح جدوجہد سمیت ہر سطح پر مادر وطن ریاست جموں کشمیر کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا حصول تھا۔ اس تنظیم میں کچھ عرصہ بعد مر حوم جی۔ ایم لوں سابق سینیٹ کو سلر بھی شامل ہو گئے۔ یہ ایک تحریک تھی جو آزادی کشمیر کا سنگ میل ثابت ہوئی۔ میں اور میجر امام اللہ خان (جموں کشمیر نیشنل لبریشن فرنٹ کے پہلے مسلح ونگ کمانڈر) آزاد کشمیر فوج میں ایک ہی یونٹ میں تھے۔ وہ میرے کمپنی کمانڈر تھے اور میں ان کا سینڈ ان کمانڈر تھا۔ ہم دونوں پاکستان کی افسر شاہی کی ناصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف بغاوت کر کے 1964ء میں فوج سے فارغ ہو کر گھر آگئے تھے۔

جنوری 1966ء میں میجر امان اللہ خان کو ملنے کے لیے میں ان کے گھر پشاور گیا۔ جناب

مقبول احمد بٹ سے میری پہلی ملاقات مجرم صاحب کے گھر میں ہوئی۔ مجرم صاحب نے بٹ صاحب سے میرا تعارف کر دیا۔ بٹ صاحب انتہائی خنده پیشانی اور گرم جوشی سے مجھے ملے۔ گفتگو کے دوران بٹ صاحب نے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بات کی اور کہا کہ ہمیں اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ ہمیں ہر محاذ پر اور ہر سطح پر کشمیر کی آزادی کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے دور میں کوئی قوم اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے دشمن کے خلاف از خود ہتھیار نہ اٹھائے۔ ہمارے سامنے الجزاں، ویت نام، اری ٹیریا اور فلسطین کی مثالیں موجود ہیں۔ کشمیری کب تک معاهدے، مذاکرات اور اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے سہارے آزادی کی امید قائم رکھیں گے۔ مسلح جدوجہد کا راستہ ہی وہ واحد راستہ ہے جو ہمیں ہماری منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

اور پھر جون 1966ء میں جذبہ حب الوطنی اور جذبہ جہاد سے سرشار مادرِ وطن ریاست جموں کشمیر کا یہ ماہی ناز سپوت عظیم گوریلا لیڈر مقبول احمد بٹ اور مجرم امان اللہ خان اپنے چند سرفروشوں کے ہمراہ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوئے۔ سوپور کے نزدیک ایک گاؤں میں اپنا خفیہ سیل قائم کیا اور بھارتی مقبوضہ کشمیر کے نوجوانوں کو آزادی اور غلامی میں جو واضح فرق ہے اس کا احساس دلانے اور آزادی کے حصوں کے لیے مسلح جدوجہد شروع کرنے کے لیے ذہنی طور پر بیدار کرنے کا عمل شروع کیا۔ بدستی سے 10 ستمبر 1966ء کو بارہ مولہ کے نزدیک ایک گاؤں میں بھارتی سیکورٹی فورسز کے ساتھ ایک خونی معرکہ ہوا جس میں بٹ صاحب کا ایک 22 سالہ نوجوان ساتھی اور نگزیب جو گلگت کا رہنے والا تھا شہید ہو گیا۔ بٹ صاحب اپنے ساتھیوں صوبیدار کالاخان اور میر احمد کے ہمراہ گرفتار کر لیے گئے اور ان کو سرینگر جیل میں بند کر دیا گیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور 17 اگست 1968ء کو جناب مقبول احمد بٹ اور میر احمد کو چانسی کی سزا اور صوبیدار کالاخان کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

9 دسمبر 1968ء کو عظیم حریت پسند مقبول احمد بٹ اپنے دو ساتھیوں، میر احمد اور غلام ٹیئن کے ہمراہ رات کے سواد و بیجے جیل توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ متواتر 16 دن تک برف پوش سگانخ پہاڑی راستوں کا تکلیف دہ اور اڑیت ناک سفر کرنے کے بعد جب نام نہاد آزاد کشمیر میں داخل

ہوئے تو گرفتار کر لیے گئے اور کئی ماہ تک مظفر آباد (Black fort) قلعہ میں قید و بند کی صورتیں برداشت کرتے رہے۔ محاذ کی طرف سے احتجاجی مظاہروں، جلوسوں اور جلسوں کے نتیجے میں رہا ہوئے۔

6 نومبر 1969ء کو یوم شہداء جموں کے موقع پر جموں کشمیر محاذ رائے شماری کا چوتھا سالانہ کونشن مظفر آباد میں منعقد ہوا۔ لوگ صحیح سورے ہی کوسل ہال میں جمع ہو گئے اور وہاں سے جلوس کی شکل میں سارے شہر کا چکر اور نعرے لگاتے ہوئے 12 بجے کے قریب کوسل ہال پہنچے۔ اس جلوس میں تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں کئی درج بنیز تھے اور لفظ کے بیز بھی تھے۔ جلوس کے آگے محاذ کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس جلوس کی قیادت جناب عبدالخالق انصاری ایڈ و کیٹ صدر محاذ رائے شماری، جناب مقبول احمد بٹ کے علاوہ دیگر مرکزی زعماء کر رہے تھے۔ کوسل ہال کے اندر اور باہر چاروں یو ایاری کو محاذ کے بنیزوں سے سجا یا گیا تھا۔ جلسہ عام رب ذوالجلال کے باہر کت نام سے شروع ہوا۔ جس میں مقبول احمد بٹ کے علاوہ مرکزی زعماء اور کئی دوسروں نے تقریریں کیں۔ شام کو جزل کوسل کا اجلاس ہوا جس میں جموں کشمیر محاذ رائے شماری کے انتخابات عمل میں لائے گئے۔ اس اجلاس میں جناب مقبول احمد بٹ کو محاذ رائے شماری کا صدر منتخب کیا گیا۔ اور میر ہدایت اللہ سینئر نائب صدر، میر عبدالمنان سیکرٹری جزل، ایم اقبال پر ویز جوانسٹ سیکرٹری، مسٹر امان اللہ خان چیئر میں پبلیٹی بورڈ، صوفی محمد زمان خزانچی، شیخ حسین شیم فناشل سیکرٹری، اکرام اللہ جسوال اسٹنٹ سیکرٹری منتخب کیے گئے۔ یہ انتخابات انتہائی پر سکون اور خوش گوار ما حول میں ہوئے۔ حلف و فاداری کی ابتداء ہوئی۔ جناب عبدالخالق انصاری سابق صدر محاذ رائے شماری نے منتخب صدر جناب مقبول احمد بٹ سے حلف لیا۔ اس کے بعد جناب مقبول احمد بٹ نے بھیتیت صدر محاذ رائے شماری دیگر مرکزی عہدیداروں سے حلف لیا۔ اس کونشن کی خاص اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس تقریب میں فلسطین کی قومی محاذ آزادی لفظ کے نمائندے جناب خالد حلیمی نے شرکت کی اور انہوں نے عربی زبان میں پڑھ تقریر کی جس کا ترجمہ محاذ کے سیکرٹری جزل جناب میر عبدالمنان نے کیا۔ یوں یہ پروقار تقریب اللہ رب العزت کے نام سے شروع ہو کر دعائے خیر کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

مسئلہ کشمیر کو سردخانے سے نکالنے اور اقوامِ عالم کو مسئلہ کشمیر کی طرف توجہ دلانے کے لیے عظیم حریت پسند جناب مقبول احمد بٹ نے ٹھوس منصوبہ بندی اور اعلیٰ حکمت عملی کے تحت 30 جنوری 1971ء کو دو کشمیری حریت پسندوں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی کے ذریعے بھارتی طیارہ گزگا انگو کروایا۔ بھارتی طیارے کے انگو سے ساری دنیا پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ کشمیری اب اپنی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ طیارے کے انگو سے مسئلہ کشمیر کے اجاگر ہونے کے ساتھ ساتھ بطل حریت مقبول احمد بٹ کا نام پوری دنیا میں بالعموم کشمیر اور پاکستان میں بالخصوص گوئی بنتی گئی۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر اور سڑکوں پر مقبول احمد بٹ اور حریت پسندوں کو دیکھنے کے لیے ایک جم غیر تھا۔ 31 جنوری کو جناب ذوالفقار علی بھٹو ڈاکٹر مبشر حسن کے ہمراہ لاہور کے ہوائی اڈے پر جا کر بٹ صاحب اور حریت پسندوں سے ملنے اور ان کو مبارک باد دی اور تعاون کا یقین دلایا۔ کے۔ ایچ۔ خورشید مرحوم اور کئی دیگر سیاسی راہنماؤں نے حریت پسندوں کے اس دلیرانہ اقدام کی تعریف کی اور ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ 13 فروری کو لاہور میں بہت بڑا جلوس نکلا گیا۔ حریت پسندوں کا شاندار استقبال کیا گیا۔ گوریلا جنگ کے حق میں زندہ باد کے نعروے اور آمریت مردہ باد کے نعروے لگائے گئے۔ 15 فروری کو گوجرانوالہ کے شہریوں نے بٹ صاحب اور حریت پسندوں کا والہانہ استقبال کیا۔ اس شاندار جلوس میں گوریلا جنگ زندہ باد اور آمریت مردہ باد کی نعروہ بازی ہوئی۔ ان دنوں جناب مقبول احمد بٹ کا یہ نعروہ بہت مقبول ہو گیا تھا۔

ایک حل ایک امنگ، گوریلا جنگ گوریلا جنگ

آزادی کا ایک ہی ڈھنگ گوریلا جنگ گوریلا جنگ

ہائی جیکنگ کے اس شاندار کارناٹے نے جہاں جناب مقبول احمد بٹ، حریت پسندوں اور تو می محاذ آزادی (این۔ ایل۔ ایف) نے کشمیر اور پاکستان کے عوام میں بے حد مقبولیت اختیار کی اور خاص طور پر نوجوان طبقے کو بے حد ممتاز کیا وہاں بیورو کریسی، مفاد پرست ابن ال وقت نام نہاد حکمرانوں کے حسد، رتابت اور دشمنی کو بھڑکایا اور بیجی خانی ٹولے نے قیوم خان سے مل کر حریت پسندوں کو جیلوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔ تقریباً 300 محب وطن کشمیریوں کو پابند سلاسل کر کے جھوٹا اور نام نہاد مقدمہ

میں ان دنوں لاہور ہی میں تھا۔ 31 جنوری کو میں اپنے ایک عزیز سردار ارشاد مرحوم کے ہمراہ لاہور کے ہوئی اڈے پر موجود تھا اور میری موجودگی میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، ڈاکٹر مبشر حسن کے ہمراہ ہوائی اڈہ پر آئے تھے۔ طیارے کے انگوے سے پہلے اور انگوے کے بعد لاہور میں بٹ صاحب سے تین چار بار ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

برطانیہ سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ آزاد کشمیر کے دورے پر آیا۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے ہمراہ شہپر کشمیر مقبول احمد بٹ، جناب عبدالخالق انصاری، جناب جی۔ ایم میر، جناب میر عبدالقیوم مظفر آباد سے ہو کر راولاکوٹ آئے۔ میں نے ارجہ کے مقام پر ان کا استقبال کیا۔ راستہ میں جنڈاٹھی، پانیولہ اور پاک گلی میں جناب مقبول احمد بٹ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے لوگوں سے مختصر خطاب کیا۔ 31 مئی 1973ء کو راولاکوٹ کے مقام پر جموں کشمیر مجاز رائے شماری کے زیر اہتمام ہائی سکول کے سامنے ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت لفتیجنسٹ غازی اللہ دتہ خان نے کی۔ سیچ سیکرٹری کے فرائض سردار رشید حسرت نے انجام دیئے۔ میں نے سپا سانہ پیش کیا۔ یہ سپا سانہ میں نے سردار رشید حسرت کے گھر بیٹھ کر لکھا تھا۔ غازی اللہ دتہ خان نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو ایک دیسی ساخت کی توڑے دار بندوق پیش کی اور کہا کہ ہم نے ان دیسی بندوقوں، کلہاڑوں، برچھیوں اور پتھروں سے ڈوگرہ فوج سے لڑ کر 32 ہزار مرلے میل کا علاقہ آزاد کر دیا۔ آپ بھی ہندوستان کے خلاف بندوق اٹھائیں اور آزادی حاصل کریں۔ بٹ صاحب نے پڑھوں اور لوہے انگیز تقریر کی۔ تحریک آزادی کشمیر کے پس منظر اور پیش منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ”آزادی ہر انسان اور قوم کا پیدائشی، بنیادی اور فطری حق ہے۔ غلامی کے احساس کو ذہنوں سے نکال دو۔ برداری ازم، قبیلائی تعصّب کی زنجیریں توڑ کر برادریوں کے جھوٹے فریب سے نکل آؤ اور مادرِ وطن کشمیر کو آزادی، عزت اور خود مختاری دلانے کے لیے طویل مسلح جدوجہد کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

جوں کشمیر مجاز رائے شماری ضلع پونچھ کا دفتر راولاکوٹ احاطہ کچھری میں سردار رشید حسرت اور میں نے کھولا تھا۔ کیم جون 1973ء کو شہپر کشمیر مقبول احمد بٹ نے دفتر کا افتتاح کیا اور دفتر کے اوپر مجاز

کا جنڈا ہرا یا۔ وہاں موجود لوگوں سے مختصر خطاب کیا۔ بعد میں حسین شہید ذکری کانج رو الا کوٹ میں طلبہ سے تاریخی خطاب کیا جس میں بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ بعد وہ پھر بٹ صاحب دیگر ساتھیوں کے ہمراہ مسجد صابر خان شہید تارہ جرأت کے گھر تعزیت کے لیے گئے۔ ان کے والد محترم اور دیگر عزیز واقارب سے ملے اور اظہار ہمدردی کی۔ گھر میں بیٹھنے سے پہلے مسجد صابر کی قبر پر فائح پڑھی ابھی ہم لوگ ان کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بارش تھم گئی اور مسجد صابر کے والد محترم سے اجازت لے کر رو الا کوٹ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کے گھر کے قریب برستی نالے میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے اپنی شلواریں، پتوں میں اور پرکیں اور نالہ کراس کر کے دوسری طرف گئے۔ رو الا کوٹ میں دو دن تک میں بٹ صاحب کے ساتھ رہا۔ سردار رشید حضرت مرحوم اور چند دیگر ساتھی بھی ہماری ان تقریبات میں شریک رہے۔ ڈاکٹر فاروق عبد اللہ، جناب مقبول احمد بٹ، عبدالخالق النصاری، جی۔ ایم میر اور میر عبدالقیوم نے بن جونسہ ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا جب کہ دیگر باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو بن جونسہ گاؤں میں ٹھہرایا گیا کیوں کہ ریسٹ ہاؤس میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ شہید مقبول احمد بٹ کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ کشیر کی آزادی کے لیے قراردادیں، معاهدے اور مذاکرات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ آزادی کے حصول کے لیے جانوں کے نذرانے دینے پڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں حصول آزادی کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ غاصب اور جابر حکمرانوں کے خلاف مسلح جدوجہد اور گوریلا جنگ کے لیے کشیری نوجوانوں کو ذہنی طور پر تیار کر کے میدان کارزار میں اتنا تھا اور پھر اسی جذبے کے تحت وطن کی آزادی اور خود مختاری کا علم بردار، عزم واستقلال کا پیکر، مردمجہاد، وطن کی سہلیت، عزت و ناموس پر جان کی بازی لگانے والا عظیم قائد مقبول احمد بٹ نے 10 مئی 1976ء کو اپنے تین حریت پسند ساتھیوں کے ہمراہ بھارتی مقبوضہ کشیر میں داخل ہو کر از سر گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔

بُعد میں ایک اپریشن کے دوران اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیے گئے اور ان کو محل تھاڑ جیل میں منتقل کر دیا گیا اور پھر 11 فروری 1984ء کو وطن سے بہت دور تھاڑ جیل میں پھنسی کے پھندے کو چوم کر جام شہادت کا آخری گھونٹ پی کر امر ہو گیا۔ ظالم حکمرانوں نے مقبول

بٹ کو موت کی نیند سلا دیا لیکن وہ لاکھوں دلوں میں آزادی کی شمع روشن کر گیا اور پھر اس دیے سے شہادت کے ہزاروں چراغ جل کر شاہراہ آزادی کو روشن تر کر گئے۔

مقبول بٹ خوش پوش۔ خوش گفتار، خوش اخلاق، ملسا ر، ہر دل عزیز، غیر معمولی قوتِ ارادی کے مالک ہر ایثار اور آزمائش میں صبر و تحمل، اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے حامل اور بلند کردار شخصیت کا نام ہے۔ مقبول بٹ تحریک آزادی کشمیر کی علامت اور عظمت کا نشان ہے۔ مقبول بٹ کی قربانیاں کشمیر کی موجودہ تاریخ کا ناقابل فراموش اور سنہری باب ہے۔

شہید وطن مقبول بٹ نے 1966ء میں جو آزادی کی ایک چنگاری سلگائی، ایک چراغ روشن کیا اور پھر 11 فروری 1984ء کو اپنی خوب صورت اور پیاری جان کا نذر رانہ دے کر اپنے مقدس خون سے اس شمع کی آبیاری کی۔ آزادی کی اس شمع کی روشنی آج ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ یہ شمع آزادی کبھی بجھ نہیں سکتی یہ اس وقت تک روشن رہے گئی جب تک مادر وطن ریاست جموں کشمیر کا چپے چپے غاصبوں سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ محمد مقبول احمد بٹ کے جان شار شمع آزادی کے پروانے قائد تحریک جناب امان اللہ خان کی ولولہ انگیز قیادت میں پوری قوت، دیانت داری اور خلوص کے ساتھ وطن کی مکمل آزادی اور خود مختاری کے حصول کے لیے روای دواں ہیں۔ انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب ظلم سرنگوں ہو گا۔ جب ظلم و جرکی تاریکی چھٹ جائے گی اور آزادی کا سورج ہمارے پیارے وطن پر طلوع ہو گا۔ ریاست جموں کشمیر بھارت اور پاکستان کے درمیان کسی زمین کے نکڑے کا جھگڑا نہیں بلکہ پوری کشمیری قوم کے حق میں آزادی کا سوال ہے اور یہ حق دنیا کی کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی۔

(گفتگو: 2005ء راولا کوٹ)



میرے ابوحیان

شوکت مقبول بٹ (مظفر آباد)

والد صاحب بنیادی طور پر نرم و محنثے مزاج کے مالک تھے۔ ملسانِ صلح بھوٹھے۔ محبت و شفقت سے پیش آنا آپ کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور ان میں گھل مل جاتے تھے۔ گھر کے بزرگ افراد کے ساتھ آپ کا رویہ سنجیدہ اور پروقار ہوتا تھا۔ آپ بچوں اور بڑوں کا یکساں احترام کرتے تھے۔ آپ نے جتنا وقت بھی گھر پر گزارا۔ بھی بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھر پور توجہ دی۔ جیلوں سے لکھے گئے خطوط میں بھی حصول تعلیم کی تلقین کرتے تھے۔ ہر بچے کے بارے میں فرد افراد پوچھتے اور راہنمائی مہیا کرتے تھے۔ میں نے جب پرائمری تعلیم مکمل کی تو خود والد صاحب نے ہائی سکول میں میرا داخلہ کرواایا۔ چھٹی جماعت کے سہ ماہی یا شمساہی امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرنے پر مجھے کچھ پیے انعام دیے تاکہ حوصلہ افزائی ہو۔

آپ کی زبان سے گھر میں اخلاق سے گری ہوئی بات میں نہیں سنی۔ آپ کے مزاج میں لاچ کا شائنبہ کہیں دور دور تک نہیں ملتا جس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے ”پشاور شہر میں ہم جس مکان میں رہتے تھے وہ خاصہ بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ ایک روز میں نے والد صاحب کو کہا کہ ابو خدا ناخواستہ اگر گھر گر گیا تو ہم کیا کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کہیں دریا کے کنارے خیمد لگا کر بیں گے۔“

والد صاحب عموماً بچوں کو ڈانتٹے نہیں تھے۔ ان کی شخصیت بڑی سحر انگیز بارعہ اور جامع تھی۔ جتنا وقت بھی وہ گھر پر موجود رہتے بچے جیسے شرار میں بھول جاتے تھے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بہت لاؤ دیا کرتے تھے مگر اس کے باوجود بھی ان کی شخصیت کا سحر برقرار رہتا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ صرف ایک مرتبہ مجھے ان سے ایک شرارت پر مار پڑی تھی اور انہوں نے سکول میں ٹیچر کو بھی

میری شرات کی شکایت کی تھی۔

والد صاحب کے رویے کی وجہ سے ہمیں اوائل عمری میں ہی اعتماد آگیا۔ اس مادی دنیا میں والد صاحب نے ہمیں عزم، حوصلہ، صبر، اور اعتماد کی دولت سے نوازا۔ آپ کی خودداری نے ہمیں بھی مادی خواہشات سے دور رکھا اور نہ ہی ہم کبھی احساس محرومی کا شکار ہوئے۔

اس وقت یہ بات کہنا کہ والد صاحب اگر آج بھی موجود ہوتے تو ہماری زندگی کیسی ہوتی بہت مشکل ہے۔ میں والد صاحب کو ابوجان کہہ کر پکارتا تھا۔ اور وہ مجھے Mr.quick jam پکارتے تھے۔ میں گھر کے کام ہمیشہ جلدی کیا کرتا تھا۔ والد صاحب سے جھگڑا کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ سکول کے زمانے میں سائیکل کی فرماش کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ میٹر کرنے پر تمہیں Auto Cycle خریدوں گا۔ پرانی سکول کے زمانے میں عید کے موقع پر مصنوعی ریوالور کی بھی فرماش کی تھی۔

اپنی موجودگی میں والد صاحب ہماری ضروریات پوری کرتے تھے۔ Generally والد صاحب کے ساتھ ایک مرتبہ راولپنڈی اور ایک مرتبہ درہ آدم خیل جانے کا اتفاق ہوا اُن دونوں میں غالباً پرانی سکول میں پڑھتا تھا۔ گریوں کی چھیلوں میں ہم لوگ اکثر ایسٹ آباد ماموں جی کے ہاں جایا کرتے تھے اور جب بھی والد صاحب تنظیمی دوروں سے واپسی پر ایسٹ آباد آتے تو ہمیں سیر وغیرہ کے لیے ضرور لے کر جاتے تھے۔ انھیں جبیب ولی محمد کی گائی ہوئی غزل

۔ آشیاں جل گیا گلتاں لٹ گیا
ہم قفس سے نکل کر کہاں جائیں گے

بہت پسند تھی وہ اکثر ہمیں سنا یا کرتے تھے۔ جب بھی بازار لے جاتے فائنا ضرور پلاتے تھے۔ میں بچپن میں والدہ کے پاس سوتا تھا کیوں کہ والد صاحب اخبار کے دفتر سے رات کو دیر سے آتے تھے۔ میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے یقیناً والد اور والدہ دونوں کا لاؤ لہ تھا مگر والدہ کے زیادہ قریب رہنے کی وجہ سے ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔

میری پرورش اور تربیت میں نفیاتی طور پر والد اور عملی طور پر والدہ کا بہت بڑا اتحاد ہے۔ مجھے اپنی والدہ سے بہت محبت تھی اور ہے۔ ان کے اعتماد اور نظم نے مجھے اپنی شخصیت Built کرنے میں بہت مدد و مددی۔ مجھے یاد ہے جب ہم سکول سے واپس آتے تھے تو بہت بھوک کے باوجود جب تک ہم یونیفارم تبدیل نہیں کرتے تھے کہا نہیں ملتا تھا۔ یہ والدہ کی تربیت ہی تھی جس نے ایک منظم زندگی گزارنے کی بنیادیں فراہم کیں۔ میری والدہ بہت ملنسار اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ان کے لئے جلنے والے آج بھی انھیں یاد کر کے افسرده ہو جاتے ہیں۔ والدہ کے مزاج میں شفقتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے انھیں مشکلات میں بھی پر عزم اور ہستا مسکراتا پایا۔

والدہ نے مجھے تعلیم کے ساتھ ساتھ گھریلو کام کا ج (چائے، کھانا بنانے اور کپڑے دھونے) کی بھی تربیت دی تھی تاکہ ان کی غیر موجودگی میں ہمیں کسی قسم کی محتاجی کا سامنا نہ ہو۔

والدہ کو والد صاحب سے کوئی گلہ تھا بھی تو انہوں نے ہم پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میری والدہ قناعت پسند اور صابر خاتون تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ روایتی نوک جھونک کے علاوہ کبھی گھر میں سنجیدہ جھگڑا نہیں ہوا۔ والدہ نے والد صاحب کی جدو جہد بھری زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

والدہ اکثر والد صاحب کی جرأت، شجاعت، صفائی پسندی اور استقلال واستقامت کا تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔

والدہ ہی کی ترغیب پر میں نے غالباً تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں پہلی بار نئی دہلی تہاڑ جیل کے ایڈریس پر والد صاحب کو خط لکھا۔

یہ بات درست ہے کہ میری شخصیت پر والد کی شخصیت کے اثرات موجود ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے ویسے بھی والد صاحب کی زندگی ہمارے لیے ایک نمونہ ہے۔

والد صاحب عموماً پڑھائی کے سلسلہ میں نصیحت کرتے تھے۔

والد صاحب کی موجودگی میں تو ان کے تحریکی کاموں کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں تھی مگر گنگا ہائی بنیانگ کیس کے بعد اور دوبارہ ہندوستانی مقبوضہ کشمیر میں گرفتاری کے بعد ان کی عملی جدو جہد کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا۔ میں والد صاحب کی جدو جہد بھری زندگی پر ہمیشہ فخر رہا۔

والد صاحب اپنی سرگرمیوں کے بارے میں بچوں میں کبھی تذکرہ نہیں کرتے تھے لیکن والدہ کے طفیل ہمیں کچھ نہ کچھ علم ہوتا رہتا۔ والد صاحب عملی زندگی میں آنے سے پہلے تعلیم مکمل کرنے کی اکثر ہدایت کرتے تھے۔ اسی لیے ہماری تعلیمی سرگرمیوں کے متاثر ہونے کے پیش نظر وہ اپنے سنجیدہ معاملات سے ہمیں دور رکھتے تھے۔

والد صاحب سے ضد کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ گھر سے جاتے وقت بچوں سے ضرور ملتے تھے اور اکثر ٹافیاں وغیرہ لے کر دیا کرتے تھے۔

والد صاحب کی شخصیت سحرانگیز، بارعب، پروقار اور پرکشش تھی۔

والدہ کی تربیت کی وجہ سے احساس محرومی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔

گنگاہائی جینگ کے بعد پولیس نے ہمارے گھر کی مکمل تلاشی لی۔ اُن دنوں پاکستانی بیورو کریسی نے کشمیری حریت پسندوں کے خلاف انڈین جاسوس ہونے کی ایک پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی تھی۔ اس پروپیگنڈہ کی وجہ سے ہمارے اڑوں پڑوں کے لوگوں کا رویہ ہمارے ساتھ عجیب سا ہو گیا۔ کم عمری کی وجہ سے ہم الجھن کا شکار ہونے لگے۔ مگر اُس مشکل دور میں ہماری والدہ نے ایک مضبوط کردار ادا کیا اور ہمیں Confuse ہونے سے بچائے رکھا۔

والد صاحب کی زندگی کا مقصد پسے ہوئے کشمیری عوام کے لیے سیاسی، معاشی و اقتصادی آزادی حاصل کرنا تھا۔ وہ عوام الناس میں سے جہالت، غربت، افلas اور بیماری کا خاتمہ چاہتے تھے۔ آپ منافق اور استھصال سے اپنی عوام کو بچانا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ نے انسانی مساوات اور باعزت معاشرے کے قیام کے لیے ساری زندگی جدوجہد کی۔

آپ دنیا کے نقشے پر ریاست جموں کشمیر کو ایک آزاد و خود مختار ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ والد صاحب کھانوں میں بزریاں پسند کرتے تھے۔ کڑم کا ساگ آپ کو خصوصاً بے حد پسند تھا۔ لباس میں مکمل سوت اور کرٹہ شلوار شوق سے پہننے تھے۔ سیاسیات اور قانون و ادب آپ کے پسندیدہ مضامین تھے۔ شعراء میں ترقی پسند شعراء کو پسند کرتے تھے۔ آپ بہت نفاست پسند تھے اور گندگی سے آپ کو چونتھی۔ اکثر ہم بچوں کو بھی اپنے ساتھ سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے نہلاتے تھے۔

والدہ کی فوتگی پر انہوں نے جو تعزیتی خط ہمیں لکھا اسے پڑھ کر آج احساس ہوتا ہے کہ اُس وقت وہ اپنے آپ کو کتنا مجبور اور بے بس محسوس کر رہے تھے۔
ہم نے بچپن درمیانی حیثیت میں گزارا۔
جب خرچ والدہ دیا کرتی تھیں۔

ہماری ضروریات بھی والدہ ہی پوری کرتی تھیں۔ ہماری ضروریات بہت کم ہوتی تھیں اور اس معاملے میں ہم نے بھی والدہ کو پریشان نہیں کیا۔ حالات نے ہمیں بھی صابر بنا دیا تھا۔

والد صاحب 1976ء میں ہمیں مل کر گئے تھے مگر یہ نہیں پتہ تھا کہ مقبوضہ وادی جارہے ہیں۔ اس لیے گھر کا ماحول و منظرو یہی تھا جیسا عموماً اُس سے پہلے تنظیمی دوروں پر جاتے ہوئے ہوا کرتا تھا۔

آن کی سزا نے موت کا سنتے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو گا کیوں کہ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسی افواہیں اڑتی رہی تھیں۔

یہ خبر میں نے والد صاحب کے ایک دوست جہانگیر خان کی دکان میں ریڈ یو پرسنی جس انہوں نے بعد میں ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کو راولپنڈی فون کر کے کنفرم کیا۔ کسی بہت ہی پیارے کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے احساس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اک طوفان تھا جو مجھے سرتاپ چھبھوڑ رہا تھا۔ مگر میں نے مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے اپنے اعصاب کو بکھرنے سے بچائے رکھا۔

والد صاحب کی شہادت میری زندگی میں بہت بڑی تبدیلی کا سبب بنی۔ میں نے اسی روز والد صاحب کے ادھورے مشن کو آگے بڑھانے اور مکمل کرنے کا عزم کر لیا۔ میں ان لوگوں کو والد صاحب کا صحیح اور مخلص دوست سمجھتا ہوں جو ان کے فلسفہ جدوجہد پر عمل کرتے ہوئے آن کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔

میرے والد گرامی جوں کشمیر کی جدید تحریک آزادی کے روح روایا ہیں۔ انہوں نے مسلسل جدوجہد کر کے اپنی عظمت اور اولو العزمی کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ آپ کا نام تاریخ کشمیر میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ آپ کی شخصیت ایک درخشندہ ستارے کی مانند کشمیر کے افق پر چلتی

رہے گی۔ آپ کے کردار کی روشنی کل بھی اور آج بھی حریت پسندوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے رہی ہے۔ تاریخ انسانیت میں ایسے باعزم انسانوں کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ جب تک کشمیری قوم کرہ ارضی پر موجود رہے گی مقبول بٹ کا نام بھی زندہ و تابندہ رہے گا۔

بٹ صاحب کو ملنے والا رتبہ و مقام ہمارے لیے باعثِ عزت و افتخار ہے۔ ہم ہی نہیں بلکہ پوری قوم اپنے اس سپوت کی قربانیوں اور مرتبے پر فخر و انبساط محسوس کرتی ہے۔

کشمیر کے گلی کوچوں میں والد صاحب کی تصاویر اور لکھے گئے اقوال ہمیں اولو العزمی، استقلال، جرأت، اعتماد، فخر اور جدوجہد کی طرف مائل کرتے ہیں۔

بٹ صاحب کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو مدد نظر رکھتے ہوئے ان کے نقش قدم پر چلا جائے اور ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کیا جائے۔

ہم روح قائد سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ان کے خوابوں کو تعبیر نہیں مل جاتی ہم اُسی استقامت، جرأت، حوصلہ مندی اور دوراندیشی سے جدوجہد کرتے رہیں گے، جس کا انہوں نے خود مظاہرہ کیا۔

(گفتگو: فروری 1994 مظفر آباد)



مقبول بٹ شہید..... ایک عظیم انسان

کریم اللہ قریشی (مظفر آباد)

سرکاری حکم کے مطابق مجھے پوہ پھونٹنے سے قبل ان کو یہ خبر سنانی تھی لیکن جیل میں اپنی دیگر مصروفیات کے باعث مجھے ان تک پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی اور جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے۔ بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہونے کے ان کے منفرد انداز کو دیکھ کر میری زبان سے بے ساختہ ”سبحان اللہ سبحان اللہ“ کے الفاظ نکلے اور میں اپنی پرنم آنکھوں سے اس مرد آہن کی طرف دیکھتا ہوا اس طرح خیالوں کی دنیا میں کھو گیا کہ مجھے اپنے آپ کی بھی کچھ خبر نہ رہی۔ ناسازی حالات سے پوری طرح آشنا مگر تمام خطروں سے بے پرواہ وہ مردِ مومن ایسے لگ رہا تھا جیسے ”الصلوٰۃ معراج المؤمنین“ کے فلسفے کی حقیقت میں کھوکر جامِ ولی سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس عظیم انسان کی عظمت اور شخصیت کے احترام میں لاشعوری طور پر میری گردن جھک گئی اور میں خیالوں میں گم چٹائی پر شہادت کی انگلی سے گول دائرے بنانے اور کبھی متوازی خطوط کھینچنے میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد مقبول بٹ صاحب نے نماز سے فراغت کے بعد میرے کاندھے پر اپنے روایتی اور پُر اعتماد انداز سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”چودھری صاحب کیوں اداس ہو، کن خیالوں میں کھو گئے ہو؟“ اپنے کاندھے پر ان کا ہاتھ محسوس کر کے اور ان کی خیریت پوچھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا ہو گیا۔ سلام بجالانے کے بعد ان کی خیریت پوچھنے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری تھکیاں بند گئیں دم گھٹنے لگا اور سر نیچے جھکا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ارضِ وطن کشیر کے اس عظیم سپوت نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کاندھوں پر رکھ لیے اور مجھے دلا سادیتے ہوئے کہا ”چودھری صاحب آپ میری خوشی کے وقت رور ہے ہیں۔ آپ کو اس وقت میرا ساتھ دینا چاہیے۔ میں تو خوش ہوں کہ پروردگار نے مجھے اپنی شفقت اور مہربانی سے اس کام کے لیے منتخب فرمایا جو وہ اپنے پیارے

اور نیک بندوں سے کرواتا ہے۔ آپ وہ سرکاری حکم نامہ مجھے دے دیں میں اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں، ان کی یہ باتیں سن کر میری حیرانی کی انتہاء نہ رہی اور میں نے ان سے پوچھا کہ بٹ صاحب سرکاری حکم نامے سے متعلق آپ کو کس نے بتایا؟ ”اس کا تو یہاں سے میرے بغیر اور کسی کو علم نہیں ہے“ میری اس بات پر وہ مسکرا کر کہنے لگے ”چودھری صاحب یہ تمام فیصلے زمین پر نہیں ہوتے بلکہ آسمان پر ہوتے ہیں۔ آسمان والے نے مجھے اپنے فیصلے سے پہلے آگاہ کر دیا تھا اس میں حیرانی کی کیا بات ہے“۔

شہید مقبول بٹ کے متعلق چودھری قیصر الدین ڈپٹی کمشنز جواں وقت سنٹرل جیل سرینگر میں سپرنئنڈنٹ جیل تھے کے یہ الفاظ جن میں شہید مقبول بٹ کی عظمت کی عکاسی کی گئی ہے۔ راقم کے لاشعور میں رج بس گئے ہیں۔ چودھری قیصر الدین نے شہید مقبول بٹ کے متعلق ان خیالات کا اظہار جولائی 1984ء میں کلچرل اکیڈمی سرینگر کے دفتر میں ایک ادبی محفل میں کیا تھا۔ ”چودھری قیصر الدین جناب مقبول بٹ شہید کی دوسری مرتبہ سنٹرل جیل سرینگر میں نظر بندی کے پورے عرصہ کے دوران جیل کے سپرنئنڈنٹ رہے ہیں اور انہوں نے اس عرصہ کے دوران جناب مقبول بٹ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔ جناب مقبول بٹ سے اپنی ایک ملاقات کے دوران ان سے پوچھے گئے ایک سوال کا حوالہ دیتے ہوئے چودھری قیصر الدین نے کہا کہ مقبول بٹ کو مقبوضہ کشمیر کی انتظامیہ تو کیا پورا بھارت بھی گرفتار نہ کر سکتا تھا۔ لیکن افسوس کہ جب اپنے ہی چند کشمیری دیہاتی بھائیوں نے لاعلمی میں پکڑ لیا تو انہوں نے اپنے کشمیری بھائیوں پر گولی چلانے کی بجائے اپنے آپ کو ان کی گرفت میں دے دینا ہی بہتر سمجھا کیوں کہ وہ تو انہی کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اور اپنی زندگی کے عوض ان کی زندگی کی امان چاہتے تھے۔ چودھری قیصر الدین نے کہا کہ جناب بٹ صاحب کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ ان کی قوم خاص کر صاحب اقتدار اور صاحب رائے لوگوں نے ان کے قومی و ملی جذبات کی تدرنہ کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ کہتے تھے صاحب اقتدار حضرات کو میری تھیوری سے ضرور اتفاق کرنا پڑے گا لیکن اس وقت میں ان میں موجود نہ ہوں گا۔ کیا ہی اچھا ہونا میری حیاتی میں انہوں نے میری طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا ہوتا!

شہید مقبول بٹ نے قوم کو آزادی حاصل کرنے کا یک واضح لائج عمل بتا کر 11 فروری 1984ء کو جام شہادت نوش کر گئے اور اس کے چند ہی برس بعد یعنی 1988ء کو کشمیری قوم نے ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے کی شروعات کر کے پوری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ شہید مقبول بٹ ہی کا تجویز کردہ راستہ آزادی کی منزل کی طرف جاتا ہے۔ اس راستے پر چل کر کشمیریوں نے پوری دنیا میں اپنا جائز مقام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ مسلکِ ماضی کے تمام من گھڑت مفروضوں کو غلط ثابت کر دیا جونہ کہہ دہ نہ کہے لیکن ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں یہ کہتے ہیں کہ ریاست جموں کشمیر میں مقبول بٹ شہید کی شخصیت کو ہی تاریخ میں سب سے قد آور شخصیت لکھا جائے گا۔ لیکن افسوس کہ بعض حلقوں کی طرف سے مقبول بٹ شہید کی شخصیت کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق پیش کر کے ان کی قدر کو گھٹانے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شہید مقبول بٹ اپنی قوم کو کسی قسم کی بھول بھلیوں میں ڈالے بغیر باطل سے نبرد آزمائونے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ غاصب کو سرز میں کشمیر سے نکال باہر کیا جائے اور کشمیری اپنے مستقبل کے معاملات خود طے کر سکیں۔ کشمیری نوجوانوں نے شہید مقبول بٹ کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر سر بلندی اسلام اور وطن عزیز کی آزادی کے لیے اپنے خون کی ندیاں بھاہدیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وطن عزیز کا چپہ بیرونی افواج کی غلامی سے آزاد نہیں ہو جاتا۔

11 فروری 1990ء کو ان کی چھٹی برسی کے موقع پر چکوٹھی کے مقام این۔ ایس۔ ایف کے جیا لے، بھادر اور آزادی پسند نوجوانوں نے جنگ بندی لائی توڑتے ہوئے اپنی جانوں کے نذر اُنے پیش کر کے شہید مقبول بٹ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مقبوضہ کشمیر کے اپنے بھائیوں کے بہتے ہوئے خون میں اپنا خون شامل کر کے جدوجہد آزادی میں عملی حصہ لینے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ اس طرح 11 فروری کو کشمیر کی تاریخ میں اب دو ہری فضیلت حاصل ہو گئی ہے۔ وزیر اعظم آزاد حکومت ریاست جموں کشمیر جناب ممتاز حسین رانھور نے 20 اگست 1990ء کو مظفر آباد میں کشمیر ریلی سے خطاب میں تحریک آزادی کشمیر سے متعلق کئی دیگر اعلانات کے ساتھ ساتھ 11 فروری کے خطاب میں تحریک آزادی کشمیر سے متعلق کئی دیگر اعلانات کے ساتھ ساتھ 11 فروری کو جناب مقبول

بٹ اور شہداء کے چکوٹھی کی یاد کے طور پر منانے کے لیے اس روز عام تعطیل کا اعلان کیا۔ وزیر اعظم کے اعلان کو عوامی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور اس سے مجاہدین کشمیر کے حوصلے بھی بلند ہوئے ہیں۔ جو نہایت ہی خوش آئند بات ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ شہیدِ اعظم کشمیر شہید مقبول بٹ، شہداء چکوٹھی، جناب لیاقت اعوان شہید، جناب فخر قریشی شہید اور جناب سجاد شہید اور ان کے علاوہ ہزاروں دیگر کشمیری شہداء کی شہادت کو اپنے حضور قبول فرمائے اور ان کی عظمت کے صدقے مجاہدین کشمیر کی صفوں میں اتحاد و اتفاق برقرار رکھے۔ کشمیریوں اور تمام دوسرے حکوم مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے نوازے اور اس آزمائش کی گھڑی میں مسلم امہ کو اپنے معاملات خود سلیمانی کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔



مقبول بٹ شہید! کچھ یاد میں کچھ باتیں

محمد اسلم خان (دواریاں نیلم و ملی)

مقبول بٹ شہید سے میری ملاقات جون 1966ء میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ کنڑول لائن عبور کرنے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریٹائرڈ میجر امان اللہ خان تھے۔ ان کی راہنمائی کے لیے پچا ایوب خان (مرحوم) جو کہ میجر صاحب کے قریبی رشتہ دار تھے اور شارودہ کے مقام پر مقیم تھے، ہر رہ تھے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا آدمی جن کا نام مجھے یاد نہیں، بھی ساتھ تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کا نام صوبے دار کالا خان تھا۔ بہر حال وہ شارودہ سے تجیاں کی طرف روانہ ہوئے اور خواجہ میری کے مقام پر جہاں میرا گھر واقع تھا۔ ہمارے گھر کھانا کھایا بلکہ بٹ صاحب اور میں نے ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھایا۔ میری عمر اس وقت 9 سال اور چھ ماہ تھی اور میں جماعت چہارم کا طالب علم تھا۔ میجر صاحب نے میرے والد صاحب مرحوم محمد یوسف خان بے بٹ صاحب کا تعارف کرایا کہ بٹ صاحب تریہ گام کے نیلہ ماسٹر غلام قادر بٹ کے صاحبزادے ہیں۔ چوں کہ میرے والد صاحب بھارتی مقبولہ کشمیر موضع زرہامہ چک کے رہنے والے تھے۔ تریہ گام اور زرہامہ کے درمیان صرف 3 کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ اس طرح وہ غلام قادر بٹ صاحب سے اچھی طرح واقف تھے۔ ہمارے گھر انوں کے آپس میں ذاتی مرام تھے۔ اس کے بعد میجر صاحب نے میرے والد صاحب سے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں لیکن والد صاحب نے کہا کہ برادر ایوب صاحب اور میں بیک وقت گھر چھوڑ کر نہیں جاسکتے یا تو ایوب صاحب جائیں گے یا میں جاؤں گا اور بعد میں یہی فیصلہ ہوا کہ ایوب خان صاحب ہی جائیں گے اور پھر وہی ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس طرح تجیاں کے راستے وہ بھارتی مقبولہ کشمیر روانہ ہوئے۔ جاتے وقت بٹ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے تو میں نے کہا کہ میں آزادی کے بعد کشمیر جاؤں گا میں غلام کشمیر میں نہیں جا سکتا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ کیا وہ اپسی پر آپ میرے ساتھ

پشاور جائیں گے تو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان سے کہا کہ اگر آپ مجھے پڑھائیں گے تو ضرور جاؤں گا ورنہ نہیں۔ یہ میری ان کے ساتھ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ البتہ میرے والد صاحب ان سے کئی مرتبہ مقبوضہ کشمیر اور یہاں مختلف خفیہ مقامات پر ملتے رہے۔ یہ باتیں بٹ صاحب کی شہادت کے بعد والد صاحب سے معلوم ہوئیں۔ بٹ صاحب مجھے پہلی نظر میں ایک حسین و جمیل اور خوب صورت شخصیت لگے لیکن ان سے باتیں کرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھے۔ ان کا ارادہ پکا تھا لیکن وقت کی کمی اور کم عمری کے باعث میں ان کی عادات و خصائص اور پسند و ناپسند کا مشاہدہ نہ کر سکا۔ کئی سوالات میرے لبوں تک آتے آتے رہ گئے۔ اس کے کئی سالوں بعد جب یہ خبر سنی کہ دہلی کی تہاڑ جیل میں عزم صمیم کے حامل اس بطل حریت کو چنانی دی گئی ہے تو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا لیکن جب اس کیفیت سے نکلتے تو بے حد دکھ ہوا۔ کہاں وادی نیلم کے ایک دور دراز علاقے میں ہماری ملاقات ہوئی اور کہاں دہلی کی تہاڑ جیل میں یہ ستارہ غروب ہوا۔ ایسی ہستیاں سالوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ تاریخ عالم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ حق کو دبانے کے لیے ہر دور میں باطل آیا۔ کہیں پر صحیح کو دار پر لٹکایا گیا تو کہیں پابند سلاسل کیا گیا لیکن فتح بالآخر صحیح ہی کی ہوئی۔ کل جو لوگ مقبول بٹ کو شہید تک نہیں مانتے تھے آج وہی اس کی عظمت کو سلام کرتے ہیں۔ یہ باتیں بٹ صاحب کے نظریات کے بنی برحق ہونے کی عکاسی کرتی ہیں۔

(عکس: 1995 دواریاں)

یادوں کے نقوش

عبدالجید بٹ (قطر)

1976ء کا واقعہ ہے میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا میرے بڑے بھائی عبدالوحید مرحوم آرمی سے مفرور ہو کر گھر آگئے تو آرمی نے انھیں گرفتار کر کے ایک سال قید کی سزا سنائی تھی اور وہ ان دنوں کیمپور (ائک) جیل میں سزا کاٹ رہے تھے۔ میرے بڑے بھائی کی شادی کے دوست اور کلاس فیلو نور حسین راولپنڈی میں ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے کلینک پر ڈسپنسر تھے اور ان کے فیملی ڈرائیور بھی تھے۔ میں پلندری سے راولپنڈی نور حسین صاحب کے پاس گیا تاکہ وہاں سے ہم اکٹھے ائک بھائی عبدالوحید کو ملنے جائیں۔

میں راولپنڈی ڈاکٹر فاروق حیدر صاحب کے کلینک پر پہنچا تو نور حسین نے مجھے انتظار کرنے کی ہدایت دی اور وہ کسی سے ملاقات کرنے باہر چلے گئے۔ وہ کافی دیر بعد واپس آئے تو ان کے ہمراہ ایک بڑا نشیں، سمارٹ، چمکدار آنکھوں والا، سفید شلوار قیمت میں ملبوس شخص کلینک میں داخل ہوا۔ میں ان کو اندر آتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ انھوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”آپ وحید صاحب کے بھائی ہیں؟“ میں نے جواب دیا ”ہاں“۔ اتنے میں وہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلے گئے چند ساعتیں گزریں تو وہ باہر نکلے بھائی نور حسین نے مجھے کہا ”آؤ چلتے ہیں، گاڑی میں بیٹھیں“۔ ہم ایک سفید رنگ کی گاڑی میں چار آدمی بیٹھ گئے نور حسین ڈرائیور، فرنٹ سیٹ پر نامعلوم شخص اور پچھلی سیٹ پر میں اور وہ شخصیت جس سے میں مرعوب ہو رہا تھا۔ گھنے بال پیچھے کی طرف کنگلی کیے ہوئے تھے۔ میں بار بار ان کی طرف دیکھ رہا تھا آج بھی جب وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو بے اختیار مجھے اقبال کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

میرے دیدار کی ہے ایک یہی شرط

کہ تو پہاں نہ ہو اپنی نظر سے
گاؤں میں سوار ہوتے ہوئے نور حسین نے مجھے بتایا کہ یہ مقبول بٹ صاحب ہیں اور ہماری
مد کے لیے ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ میں مقبول بٹ کے نام سے واقف نہ تھا اور نہ ہی مجھے ان کے
کردار سے واقفیت تھی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا شخص بار بار پیچھے مزکر ان سے با تین کر رہا تھا۔ لگتا تھا یہ ان
کا کوئی دوست ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا ”بٹ صاحب ہم چاہتے ہیں کہ آپ خود اس مشن پر نہ جائیں
 بلکہ اپنے گروپ کو بھیج دیں، وہ اُسے جواب دیتے“ کشمیر کے آر پار غدار لیڈروں نے قوم کو دھوکا دیا ہے
 انہوں نے کشمیر کو غلام بنانے کے دنیا کی نظر وہ میں بزدل اور بے وقار کر دیا ہے۔ میرا مشن ہے کہ میں
 اس قوم کو آزادی دلا کر اس کا کھویا ہوا وقار دو بارہ بحال کروں۔ اس کام کو مجھے ہی سرانجام دینا ہوگا۔“
 وہ شخص کہہ رہا تھا ”آپ کی جان کو وہاں خطرہ ہے۔“

بٹ صاحب نے فرمایا ”مجھے معلوم ہے لیکن میری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ میری
قربانی سے میری قوم کے اندر ایک ایسا جذبہ پیدا ہو گا جو اُسے دنیا کی آزادی اور با وقار قوم بنائے گا۔ یاد
 رکھنا میری قوم کی غیرت آخر ایک روز جاگے گی اور یہ دنیا کی آزادی اور با وقار قوم بنے گی۔“

میں یہ باتیں سن رہا تھا۔ مجھے اب بھی یہ کوئی علم نہ تھا کہ یہ شخص کون ہے، کیا ہے، اور کس میں منظہ میں
 یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ آج بھی مقبول بٹ شہید کے یہ الفاظ اُسی طرح میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

راستے میں مجھے اونگ آگئی۔ ایک بار اونگنے کی وجہ سے میں بٹ صاحب سے ٹکرایا تو انہوں
 نے مجھے کہا ”بیٹا آپ میرے کندھے کے ساتھ نیک لگا کر سو جائیں“۔ میں نے ان کے ساتھ نیک لگالی
 اور سو گیا۔ راستے میں سڑک کی خرابی کے سبب جمپ لگنے کی وجہ سے میں جاگ گیا۔ اب میں نے سونا یا
 بٹ صاحب سے نیک لگانا مناسب نہ سمجھا۔ اُس وقت میری عمر 16 سال ہو گی۔

بہر حال سفر جاری رہا۔ وہ باتیں کرتے رہے۔ بہت سی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں جو
 مجھے یاد بھی نہ رہیں۔ بٹ صاحب کے منہ سے ایک لفظ البتہ بار بار ادا ہو رہا تھا ”با وقار قوم“ یہ لفظ میری
 ساعتوں سے چپک کر رہا گیا۔

ایک پہنچ کر ہم جیل میں بھائی سے ملاقات کرنے پہنچے۔ مجھے یاد ہے جب بٹ صاحب نے

بھائی سے خیر خیریت دریافت کی تو بھائی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور ان کے آنسوں نکل آئے۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں بٹ صاحب کو بتایا ”جیل والوں نے مجھ سے جھاڑ و بھی دلوایا ہے“ یہ من کر بٹ صاحب ہنس پڑے اور کہنے لگے ”یار آپ تو اتنی سی سزا سے گھبرا گئے ہیں بٹ تو بہادر لوگ ہوتے ہیں۔ جیل سے باہر آؤ گے تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہم نے کیسی کیسی جیلیں کائی ہیں۔“

بھائی کے پاس ہم نے ٹھنڈی بولی میں پیس۔ مختصر ملاقاتات کے بعد یہ لوگ وزیر جیل خانہ جات ملک حاکمین سے ملاقاتات کرنے چلے گئے اور میں بھائی کے پاس ہی ٹھہر ارہا۔ بھائی نے مجھے انک میں اپنے کسی جانے والے کے ہاں بھیج دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بٹ صاحب کی کاوش سے بھائی کی سزا میں کمی بھی ہوئی اور انھیں بی کلاس بھی مل گئی۔

بھائی صاحب کچھ عرصہ بعد جیل سے رہا ہو کر آئے تو انہوں نے تفصیل سے بتایا کہ اُس روز آپ کے ساتھ روپالپنڈی سے جو شخص آیا تھا وہ کشمیری راہنماء مقبول بٹ تھا اور وہ اب خود ان دونوں سری نگر سنٹرل جیل میں قید ہے۔ انہوں نے مقبول بٹ کے حالاتِ زندگی اور ان کی تحریک کے بارے مجھے آگاہ کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص جس کے ہمراہ میں نے سفر کیا تھا وہ کون تھا اور کیا تھا۔

میزک کے بعد جب میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا پھی پہنچا تو وہاں جن دوستوں سے ملاقات ہوئی وہ مقبول بٹ شہید کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے تھے اور کراچی میں اُن کی رہائی کے لیے تحریک چلا رہے تھے۔ ان دوستوں میں شوکت کشمیری، سردار عزیز ایڈ ووکیٹ، خواجہ منظور قادر ایڈ ووکیٹ، شوکت جعفری، ماسٹر اشتیاق اور اختر حسین بٹ گلکتی کے ساتھ زندگی کے یاد گار لمحات گزرے۔ ہم نے بٹ صاحب کی رہائی کے لیے تحریک چلائی۔ ایک اخبار ”آزادی“ شائع کیا۔ جزل ضیاء کی حکومت ہماری سرگرمیوں کو پسند نہ کرتی تھی۔ میں جب بھی کسی سچ پر یا تقریب میں شرکت کرتا ہوں اور وہاں مقبول بٹ شہید کا ذکر چھڑ جائے تو اُن کے یہ الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔ ”میری قربانی کے بعد میری قوم دنیا کی عظیم اور با وقار قوم بن کر اُبھرے گی“۔ جب ایسے لمحات آتے ہیں تو میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

مقبول بٹ شہید کی برسی

ارشاد محمود (رواکوٹ)

آج مقبول بٹ شہید کی برسی عقیدت و احترام سے منائی جا رہی ہے۔ مقبول بٹ کو گیارہ فروری 1984ء کو بھارتی حکومت نے رویندر مہاترے قتل کیس کے عمل میں تھاڑ جیل میں چنانی دی تھی۔ مقبول بٹ کشمیریوں کی اس نسل کے نمائندے ہیں جو بھارت کی فریب کاریوں سے اچھی طرح آگاہ تھی اور جس کے خیال میں اقوام متحده اور دیگر عالمی فورمز کی بحثوں اور قراردادوں سے مسئلہ کشمیر کا حل ممکن نہیں تھا۔ بلکہ اس کے لیے عسکری جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ کشمیریوں کا الیہ یہ تھا کہ وہ ایک الیسی شخصیت کے اسیر ہو چکے تھے جو ان کا خیرخواہ نہیں تھا۔ 1931ء سے 1975ء تک شیخ عبداللہ کشمیری مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ وہ طویل عرصے تک کشمیر کے منظر پر چھائے رہے کیوں کہ اس دوران شیخ عبداللہ کشمیریوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ ان کے نجات دہنڈے ہیں۔ کشمیریوں کو فریب دینے کے لیے شیخ عبداللہ نے رائے شماری، سری نگر راولپنڈی روڈ کھولنے جیسے اعلانات بار بار کیے۔ انہوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے سجارت کئے تھے۔ وہ دہلی میں بھارتی حکمرانوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے اور اپنے آپ کو بھارتی دھرم کا پیاری قرار دیتے تو جموں میں سیکولر اور پوری ریاست کا قائد ہونے کا تاثر دیتے۔ جب کہ وادی کشمیر میں شیخ عبداللہ پاکستان کے حامی، اپنی تقریروں کا آغاز تلاوت قرآن پاک اور کلام اقبال سے کرنے والے اور حق خود ارادیت کے پر جوش علم بردار بن جاتے۔ وادی کے لوگوں کی اکثریت شیخ عبداللہ کے صرف ایک چہرے کو جانتی تھی کہ وہ بھارتی سامراج کا مقابلہ بڑی پامردی سے کر رہے ہیں۔ اس لیے شیخ عبداللہ کے خلاف مزاحمت کی کوئی تحریک نہ چل سکی۔ 1975ء میں جب شیخ عبداللہ نے اندر اگاندھی سے سودا بازی کی تو اس پر کشمیر میں سخت رویہ کی کوشش کے ساتھ احساس ہوا کہ شیخ عبداللہ نے انہیں ذاتی مفادات کی خاطر بیج ڈالا ہے۔

جب کہ مقبول بٹ 1966ء سے ہی بھارتی سامراج کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ ان

کاشار کشیر میں عسکری تحریک کی بنیاد رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے دو مرتبہ کنٹرول لائن عبور کی۔ وہ مقبوضہ کشیر کے اندر سے مزاحمتی تحریک شروع کرنے کے خواہش مند تھے اس مقصد کے لیے انہوں نے مقبوضہ کشیر کے طول و عرض کے دورے کیے۔ ان کی پہلی گرفتاری 1966ء میں ہوئی۔ 1968ء میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور آزاد کشمیر آگئے دوسری مرتبہ 1976ء میں پھر کنٹرول لائن عبور کی اور مقبوضہ کشیر میں داخل ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد انہیں دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ انہیں ایک قتل کیس میں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ 1984ء تک یہ کیس بھارتی صدر کے پاس مزا پر نظر ثانی کے لیے رہا مگر مہاترے کے قتل کے بعد بھارت نے انتقام مقبول بٹ کو پھانسی دے دی۔ ان کی پھانسی سے نوجوانوں میں یہ احساس مزید پختہ ہوا کہ سیاسی جدوجہد سے وہ کوئی کامیابی نہیں حاصل کر سکیں گے۔ اس لیے انہیں جہاد یا گوریلا جنگ کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

لیکن آج ہم کیس کے ایک دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالیں گے۔ فروری 1984ء کو جب برطانیہ میں ”کشمیر لبریشن آرمی“ نے بھارتی سفارت کار مہاترے کو قتل کر دیا تو فوری طور پر پولیس قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی۔ برطانوی پولیس کی روپرٹوں کے مطابق دو قاتلوں میں سے ایک بندوق بردار تھا۔ پولیس عملہ اصل مجرموں تک پہنچنے میں ناکام رہی تا ہم پولیس نے آزاد کشمیر کے دونوں جوan قیوم راجہ اور محمد ریاض کو گرفتار کر لیا۔ چھ ماہ بعد ان پر فرد جرم عائد کر دی گئی مگر انہوں شہوت نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا اور دونوں نوجوانوں کو بے گناہ قرار دیا گیا لیکن بھارتی حکومت کے دباؤ پر فروری 1985ء میں دونوں کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے ملزموں کو خود سزا سنانے کے بجائے کہا کہ سیکرٹری دا خلہ سزا تجویز کریں گے لیکن نوسال تک قیوم راجہ اور ریاض کے کیس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ جب 1993ء میں ان دونوں کے وکیل نے عدالت میں شدید احتجاج کیا تو سیکرٹری دا خلہ کی طرف سے انہیں ایک خط موصول ہوا۔ ”آپ کی خفیہ سزا میں دس سال کا اضافہ کر کے اسے پچیس سال کر دیا گیا۔“ لندن ہائی کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف رٹ کی گئی۔ کورٹ نے بھی سیکرٹری دا خلہ کے اقدام کو با جواز قرار دیا۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد سیکرٹری دا خلہ نے کیس پر از سر لوگوں کا وعدہ کیا مگر دو سال تک ایسا نہیں کیا گیا۔ جون 1995ء میں اس کیس کے سلسلے میں برطانوی ممبران پارلیمنٹ نے سیکرٹری دا خلہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ جلد فیصلہ کریں۔ اسی طرح 1996ء میں ممبران

پارلیمنٹ کے ایک گروپ نے سیکرٹری داخلہ سے ملاقات کر کے انہیں متوجہ کیا کہ وہ اس کیس کا نئے سرے سے جائزہ لیں، مگر اس کے باوجود سیکرٹری داخلہ نے قیوم راجہ اور ریاض کو ایک خط کے ذریعے آگاہ کیا کہ ان کی سزا برقرار رہے گی۔ اس فیصلے پر لیبر پارٹی کے شیڈ و ہوم سیکرٹری جیک اسٹراک نے سخت احتجاج کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ ان کی پارٹی بر سر اقتدار آ کر ان سزاوں کو ختم کر دے گی۔ مگر اب انہی جیک اسٹراک صاحب نے ان سزاوں کو بحال رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ سارا کیس برطانوی حکومت پر بھارتی دباؤ کی غمازی کرتا ہے ورنہ انصاف اور قانون کے مطابق ان نوجوانوں کا کوئی قصور نہیں ہے کہ انہیں اتنی طویل سزا دی جائے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ مغربی ممالک اور معاشرہ دوسرے معیارات کا شکار ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں انہیں صرف مسلمان ممالک یا پھر چین میں نظر آتی ہیں، خود ان کے ہاں کیا کیا بے انصافیاں ہو رہی ہیں اور بھارتی حکومت مسلمانوں اور بالخصوص کشمیریوں اور سکھوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔

برطانیہ میں کشمیریوں اور پاکستانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ انہیں اس مسئلے میں دلچسپی لینی چاہیے اور اسے ایک سیاسی اور انسانی حقوق کے مسئلے کے طور پر اٹھانا چاہیے۔ بالخصوص انسانی حقوق کی تنظیموں اور ایمنٹسی انٹرنسیشنل، ایشیا و اچ کو متحرک کیا جانا چاہیے۔ تحریک کشمیر برطانیہ کے رہنماؤں سید منظور مشہدی، محمد غالب ورلڈ سوسائٹی آف وکٹا مالوجی کے مندوب سید نذیر گیلانی ورلڈ کشمیر فریڈم موومنٹ کے صدر ڈاکٹر ایوب ٹھاکر اور دیگر پاکستانی تنظیموں کو مل کر برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے تا کہ وہ مجبور ہو کر ان بے گناہ نوجوانوں کو رہا کرے۔ حکومت پاکستان کو برطانیہ سے سرکاری طور پر مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ قیوم راجہ اور محمد ریاض کو رہا کریں کیوں کہ بیرونیوں پاکستانی شہری ہیں اور ان کا کوئی جرم ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہے اس حکومت کو اقتدار میں لانے کے لیے پاکستانیوں نے بڑی جدوجہد کی ہے لہذا توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر پاکستانی اور کشمیری، کمیونٹی کے سر کردہ افراد اس کیس میں خصوصی دلچسپی لیں تو یہ انسانی مسئلہ طے ہو سکتا ہے۔

(روزنامہ اساس 11 فروری 1999)



مقبول ٹو زندہ ہے

توصیف احمد

جرأت میں شجاعت میں یہ نام تو زندہ ہے
 جو کام کیا تو نے وہ کام تو زندہ ہے
 کشیب کی دھرتی کا درو بام تو زندہ ہے
 ہر سال مہینے میں مقبول ٹو زندہ ہے
 تاریخ کے سینے میں مقبول ٹو زندہ ہے

کشیب ہے سے خانہ اور جام ہے آزادی
 قربان ہوا جس پر وہ نام ہے آزادی
 ہر صبح ہے آزادی ہر شام ہے آزادی
 کشیب گنینے میں مقبول تو زندہ ہے

تاریخ کے سینے میں مقبول ٹو زندہ ہے
 ہے شمع وطن تیرا اس کا ہے ٹو پروانہ
 محبوب ہے یہ تیرا جس کا ہے ٹو دیوانہ
 یہ جام، سبو، ساغر، تیرا ہے یہ سے خانہ
 اس عشق خزینے میں مقبول ٹو زندہ ہے
 تاریخ کے سینے میں مقبول ٹو زندہ ہے

نو
مر